
The Mashhoor Delhi
مشہور
دنیائے ادب
EUROPE
ASTRAILIA
دہلی
ANNUAL NUMBER
فی پرچہ
ایک روپیہ چار آنہ
1/4/-
سالانہ قیمت
تین روپے
3/-/-
ایڈیٹر
حکیم محمد تقی دہلوی




سالنامہ
جنوری ۴۳ء
مشہور
دھلی

جلد ۵ — فہرست مضامین سالنامہ مشہور جنوری ۱۹۴۳ء — نمبر ۵

فہرست مضامین سالنامہ مشہور دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

نمائش کنندگان کیلئے روپوں کا انبار لگا دینے والی تصاویر

(۱) پردیپ پکچرز کا لاجواب شاہکار :

وکیل صاحب

اداکاران :- مادھوری، ترلوک کپور، راجکماری، بیبی راجہ رانی، بدری پرشاد

(۲) مراری پکچرز کا بہترین شاہکار

ڈائرکٹر موہن سہنا

بدلتی دُنیا

اداکاران :- ممتاز شانتی (لبندت کی شہرت یافتہ) کے بسی ڈے، ترلوک کپو، بدری پرشاد

(۳) چندرا سیناٹون کا زبردست شوشل شاہکار

ڈائرکٹر نروتم ویاس

ماما جی

اداکاران :- للتا پوار، نندریکر، جیون، یعقوب، لیلا، مالتی وغیرہ وغیرہ

(۴) سن رائز پکچرز کا عظیم سوشل شاہکار

سوہاگن

اداکاران :- کمار، رادھا رانی، کلیانی، مرزا مشرف، بدھوا ڈوانی۔

(۵) وینس پکچرز کا عجیب وغریب فلم

ڈائرکٹر :- راجہ یگنیک

ناری!

اداکاران :- للتا پوار، ترلوک کپور، جلو، ارمیلا، انزت مراٹھے۔

(۶) وشوا کالا موی ٹون کا بہترین فلم

ڈائرکٹر :- چتربھائی پٹیل

طوفان

اداکاران :- ماروتی راؤ، بھیم، اندرا، راجرانی، ہمرت وغیرہ

(۷) درگا پکچرز کی حیرت انگیز تصویر

ڈائرکٹر :- کریم

کلاکار!

اداکاران :- مایا دیوی، مہر سلطانہ، فقیر محمد، رانی بالا، نذیرا، فضلو وغیرہ۔

(۸) جینت فلم کا رومان پرور فلم

ڈائرکٹر :- موہن سہنا

پریتم

اداکاران :- مایابزجی، راجیندرا، شانتی، شیام سندر، غلام رسول وغیرہ

(۹) وینس پکچرز کا ایک لاجواب شاہکار

لیڈی ڈاکٹر

اداکاران :- پرتھوی راج - شوبھنا سمرتھ وغیرہ۔

(۱۰) کمال پکچرز کی حیرت انگیز مذاحیہ تصویر

دُنیا دیوانی

اداکاران :- ارملا (یربھات کی شہرت یافتہ) مس رمیلا، ای بلیمویا، ڈبلیو ایم خان، وغیرہ وغیرہ

سوتے میں ہر انسان خواب دیکھتا ہے ۔۔۔۔۔۔

پارس پکچرز

آپ کو عالم بیداری میں خواب دکھانا چاہتی ہے

ایسا خواب جسے آپ ..

میرا خواب

کہنے پر مجبور ہوں گے

ہدایت کاران — اے۔ جی۔ نظام و ہنس راج ٹیل

عکاسی — ایچ۔ ڈی۔ ٹیل

پروڈیوسر :- سی۔ ایل۔ پاریکھ

میرا خواب آپ کو طلسمات کی دُنیا میں لے جائے گا

جہاں آپ

سحر چشم زیب النساء کی عشوہ طرازیاں۔ مسٹر پرکاش کی دلداریاں۔ مسٹر سمسن کی سحر آفریں ستم کاریاں مسٹر عباس کی وفاداریاں اور ساتھ ہی جی ایم بیکانیریاں اور گلزار کی اداکاریاں بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔

بہترین ٹرک فوٹوگرافی ——— روح نواز موسیقی ——— دلچسپ افسانہ ——— اور اعلیٰ ہدایات

عنقریب آپ کے شہر میں نمائش کے لئے پیش ہو گا

حقوق کے لئے لکھئے

پارس پکچرز وجے نگر بالمقابل بی بی دادر اسٹیشن بمبئی ۱۴

فلم "ماتا" کی کامیاب نمایش کے بعد

کِرنی پکچرز کا دوسرا بے مثل سوشل شاہکار

پروڈیوسر مسٹر پی۔ بی زویری اور ڈائرکٹر مسٹر گنجال کا

افسانہ:۔ کمال صاحب امروہوی

مکالمے:۔ پنڈت فانی صاحب

ڈائرکشن مسٹر گنجال

میوزک مسٹر رتن لال [illegible]

برات

(مسئلہ تدبیر و تقدیر کا فلسفیانہ حل عبرت خیز و مسرت انگیز مناظر کی صورت میں)

اداکارانِ خصوصی:۔ مسٹر ہریش۔ سوبھنا سمراتھ۔ مسٹر من موہن اختر۔ مس کوشلیا شکنتلا پرشاد۔

مرزا مشرف۔ رام پیاری۔ بابا ابراہیم آف خاندان فیم۔ ایم پرکاش وغیرہ۔

پیش کنندگان:۔ میسرز کِرنی پکچرز بلاسس روڈ نمبر ۲۹۳ بائیکلہ بمبئی نمبر ۸

نمایش کنندگان:۔ میسرز سواستک انڈیا لمیٹڈ چوپاٹی چیمبر سندھرسٹ برج بمبئی نمبر ۷

نعیم پکچرز بمبئی کی تازہ ترین و معرکۃ الآرا جذباتی پیشکش

محبت

پروڈیوسر:۔ مسٹر پی۔ بی۔ زویری

ڈائرکٹر خاندان فلم کے شہرت یافتہ ڈائرکٹر مسٹر شوکت حسین رضوی

حسن و عشق کا رنگین تصادم اور اس کا قیامت خیز و عبرت انگیز انجام

آپ کی محبت میں جان تک فدا کر دی

دِل نے ابتدا کی تھی ہم نے انتہا کر دی

فلمی ستارے:۔ ملکۂ حسن و ترنم ممتاز شانتی۔ مس نورجہاں (خاندان فیم) مشہور فلم اسٹار۔

مسٹر موتی لال۔ بابا ابراہیم آف خاندان فیم۔ [illegible] وغیرہ

جامِ جمشید

عمارتِ حُسن وعشق کی تکمیل

از حدیثِ گریۂ ما خونِ راحت میچکد
خواب را گلگوں کند افسانۂ رنگین ما

ادب و شعر کی زمین پر تقریبًا دو ماہ سے ایک فلک بوس عمارت تعمیر کی جارہی تھی، الحمدللہ کہ آج وہ تیار ہو کر آپ کے سامنے ہے یعنی "سالنامۂ مشہور" معمار کو اعتراف ہے کہ وہ روضۂ تاج گنج کی طرح اس ادبی تعمیر میں کوئی ایسی نفاست و رعنائی پیدا نہیں کرسکا جو دلربائی کی تمام صفات رکھتی ہوں مگر اس اعترافِ عجز کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ "تاج گنج"، مکرمت خاں اور عبدالکریم خاں کی نگرانی میں جو شاہجہاں کے میر عمارت تھے آٹھ برس چھ ماہ پچیس روز کی مدّت میں ۵ کروڑ ۱۵ لاکھ ۲۵ ہزار کی لاگت سے تیار ہوا تھا اور یہ ادبی عمارت پچاس ساٹھ روز کی قلیل مدّت میں غایت بے سروسامانی کی حالت میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے بس اس میں جتنے عیوب و نقائص رہ گئے ہوں - کم ہیں -

جناب انیس اعلی اللہ مقامہٗ کے دادا حضرتِ میر حسن دہلوی مرحوم نے مثنوی "بدرِ منیر"، لکھی تو بیس برس تک روزانہ اُس کے عیوب دیکھتے رہے جب کلّی طور پر اطمینان ہوگیا تب وُہ شیوع پذیر ہوئی -

برخلاف اس کے اپنا یہ عالم رہا کہ تساہل طبع نے پروف ریڈری بھی خاطر خواہ نہیں ہونے دی بایں ہمہ اِسے معجزہ سمجھئے کہ ایک ایسے متفرق اور پریشان سامان سے قلتِ وقت میں ایک کامل و جامع اور مرتب و منظم عمارت تیار ہوگئی ؎

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر سب نے اُسے بزم میں چلتے دیکھا

سخت ناانصافی ہوگی اگر میں اُن محترم علما فضلا ادبا اور شعرا کا شکریہ ادا نہ کرسکا - جنھوں نے انتہائی ایثار اور خلوص محبّت کے ساتھ اس ادبی عمارت کے لئے مسالہ بہم پہنچایا -

درحقیقت اِن حضرات کی قلمی اعانت شریک حال نہ ہوتی تو یہ قصرِ ادب کبھی تیار ہی نہ ہوتا - اس کے ساتھ ہی مجھے ان مقتدر خواتین ادب کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیئے جن کی لطیف نگارش نے اس عمارت میں منبت کاری کی اور گل بوٹوں سے اِس کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیئے - کاش اِن قلمی معاونین کو میرے دل کی گہرائیوں تک رسائی ہوتی - اور وہ اپنی آنکھوں سے جذبات تشکر کی طغیانی دیکھتے -

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن حضرات کی مساعی مقبول و محمود فرمائے -

اس سلسلہ میں حکیم ذکی احمد صاحب مالک حیدری پریس دہلی مسٹر فیروز آرٹسٹ مرزا اعجاز صاحب لیبل آرٹ پریس دہلی اور جناب کاملین صاحب آرٹسٹ دہلی - اور زمرّد رقم منشی حامد حسن و منشی اختر حسین صاحبان کا بھی بدل و جان مشکور رہوں

کہ ان کی متفقہ کوششوں سے طباعت وکتابت وغیرہ کی منزل خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہوگئی۔

اس پُرآشوب زمانہ میں جبکہ کاغذ اور سامان طباعت بے حد گراں ہے کسی ادبی پرچہ کو شاندار بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تاہم میں نے آپ کے ذوق ادب کی تکمیل کے لئے اس مجموعہ کو دلفریب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کوشش کی ہے کہ یہ پرچہ زیادہ سے زیادہ آپ کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ اب اِس کا فیصلہ آپ ہی کریں گے کہ میں کہاں تک اِس جدوجہد میں کامیاب رہا ہوں ؎

شکست وفتح نصیبوں سے ہے وَلے اے امیرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

سالنامے کے اکثر مضامین کچھ تو دیر سے موصول ہونے کے باعث رہ گئے اور کچھ قلّتِ گنجائش کی وجہ سے درج نہ ہوسکے چنانچہ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا مضمون "توازن فطرت" اور انصار ناصری صاحب کا ریڈیائی ڈرامہ طویل ہونے کے باعث شریک اشاعت نہ ہوسکا حالانکہ یہ دونوں مضمون اپنی نوعیت میں فرد تھے خدا کو منظور رہا ہے تو آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیگا۔

سیّد الشہدا کی یاد

محرم کی آمد پر امام مظلوم کا تذکرہ سالنامہ میں شامل ہوکر باعث خیر وبرکت ہورہا ہے۔ نیز اب سالنامہ کی تقدیس وشرف میں بڑی حد تک اضافہ بھی ہوجائے گا۔

سنہ ۶۱ ہجری کا یہ الم انگیز سانحہ جو کربلا کے بے آب وگیاہ میدان میں وقوع پذیر ہوا تھا اپنے اندر عزم واستقلال۔ صبر وثبات اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی لاتعداد بصیرتیں رکھتا ہے مگر آہ؟ بہت کم لوگ ہیں جن کے فہم وادراک اس واقعہ ہائلہ کی حقیقت تک پہنچتے ہوں۔ کثرت ان لوگوں کی ہے جو ہر اہم واقعہ کو سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ان کے نزدیک اس سانحہ ہوش ربا پر رو لینا اور ماتم کرنا کافی ہے۔

اگر اس شہادت عظیمہ کا مقصد اتنا ہی تھا تو مجھے افسوس ہے کہ اس میں بھی آپ پورے نہیں اُترے۔ میں اُن آنسوؤں کا قایل نہیں جو دل کی خوں نابہ فشانی سے رنگین نہ ہوں اور اس سینہ کوبی کو کیا کہیئے جس کی ضرب سے سینہ تو فگار ہو مگر دل پر کوئی چوٹ نہ آئے۔ دل کی زندگی ہمیشہ تعیش سے فنا ہوتی ہے اور تکالیف سے بقا حاصل کرتی ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اگر آپ کی آنکھیں بصیرت کی متلاشی ہیں تو سوچیئے۔ وہ کیا چیز تھی جو سیدنا امام حسین علیہ السّلام کو یزید کی بیعت سے روک رہی تھی۔ حالانکہ بیعت کرلینے سے فوراً جسم کو سُکھ اور آرام حاصل ہوسکتا تھا۔ مگر وہ تو رُوح کی راحت کے جویاں تھے اور سمجھتے تھے کہ اپنے جسم کا سُکھ عالم اسلامی کے لئے ایک مستقل دُکھ بن جائیگا چونکہ یزید نے خلافت راشدہ کے طریق حکومت کو تبدیل کردیا تھا اور اسکی بجائے شخصی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ اسلام کی جمہوریت کو مٹانا چاہتا تھا اور یہ اُسے پروان چڑھانا چاہتے تھے اس لئے تصادم ہوا اور ایسا خوفناک تصادم۔ جسے مسلمان قیامت تک نہیں بھُول سکتے۔

پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ اس مرد مجاہد نے اپنے دادا کی ملّت اُسوہ ابراہیمی کا وہ عدیم المثال نمونہ دکھایا کہ تاریخ اس کا جواب آج تک پیش نہ کرسکی۔ پھر یہ قربانی تنہا نہیں دی گئی بلکہ خاندان نبوّت کا ہر فرد شریک تھا۔ یہاں تک کہ علی اصغر جیسے شیر خوار بچّہ نے بھی اس میں شرکت فرمائی پس اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہم بھی اُسی قربانی کا جذبہ پیدا کریں تو ہماری اشکباری اور سینہ کوبی کوئی معنی رکھتی ہے ورنہ بیکار ہے۔

آج میں اُن آنکھوں کو جو غم حسین میں اشکبار ہیں پیام دیتا ہوں کہ اپنے آنسو پی لیں۔ کیونکہ شدت گریہ سے دل کی آگ پر پانی پڑجاتا ہے اور اس سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا جو اپنی متاع سوز کو خود ہی پانی ڈال کر برباد کردے پس یہ سوز جب تک سینہ ودل کو گرما رہا ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ اور جب یہ مٹ گیا تو ہم بھی مٹ گئے۔

سال نو کی مُبارکباد

محرم سنہ ۱۳۶۲ ہجری سے نیا سال شروع ہوگیا۔ اسی طرح عیسوی کا جنوری سنہ ۱۹۴۳ سے دونوں میں کوئی دس ہی دن کا آگا پیچھا ہے۔ پس مسلمانوں اور عیسائیوں کا اسے مشترکہ نیا سال سمجھنا چاہیئے۔ ہماری دعا ہے کہ دونو قوموں کو یہ سال مبارک ہو۔

نئے سال کا خیر مقدم کرنے سے پہلے سال گذشتہ پر ایک نظر ڈالنی ضرور ہے۔ گذرے ہوئے سال کی ولادت چونکہ معرکہ آرائیوں میں ہوئی تھی اس لئے اُس کے ۳۶۵ دن بڑی مصیبت میں گذرے اور [illegible] کے سرنامہ پر حرف جنگ کے سوا

کوئی دوسرا لفظ ہی نظر نہ آیا۔ اب یہ جدید مولود بھی اسی فضا میں تولد ہوئے ہیں اس لیئے اِن سے بھی کچھ بہتر توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتی البتہ ہماری بہادر فوجیں افریقہ میں جو فتوحات حاصل کر رہی ہیں اور ہندوستانی شجاعت کا جو مظاہرہ پیش کر رہی ہیں اُن کی بنا پر ہم اس نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ دنیا کے لیئے یہ سال امن و سلامتی کا سال ہو۔

ہمارے نصیب کا رزق کہاں گیا؟

یہ سوال اصولی طور پر تو خدا ہی سے دریافت کرنا چاہیئے کہ اس نے ہر انسان کے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہی مگر عالم اسباب میں اُس کے ہاتھ در پردہ کام کیا کرتے ہیں اور اُس کے ہاتھ کا سب سے بڑا پردہ حکومت ہے اس لیئے ہم ارباب حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا رزق کہاں ہے۔ حکومت یہ تو کہہ نہیں سکتی کہ قحط پڑ رہا ہے اس لیئے تمھارا رزق اُڑ گیا۔ بلکہ اس سال اتنی اچھی فصلیں ہوئی ہیں جنکی نظیر کئی سال سے ناپید تھی باوجود کثرت پیداوار ہر صوبہ میں اناج کا قحط ہے۔ غربا بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ متوسط آدمیوں نے ایک وقت کھانا شروع کر دیا ہے۔ بمبئی سے قلت اجناس کی بیحد لرزہ خیز خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں غرض اس سرے سے اُس سرے تک ایک کہرام مچا ہوا ہے مگر حکومت جس نے تقسیم رزق کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہی اس صورت حال کو دیکھتی ہے اور خاموش ہے، آخر وُہ کب تک یہ الم انگیز تماشہ دیکھتی رہے گی اور کب اُس کے قدم صورت حال کو قابو میں لانے کے لیئے بڑھیں گے۔

اُردو کی بدولت آزادی حاصل ہو گئی

انجمن ترقی اُردو (ہند)

دہلی کا پندرہ روزہ معاصر "ہماری زبان" ایک عجیب و غریب واقعہ السٹر یٹڈ ویکلی ٹائمس بمبئی سے نقل کرتا ہے جسے ہم قارئین مشہور کی دلچسپی کے لیئے نقل در نقل کرتے ہیں۔ اس واقعہ سے ہم اُمید کریں تو کچھ بے محل نہ ہوگی کہ اُردو زبان اگر بالاتفاق سب ہندوستانیوں کی وطنی زبان قرار پا جائے اور سب لوگ اسی زبان میں تمام معاملات حل کرنے لگیں تو ممکن ہے کہ وہ بھی آزادی کی دیوی سے ہمکنار ہو جائیں۔ معاصر موصوف رقمطراز ہے۔

ایک انگریز کرنیل ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کی ایک تعداد کے ساتھ گرفتار ہو کر چار گھنٹے مرسا مطروح میں رومل کے ہیڈ کوارٹر میں رہا۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ کس طرح وہ معہ اپنے سپاہیوں کے گرفتاری سے نکل جانے میں کامیاب ہوا۔ جب جرمن افسر اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ (یہ واقعہ جرمنوں کی پسپائی شروع ہونے سے پہلے کا ہے) یہ یوں ہوا کہ پہلے اس نے رومیل سے اُس کی دوربین مانگی کہ اپنے سپاہیوں کو جو ادہر اُدھر منتشر تھے دیکھ کر ایک جگہ کرلے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نکل بھاگنے کا موقعہ اور راستہ دیکھتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر اُس نے اجازت مانگی کہ وہ اپنے سپاہیوں کو سمجھا بجھا کر قید کی مصیبت خاموشی سے گوارا کرنے کی نصیحت کرے۔

یہ اجازت مل گئی تو اُس نے ہندوستانی سپاہیوں کو اُردو میں مخاطب کیا اور بتایا کہ رات کو وہ موقع پا کر بھاگ نکلیں اور ٹیلی فون کے تار کے ساتھ ساتھ چلے جائیں۔ یہ اصلی بات تھی جو ان کو بتانی تھی اور جرمن افسر و سپاہی اِرد گرد کھڑے تھے۔ چنانچہ وُہ ہندوستانی سپاہی اور انگریز کرنیل اُردو تقریر کی بدولت آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اپنے مورچوں میں واپس جا پہنچے۔

ہندوستان کا ایک لائق مدبر چل بسا

سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب

ایسے نازک وقت میں جُدا ہوئے ہیں جبکہ اُن کی دانشمندی اور تدبر کی ہندوستان کو سخت ضرورت تھی۔ مرحوم میں بہت سی صفات عالیہ جمع ہو گئیں تھیں وہ ایک طرف گورنمنٹ کے بہادر اور وفادار سپاہی تھے اور دوسری طرف قوم کے ہمدرد اور رہبر۔ ان کا مسلک اپنے ملک اور بادشاہ کی خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا اور جہاں تک حقیقت سامنے ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی جانب پوری توجہ مبذول کی تھی اور اس مقصد کے لیے صوبجاتی فنڈ کا ایک لاکھ روپیہ علیحدہ محفوظ رکھا تھا۔ چنانچہ اُن کی انتھک کوششوں سے پنجاب میں فرقہ دار جنگ اس طرح غائب ہو گئی جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔ مرحوم نے غریب کسانوں کو مہاجنوں کی لُوٹ [illegible] کرائے اور سود در سود کی لعنت سے بچا دیا۔ یہ اُن ہی کا دم تھا جو حالیہ ہنگاموں میں

پنجاب نے قطعی حصہ نہیں لیا حالانکہ سارے ہندوستان میں آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات ہوتے رہے اور اب تک اُن کا سلسلہ جاری ہے مرحوم نے اس کی بھی کوشش کی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ ایک پلیٹ فارم پر آجائیں چنانچہ اُن کی ملاقاتیں متعدد مرتبہ گاندھی جی - جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سے ہوئیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے، غرض وہ متعدد صفات رکھنے والے انسان تھے - ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں بہشت نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے جناب بشارت دہلوی نے ایک قطعہ تاریخ وفات بھیجا ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں -

(قطعہ تاریخ وفات سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم پنجاب)

از

سید الشعراء سید بشارت علی - بشارت - دہلوی

"سر سکندر حیات کھو بیٹھے"

ہند میں شومیِ مقدر سے — کیسے ہم نادرات کھو بیٹھے
جوہر و شوکت اور سر اقبال — کیا کیا عالی صفات کھو بیٹھے
سر سکندر بھی آج ہم سے گئے — فخر پنجاب ذات کھو بیٹھے
اس کی شیریں کلامی اور اخلاق — ہند والے نبات کھو بیٹھے

ماہ آخر ہوا ہے قاطع سن (۱)
سر سکندر حیات کھو بیٹھے
۱۳ ہجری ۶۱

جے - بی منگھارام اینڈ کمپنی سکھر

ہندوستان میں بسکٹ سازی کی

یہ ایک اعلیٰ اور قابل اعتماد فرم ہے - اس فرم کے بسکٹ بڑے شوق و رغبت کے ساتھ نہ صرف ہندوستانی استعمال کرتے ہیں بلکہ انگریز بھی کھاتے ہیں - ان بسکٹوں کو ہندوستانی کاریگر خالص ہندوستانی اشیاء سے تیار کرتے ہیں اور ان کا ذائقہ بے حد لذیذ ہوتا ہے - طاقت بخش اشیاء جیسے دودھ - گھی - مکھن - شہد وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں اور اس قدر زود ہضم ہوتے ہیں کہ شیر خوار بچّہ بھی بآسانی ہضم کر لیتا ہے اس فرم کی شاخیں تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں اس لئے ہر شہر میں آسانی کے ساتھ بسکٹ مل جاتے ہیں -

اس کمپنی کی سب سے بڑی قابل تعریف بات یہ ہے کہ سخت گرانی کے باوجود اس نے اپنی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا پس ہم کارکنانِ فرم کو اس بلند حوصلہ کی داد دیتے اور مبارکباد پیش کرتے ہیں - نیز ارباب حکومت کو توجہ دلاتے ہیں کہ کمپنی مذکور کو بسکٹ کی اشیاء بہم پہونچانے میں سہولتیں دی جائیں -

"مشہور" کی قیمت میں اضافہ

کاغذ اور سامان طباعت کی روز افزوں گرانی کے باعث مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جنوری ۱۹۴۳ء سے مشہور کی سالانہ قیمت میں ایک روپیہ کا اضافہ کر دیا جائے - یہ فیصلہ کسی مفاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ زیرباری کو ہلکا کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے - جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے - قیمت اپنی سابق شرح پر کر دی جائے گی - شاید آپ کو معلوم ہو کہ عام طور پر اکثر ادبی رسائل کی سالانہ قیمتیں ہمارے اضافہ کے بعد بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں اس لئے سچ پوچھئے تو یہ اضافہ کوئی اضافہ نہیں بلکہ مہنگائی کا الاونس ہے -

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اردو ادب کی جیسی وقیع خدمت "مشہور" کر رہا ہے اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ چندہ سالانہ کم سے کم چھ روپیہ ہوتا - مگر ہمارا مقصد نفع ذات نہیں بلکہ نفع عام رہا ہے - پس "مشہور" کے ہمدرد اور ادب نواز قارئین خندہ پیشانی کے ساتھ اس اضافہ کو قبول فرمائیں گے اور اب سے دو روپیہ کی بجائے تین روپے سالانہ قیمت بھیجا کریں گے -

یوم دلّی

بزم احباب دہلی کی تحریک پر ۳ جنوری ۱۹۴۳ء کو یوم دلی منایا گیا - اس سلسلہ میں ایک عظیم الشان ادبی جلسہ فراشخانہ دہلی میں زیر صدارت علامہ کیفی مدظلہ، منعقد ہوا جس میں مولوی احتشام صاحب ایم - اے - پروفیسر اے - این ورما ایم - اے - اشرف صبوحی صاحب یوسف بخاری صاحب - خواجہ محمد شفیع صاحب و خواجہ محمد عبدالمجید صاحب - نہال سیوہاروی - صابر دہلوی - ظریف دہلوی نے اپنا اپنا کلام منثور و منظوم سنایا جلسہ میں دلّی کے مرحوم مشاہیر کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ان کے مکانوں پر کتبے نصب کرنے کی تجویز بالاتفاق پاس کی گئی - غرض جلسہ بہمہ وجوہ کامیاب رہا -

محمّد تقی

حسّیات

اعلیٰحضرت سرو مظلومی والیِ پاجود دام اقبالہٗ و اجلالہٗ شعر و ادب کی دُنیا میں بھی حکومت فرما رہے ہیں اور آپ کا سکۂ کلام اقلیم ادب میں بلا روک ٹوک چل رہا ہے چنانچہ ذیل کی تازہ غزل ہمارے بیان کی شاہد ہے۔

مطلع اور حُسنِ مطلع ندرتِ خیال اور فصاحت کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے ایک ماہ وش کے ہمہ گیر تصوّر میں شامِ فراق کو صبحِ وصال میں تبدیل کر لینا بالکل اچھوتا مضمون ہے اور رعایتِ لفظی مستزاد۔ اسی طرح غزل کے باقی اشعار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں اُمید کہ دلدادگانِ ادب ان شہ پاروں کو دل میں جگہ دیں گے۔

ایڈیٹر



اک ماہ وش کا دل میں یہاں تک خیال ہے
شامِ فراق بھی مجھے صبحِ وصال ہے

چھایا ہُوا جو دل پہ سحابِ ملال ہے
ساقی پیالہ بھر کہ طبیعت نڈھال ہے

تنہائی میں بھی ساتھ ہے میرے ہجومِ غم
میں ہوں شبِ فراق ہے تیرا خیال ہے

بولے وہ مجھ سے وعدہ خلافی کے ذکر پر
"اتنی سی بات کا تمھیں اتنا ملال ہے"

آمادہ کرم ہے جو چرخِ ستم شعار
اس التفات میں کوئی پوشیدہ چال ہے

جلوت میں بھی تھی تیری نوازش ہی دستگیر
تنہائی کا انیس بھی تیرا خیال ہے

اُس مستِ نازِ حُسن کی الفت میں اِن دنوں
رُسوائے ہوشیار کا افسانہ حال ہے

کلام الملوک
مُلوک الکلام

محبتِ فاروقؓ و حیدرؓ

حضرت مولانا ضیاء القادری بدایونی مدظلہ العالی جہاں تمام صفات عالیہ رکھتے ہیں وہاں انھیں قدرت نے موزونیِ طبع کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا ہے اور پھر ان کی طبع رسا نہ اردو ہزار میل تک نہیں بلکہ عرش تک پرواز کرتی ہے۔ ذیل کا واقعہ جس خوبصورتی سے نظم فرمایا ہے اس نے مولانا شبلی مرحوم کی یاد تازہ کردی ہے۔ زورِ بیان۔ موزوں الفاظ کا تال میل۔ بے ساختہ پن تسلسل۔ قافیہ پر دسترس غرض جو خوبیاں نظم میں ہونی چاہئیں وہ بہ وجوہ موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ایڈیٹر

عہدِ فاروق میں اک روز علیؓ اور عمرؓ — جلوہ افروز تھے مسجد میں قریب ممبر
یہی مسجد تھی جسے قصرِ خلافت کہئے — یہی مسجد تھی جہاں خم تھے سلاطین کے سر
دونوں اصحاب تھے دو قالب و یکجاں گویا — دونوں اخلاص و محبت کے تھے زندہ پیکر
دونوں جانب سے تھا آئینہ بکف خلقِ نبیؐ — دونوں جانب سے اخوت کے عیاں تھے جوہر
نصرتِ ملتِ بیضا پہ تھے سرگرمِ سخن! — اوجِ مستقبلِ اسلام تھا فردوسِ نظر
دفعتاً ایک یہودی نے بہ اندوہ و بکا! — عرض کی خدمتِ فاروق میں حاضر ہو کر
استغاثہ مرا سُن لیجئے فریادی ہوں — مدعی میں ہوں تو ملزم ہیں جنابِ حیدر
حکم فاروقِ معظم نے یہ فوراً ہی دیا — بوالحسن بابِ عدالت پہ کھڑے ہوں آکر
ہو گئے حکم کی تعمیل میں استادہ علیؓ — تھے مگر غیض سے بل کھائے ہوئی کچھ تیور
دیسکا دعویٔ باطل کا یہودی نہ ثبوت — ہو گئے صاف بری جرمِ غلط سے حیدر
ختم روداد مقدمہ ہوئی انصاف کیساتھ — جھک گئی خود ہی یہودی کی ندامت سے نظر
پھر وہی شانِ اخوت تھی محبت تھی وہی — پھر اسی طرح یہ دونوں تھے بہم شیر و شکر
لطف و اخلاص سے فاروق نے دریافت کیا۔ — وقتِ انصاف بتاؤ تو ذرا اے حیدر
برہمی آپکے چہرہ سے نمایاں کیوں تھی — خشمگیں کیوں تھی نظر کیوں تھے کشیدہ تیور
کیا یہودی کے مقابل تھا کھڑا ہونا شاق — کیا نہ تھی آپکی آدابِ عدالت پہ نظر
ہنس کے فاروقِ معظم سے کہا مولا نے — پر نہ تھا آپ کو اس امر کا احساس مگر
کنیت ہے سببِ جاہ و شرف نزدِ عرب — کنیت خلق میں ہے باعثِ تکریمِ بشر
نام کے ساتھ مخاطب نہ مجھے فرمایا — نہ رہی آپ کو ہنگامِ عدالت یہ خبر
بوالحسن کہکے طلب مجکو عدالت میں کیا — دی یہودی پہ مجھے آپنے ترجیح مگر
آپکا طرزِ تخاطب تھا خلافِ انصاف — اپنی توقیر سے دل تھا مرا خائف مضطر
ڈر رہا تھا کہ نہ ہو روزِ جزا اسکی گرفت — اس عمل سے نہ خفا ہو کہیں ربِ اکبر
اسلئے تھا متغیر مرے رخسار کا رنگ — اسلئے تھا رُخ و ابرو پہ مرے خاص اثر
معذرت خواہ ہوئے سہو کا اقرار کیا — سُن کے فاروقِ معظم یہ کلامِ حیدر
اللہ اللہ یہ مساوات یہ موالات یہ عدل — اپنے بیگانہ نہیں ہے فرقِ مراتب سے حذر
مرحبا جوشِ محبت کا یہ رشتہ مضبوط — منقطع ہونے کا اصلا کبھی جسمیں نہ خطر
اسداللہ کو فاروقِ معظمؓ سے خلوص — اسداللہ کے گرویدہ اخلاقِ عمرؓ
اک طرف عہدِ خلافت میں یہ اظہارِ وفا — دورِ موجودہ میں اک سمت یہ تفریق یہ شر
قلب میں حُبِ علی لب پہ تبرّہ توبہ — پاسِ ملت ہے نہ ہی شرم نہ اللہ کا ڈر!
قرنِ اوّل سے چلے آتے ہیں سنی شیعہ — رونما تھا کبھی لیکن نہ تبرّہ کا اثر
یا نبی حیدر و فاروق کے متوالوں کو — یوں ملا جیسے کہ اک جام میں ہوں شیر و شکر
مانگ اخلاص و محبت کی دُعا روز ضیاؔ — عرض کر رحمتِ عالم سے بالفاظِ دگر

اے قریشی لقبی، اے مدنی مطلبی
چشمِ رحمت بکشا سوئی من انداز نظر

ضیاءُ القادری بدایونی



علامہ حضرت آرزو لکھنوی



خورشید حسن صاحب۔نازش۔دہلوی



قاضی ریاض الدین صاحب ریاض انصاری



حضرت



حضرت نواز درانی الافغانی



محمد عبداللہ صاحب بیبدل ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج بیکانیر





بصائر و حکم

سُنّۃ اللہ

از جناب مولانا افتخار احمد صاحب چھپروی

مولانا افتخار احمد صاحب چھپروی ایک صاحب بصیرت عالم ہیں۔ زیر نظر مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کو حقائق قرآنیہ پر اچھا عبور حاصل ہے سنۃ اللہ کے سلسلہ میں آپ نے سرکش قوموں کا انجام جس دلنشین پیرایہ میں تحریر فرمایا ہے امید کہ قارئین اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہونگے۔ ہمیں مولانا کی ہمنوائی میں اتنا اور اضافہ کرنا ہے کہ دنیا میں جسقدر طوفانِ عذاب آئے ہیں ان کی نوعیت یکساں نہ تھی بلکہ حالات حاضرہ کے مطابق وہ مختلف قسم کے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے تقریباً آٹھ سو برس تک تبلیغ حق فرمائی۔ مگر اس سرکش قوم میں سے ایک بہت چھوٹی سی جماعت ایمان لائی لہذا ضرورت تھی کہ ان خدا کے باغیوں سے علیحدہ ہوکر ایک نئی صالح اُمت کی بنیاد رکھی جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ ان سب کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور طوفان کے بعد جسقدر لوگ آپ کی کشتی میں سوار تھے انھیں سے اُمت صالحہ کی تجدید ہوئی۔

قوم ثمود وعاد نے قیامت کا انکار کیا تھا لہذا ان پر عذاب کی نوعیت قیامت صغرا کی صورت میں پیش کی گئی کذبت ثمود وعاد بالقارعۃ فاما ثمود فاھلکو بالطاغیۃ واما عاد فاھلکو بریح صرصر عاتیۃ سخرھا علیھم سبع لیال وثمانیۃ ایام حسوما فتری القوم فیھا صرعیٰ کانھم اعجاز نخل خاویۃ فھل تری لھم من باقیۃ ۔ متواتر سات رات اور آٹھ دن تک زلزلے اور آندھیوں کے طوفان آئے اور یہ قومیں اس میں فنا کردی گئیں۔

مگر یہ عجیب اتفاق ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ وہ قومیں جو دنیا میں فساد پھیلاتی ہیں اور کمزور قوموں کو غلام بنا کر اپنے در پر سجدہ ریزی کی دعوت دیتی ہیں وہ عموماً غرق ہی ہوتی ہیں چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو دعوت حق دی اور فرمایا ان ادو الی عباد اللہ انی لکم رسول امین یعنے قوم بنی اسرائیل کی گردنوں سے اپنی غلامی کا جوا اُتر دادو اور مجھے انھیں واپس دیدو۔ خدا نے مجھے اس قوم کا امین بنایا ہے چونکہ تم ظالم وسرکش ہو اور امانت کو غلط طور پر استعمال کر رہے ہو اس لئے اب تم امانت رکھنے کے ہرگز مستحق نہیں ہو سکتے۔ فرعون نے اس دعوت کو ٹھکرایا اور نتیجہ دنیا نے دیکھ لیا۔ واترک البحر رھوا انھم جند مغرقون آج بھی جو قومیں مظلوموں کو غلام بنا کر ظھر الفساد فی البر والبحر کی مصداق ہونگی سنۃ اللہ کے مطابق ایک دن ان کا انجام بھی یہی ہونا ہے۔

ایڈیٹر

(⁂)

آج دنیا کے ہر گوشہ میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑک رہی ہے۔ جور وستم کی حکمرانی ہے۔ تشدد واستبداد، تباہ کاری اور مردم آزاری کا تسلط ہے۔ انسان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں پر ضلالت ومعصیت کی مُہر لگ گئی ہے۔ قوتِ سامعہ بیکار ہو چکی ہے ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ـــــــــ نور وظلمت خیر وشر، صلاح وفساد، ضلالت وہدایت میں تفریق کرنے سے عقل وفہم، ادراک واحساس عاجز ہیں۔ لیکن قدرت کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں، کمزور جماعتوں کی آہ وفغاں، مظلوم قوموں کی فریاد سب کچھ سنتی ہے مگر خاموش ہے کہ لعلھم یرشدون شریر روحیں اور ناپاک ہستیاں جب اس پر بھی متنبہ نہیں ہوتیں۔ دست درازی، ظلم وتعدی حد سے بڑھ جاتے ہیں تو ان بطش ربک لشدید کی وعید حرکت میں آتی ہے اور "دیر گیر دسخت گیرد مر درا" کی طغیانی اپنا کام کرتی ہے اور ظالم اقوام کو ان کے ناروا ظلم کے ساتھ بہالیجاتی ہے چنانچہ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب اس قسم کے مظالم اور اس طرح کی سرکشیاں حد سے متجاوز ہوئیں تو چشم ربانی قہر آلود ہوگئی اور ایسی اقوام وملل کو طوفانِ سزا نے خس وخاشاک کی طرح بہا کر دنیا کو پاک کر دیا۔ چنانچہ جیولیوجی کا طوفانِ عام سب سے پہلا طوفان تھا جس نے استبداد کی گرفتوں کو برباد کر ڈالا۔ کرۂ ارضی پر جتنی جاندار ہستیاں تھیں سب کو اس نے چھپا لیا۔ یہ طوفان موجودہ نسلِ انسانی کے پیشتر کا ہے اسکی عمومیت ناقابلِ انکار ہے۔ اسکے بعد جتنے طوفان آئے وہ مخصوص مقامات اور خاص خاص ممالک تک محدود تھے۔

آیئے اسی سلسلہ میں مختصر طور پر بتادوں کہ معتمد تاریخ قدیم وجدید میں کتنے طوفانوں کا ذکر ہے اور ان کے اسباب وعلل کیا بتائے گئے ہیں۔

موجودہ نوع انسانی کی ہمہ گیری کے بعد جتنے طوفان آئے ہیں اُن میں سب سے بڑا اور پہلا طوفان ہندوستان کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "وشنو" نے اپنے معتقدین کو اس بلا کے آنے سے سات دن پیشتر اطلاع دیدی تھی اور کہا تھا کہ جو میری تنزیل کیا کرتے ہیں ان سبھوں کو یہ بلا غرق کر ڈالیگا۔ تم ایک کشتی پر سوار ہوجانا۔ محفوظ رہوگے۔ "آرین میتھولوجی" کی تحقیق کی بنا پر یہ پیشین گوئی حرف

بحرف صادق ہوئی۔

دوسرا ہولناک طوفان بابل کا تھا جو بادشاہ "ذی تروس" کے عہد میں آیا۔ خرونس دیوتا (زحل) نے اس کی اطلاع بادشاہ کو دیدی تھی اور بحالت خواب کہا تھا کہ فتنہ و فساد کی آگ نے میرے غضب کو بھڑکا دیا ہے۔ میں ان کو سزا دوں گا اور ایسا طوفان بھیجوں گا کہ سب تباہ ہو جائیں گے لیکن تم اور تمہارے اہل خاندان بچ جائینگے۔ مبدا و منتہا اور اوساط اشیاء کے متعلق جو تحریریں ہیں انکو سیبارس (مدینۃ الشمس) میں دفن کر دینا۔ ایک کشتی بنانا جس کا طول پانچ اسناد ہو اور عرض دو اسناد (ایک اسناد ۱۲۵ فٹ کے برابر تھا) چنانچہ طوفان آیا اور شاہ مذکور مع اہل و عیال کشتی میں سوار ہوا۔ طوفان کا زور کم ہوا تو ایک پہاڑ نظر آیا اس پر اہل سفینہ اُترے۔ دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھائی گئی۔ دفینہ نکالا۔ بابل کو از سر نو آباد کیا یہ واقعات بتفصیل کلدانی روایتوں میں ملتے ہیں۔

تیسرا طوفان "ہیرا بولیس" کا ہے جس کی تشریح لوسیانوس نے کی ہے۔ واقعات تقریباً یکساں ہیں۔ حسب روایت صرف دیکالیون اور اسکا خاندان اس سے مامون رہا۔

چوتھا طوفان جزیرۂ ساموتراس کا تھا۔ مورخ ڈیوڈراس کی تحقیق ہے کہ بحیرہ مرمر (مارمورا) اسی طوفان سے نکلا۔

پانچواں طوفان یونانِ قدیم کے دیار بولیسی میں آیا بادشاہ اوجیج کے عہد میں بحیرۂ کوبایس میں سیلاب آیا جسکے نتیجہ میں یہ غرقابی ظہور پذیر ہوئی۔ آگیٹیس جو مندر ہیلیون کا سب سے بڑا پجاری تھا۔ اس کا قول اس طوفان کے بارے میں ہے کہ وینس (زہرہ) نے غضب آلود ہو کر مخلوقات ارضی کو نیست و نابود کر دیا۔

چھٹا طوفان بادشاہ تھسلی دیوکالیون کے زمانہ میں آیا۔ اور تھسلی کو غرق کر دیا۔ ہیروڈوٹس کی روایت ہے کہ سمندر کے دیوتا (نپتون) نے دریائے تھسلی میں جوش پیدا کر دیا اور ملک طوفان کی نذر ہو گیا ——— اگرچہ ان واقعات میں رطب و یابس بہت کچھ ہے مگر واقعات دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرانسیسی مؤلف "موسیو ڈوبے" نے ان پر اچھی طرح تنقید کی ہے اور نہایت بسط و تفصیل سے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

ساتواں آخری طوفان میلادِ مسیح سے تین ہزار تین سو اڑتیس سال قبل آیا یہی وہ طوفان ہے جو طوفان نوح کے نام سے مشہور و موسوم ہے۔ قرآن کریم نے بوضاحت اسکی حقیقت ذکر فرما دی ہے۔ سورۂ ہود میں مفصل واقعہ ہے۔ خوفِ تطویل مانع نقل ہے۔ یہ طوفان کیسے آیا؟ ——— مفسرین کی عام رائے ہے کہ کھانا پکانے کا ایک تنور تھا۔ اسی سے طوفان کا چشمہ پھوٹا۔ تورات میں ہے کہ "جب نوح ؑ کی عمر چھ سو برس کی ہوئی دوسرے مہینہ کی سترھویں تاریخ کو اسی روز بحر محیط کے تمام سوتے پھوٹ نکلیں۔ آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں، اور چالیس شبانہ روز تک زمین پر مینہ کی جھڑی لگ گئی" (تکوین ۷: ۱۱) قرآن سے اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ ففتحنا ابواب السماء بماءٍ منہمر الآیہ ——— نار التنور کا لفظ بھی قرآن میں ہے۔ لیکن محاورۂ عرب سے معلوم ہوتا ہے کہ تنور روئے زمین کو کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ التنور وجہ الارض .... پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ والعرب لتسمی وجہ الارض تنور الارض ——— جب قومیں خدا سے بالکل غافل ہو گئیں اور انھیں اپنی طاقت و سطوت پر غرور پیدا ہوا تو خدا نے ان کے "تکبر" کو خاک میں ملا دیا۔ جن اقوام نے استبدادی حکومت قائم کرنی چاہی انھیں قدرت نے ملیا میٹ کر دیا جس نے خدا کے نام کو نہیں بلکہ اپنا نام اونچا کرنا چاہا اسے ہمیشہ کے لئے محو کر دیا گیا جس قوم نے حکومتِ الٰہیہ کے لئے نہیں بلکہ خود غرض شیطانی حکومت کے خاطر تلوار کو نیام سے نکالا اسے خدائے جبار نے خون کے دریا میں ڈبو دیا۔ جس نے ربانی سلطنت کے بجائے "انسانی و فرعونی سلطنت" کو وسیع کرنا چاہا اور معصوم قوموں کے گلے میں غلامی کا جوا ڈالا اسے بادشاہِ حقیقی کے قہر و غضب نے فنا کر دیا۔

واقعہ نوح کے مخصوص پہلو اور تعلیمات جو تمام آیات کو یکجا کرنے کے بعد سامنے آتے ہیں، یہ ہیں:—

(۱) جب تمرد و تعدی کا بازار گرم ہو۔ کفر و معصیت خالق حقیقی سے سرگرداں کر کے ضلالت کیطرف راہ نمائی کرنے لگے۔ معبود حقیقی کی پرستش قومیں ترک کر دیں اور یہی نہیں بلکہ عبادت گاہ کا ادب بھی باقی نہ رہے۔ ان حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے اس فرض کی ادائیگی میں بے انتہا مصائب بھی برداشت کرنے پڑیں پھر بھی معاصی کے نتیجہ سے اقوام کو خبر کر دینا چاہیئے ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ انی لکم نذیر مبین ان لا تعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم ؕ

(۲) صراط مستقیم کی راہ نمائی میں داعیانِ حق کو کسی طرح کی امتیازی حیثیت کا خیال نہ ہونا چاہیئے۔ اور طعن و تشنیع، دشنام و تضحیک کی پرواہ کرنی چاہیئے فقال الملأ الذین کفروا من قومہ ما نراک الا بشرا مثلنا الآیۃ وما نری لکم علینا من فضل بل نظنکم کاذبین الآیۃ

(۳) راہِ ہدایت پر جو حضرات گامزن ہونگے ان کی تعداد قلیل ہوگی۔ یہ ایسے افراد ہونگے جو عام نگاہوں میں ذلیل دکھائی دینگے لیکن یہی قلب سلیم کے مالک ہونگے اور طریق حق کی طرف نہایت سادگی و صفائی سے اُٹھ کھڑے ہونگے وما نراک اتبعک الا الذین ہم اراذلنا بادی الرای الآیۃ

(۴) حق و صداقت کے راہ نما کے لئے صاف گوئی۔ تلخ گفتاری ضروری ہے مگر سچائی پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ قال یا قوم ارأیتم ان کنت علی بینۃ من ربی واتانی رحمۃ من عندہ فعمیت علیکم

انلزمکموھا وانتم لہا کارھون الآیۃ

(۵) ہدایت وراہ نمائی صراط حق حصول جاہ و مال کا ذریعہ نہیں ہے اس تبلیغ کا بدل عزت وشہرت نہیں بلکہ اس کا اجر دینے والا خدائے تعالیٰ ہے ویاقوم لا اسألکم علیہ مالاً ان اجری الا علی اللہ الآیۃ

(۶) جو لوگ ہادیان حق کے مطیع و متبع ہیں ان سے کسی حال میں علیحدگی نہ اختیار کی جائے چاہے جسقدر بھی دباؤ ڈالا جائے - وما انا بطارد الذین آمنوا انہم ملاقوا ربھم الآیۃ ...... ویاقوم من ینصرنی من اللہ ان طردتھم افلا تذکرون ؁

(۷) رہبر راہ ہدایت کے پاس نہ خزانے ہونگے اور نہ وہ فرشتہ خصلت ہوگا اور نہ غیب داں - ولا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول انی ملک الآیۃ

(۸) تبلیغ اور رشد و ہدایت کے انجام کی طرف دھیان نہ دینا چاہئے - اسکا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس سے کوئی سروکار نہ ہو - بس جو فریضۂ اللہ ہے اس کی ادائیگی کرتے رہنا چاہئے - اگرچہ اقوام کی سرکشیوں میں فرق نہ آئے اور اگرچہ ان کے دامن سے کفر و عصیان کا بدنما دھبہ نہ مٹے - قالوا یانوح قد جادلتنا فاکثرت جدالنا الآیۃ

(۹) جن دلوں میں سرکشی اور تمرد راسخ ہو چکے ہوں ان سے کنارہ کشی کرلینی چاہئے - ان سے ترک موالات کرلینا چاہئے - ان کا ساتھ کبھی نہ دینا چاہئے اور نہایت صفائی سے کہدینا چاہئے کہ اسکے خراب نتائج اور ہولناک انجام کا تدارک تم کرو ہم کو اس سے کوئی واسطہ، کسی طرح کا سروکار نہیں - ان پر افترا کا بہتان باندھا جائیگا انہیں فتنہ پرداز بنایا جائیگا ایسی حالت میں اپنی پوزیشن صاف کردینی چاہئے - ام یقولون افتراہ قل ان افتریتہ فعلیّ اجرامی وانا بریٓء مما تجرمون۔

(۱۰) قہر الٰہی سے بچاؤ کی جو صورت بتلائی گئی ہے اسے اپنے ہی لئے مخصوص نہ کرلینا چاہئے بلکہ ان حضرات کو بھی اس میں شریک کرلینا چاہئے جنہوں نے اپنے معبود حقیقی کے سامنے سر تسلیم خم کردیا ہو - سفاک و ظالم اقوام کی سفارش نہ کرنی چاہئے - واوحی الی نوح انہ لن یومن قومک الا من قد آمن الآیۃ ——— الذین ظلموا انہم مغرقون ؁ -

(۱۱) سرکش قوموں سے بے تعلقی میں قرابت و رشتہ داری کو دخل نہ دینا چاہئے - کوئی عزیز ہی کیوں نہ ہو - قریب سے قریب تر اس کا تعلق کیوں نہ ہو - لیکن حق و صداقت پر نہیں ہے تو کفار و باغیوں کی طرح اس سے بھی ترک تعلق ضروری ہے - ونادیٰ نوح ربہ فقال ربّ ان ابنی من اھلی وانّ وعدک الحق وانت احکم الحاکمین ؁ قال یانوح انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح الآیۃ

(۱۲) سرکش و باغی اقوام کو اپنی حالت درست کرنے کے لئے موقع دیا جاتا اتمام حجت کے لئے انھیں خبردار کردیا جاتا ہے - پھر بھی اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے واغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا - صالحین پر رحمت الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے اور پھر شخصی حکمرانی کا ظالمانہ اور مکروہ منظر فنا ہوکر مقدس حکومت الٰہیہ کا مبارک دور شروع ہو جاتا ہے - قیل یانوح اھبط بسلام منا وبرکات علیک الآیۃ وجعلنا ھم خلٰٓئف - گروہ متبعین پر عذاب الٰہی نازل نہیں ہوتا وہ بالکل مامون و محفوظ رہتے ہیں - فنجینٰہ ومن معہ فی الفلک

——— پس ———

جبکہ آج افق عالم پر قتل و خونریزی کا بادل چھایا ہوا ہے - فضا مسموم ہے - مطلع غبار آلود ہو رہا ہے - قدرتی طور پر یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے اور زبانوں تک آتا ہے کہ آخر اس زلزلہ کی شورسامانی کا حشر کیا ہوگا؟ اس عام ہلاکت و سفاکی کا انجام کیا ہونیوالا ہے اس بھیانک رات عفریت حوادث نیچے تانے ہے کوئی ایسے بھیانک خواب کی تعبیر کیا جانے - یہ صحیح ہے کہ موجودہ ہیجان کے متعلق کسی قسم کی پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی - غارتگریوں اور مظالم، وحشتوں اور سفاکیوں کے انجام کے بارے میں کسی طرح کا فیصلہ قبل از وقت ہوگا ——— لیکن ——— تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرنے اور قوموں کی تدریجی ترقی و انحطاطی زندگیوں پر نظر ڈالنے اور قانون الٰہی کے ترتیب وار مقدمات کے سامنے رکھنے سے استقرائی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جب عصیان و سرکشی کی سلطنت نے غرور و تکبر سے سنۃ اللہ کو بدلنا چاہا اور پے در پے عبرت انگیز مناظر کے مشاہدہ کرنے کے باوجود اس نے اپنے طرز عمل میں کسی طرح کا رد و بدل نہ کیا - بار بار عبرت و بصیرت دلانے پر بھی ظلم و فشار کی زیادتی ہوتی گئی - استبداد و استبداد میں شدت ہی کی گئی - جبر و عدوان میں کثرت ہی ہوئی اور چیرہ دست و غالب اقوام کی سبعیت و درندگی ہر آن زور پکڑتی ہی گئی - احساس و شعور کو دفن کردیا گیا - چشم بصیرت بند کرلی گئی - امن و سلامتی، رواداری و دیانت کی حالت دردناک و ماتم انگیز ہوگئی تو بالآخر وہ دن آگیا کہ خدائے منتقم و قہار ان ابلیسوں تاجوں اور دجاجلۂ کفر و شیطنت کے تختوں کو اُلٹ دے کیونکہ ان متکبرین کی حالت یہ ہے کہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل (خدا نے جسکو توڑنے اور ملانے کا حکم دیا ہے اُسے وہ توڑتے اور جدا کرتے ہیں) اور ویفسدون فی الارض (زمین میں فساد پھیلاتے ہیں)، اولٰئک ھم الخاسرون (یہ لوگ گھاٹے میں ہیں - ان کی دین و دنیا تباہ ہو کر رہے گی) -

چنانچہ چشم حقیقت بیں دیکھ رہی ہے اور عقل سلیم سمجھ رہی ہے کہ ان فراعنہ و نمارد کو آپس میں ہی ٹکرا دیا گیا ہے کہ انھیں کے اسلحے خود جبروت انسانی کا خاتمہ کردینگے اور عہد تمدن کے مفسدین و متکبرین کے قلعے مسمار ہو جائیں، یہانتک کہ انکی تلواریں کند ہو جائیں، فوجیں ہلاک ہو جائیں - اسکے بعد معصوم اقوام مظالم سے نجات پائینگی - بہاروں رحمت آغوش سلطنت قائم ہوگی اسوقت ان کی توپیں انھیں پناہ نہ دینگی - ان کے خزانے کام نہ آئینگے - اُن کی طاقتیں نیست و نابود ہو کر رہ جائینگی - م

عبدالرحمٰن النّاصر اندلسی!

از حضرت علامہ احمد الشبلی مدظلہ از ظفر

دربارِ خاص میں اُمرا، وزرا، اور سپہ سالار خلیفۂ اندلس کے گرد ہالے کی طرح اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سبھوں کی نگاہیں خلیفہ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہر کوئی اپنے دل سے دریافت کرتا ہے کہ اس کانفرنس کا مقصد کیا ہوگا۔ مجلس بھر میں سناٹا چھایا ہوا ہے، خلیفہ کے ارشاد کے منتظر ہیں۔

عبدالرحمٰن نے ایک گشتی نظر سبھوں پر ڈالی اور دیکھ لیا کہ سب حاضر ہیں تو ان کو مخاطب کرکے کہا:۔

" رفیقو! مابدولت نے اس غرض سے تمھیں اس مجلس میں جمع کیا ہے کہ تم جہاد میں ہمارا ساتھ دو، اور حکومتِ اُندلس کی جڑوں کو پائدار رکھنے میں ہماری مدد کرو، ہم اپنا منشا تم پر ظاہر کئے دیتے ہیں، ہمارا مصمم ارادہ اس قلعے کو سر کرنے کا ہے جو ناقابل تسخیر ہے، ہمیں یقین ہے کہ تم نے ہمارا عندیہ پالیا ہوگا؟"

خلیفہ اتنا کہہ کے جواب کے لئے خاموش ہوگیا، اہل مجلس ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے، چند لحظے کے بعد ایک سپہ سالار اپنی نشست سے اُٹھا اور کہا:۔

" شاید امیرالمؤمنین کا اشارہ سمورہ کی جانب ہے"۔

عبدالرحمٰن (مسکرا کر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہشام! تمھارا گمان درست ہے، ہمارا روئے سخن اسی کی جانب ہے، تم سب بخوبی جانتے ہو کہ عربوں نے چار دانگ اندلس کو فتح کرکے اس کے تمام شہروں اور پہاڑوں پر اپنا تسلّط جمالیا ہے جس سے تمام قلمرو میں امن و اطمینان کا دور دورہ ہے، مگر ایک اہم مسئلہ ہمارے عیش کو منغص کر رہا ہے، دن بھر اسی کے افکار ہمیں بے چین رکھتے ہیں۔ راتوں کو نیند حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ شہر جلالقہ کا وہ مضبوط پہاڑی قلعہ ابھی تک سرکش ہے۔ اور آئے دن بلوؤں کی آگ وہاں سے بھڑک اُٹھتی ہے، ہماری فوجیں سمورہ پر حملہ آور ہوتی ہیں اور سمندر کی موجوں کی طرح اس کی دیوار سے ٹکرا کے واپس لوٹ آتی ہیں۔ عبدالرحمٰن جیسے صاحب عزم و جزم کیلئے مناسب ہے کہ وہ اپنے جانباز سپاہیوں کی بربادی پر چشم پوشی کرتا رہے جو سمورہ کے مقابل کھیت ہو جاتے ہیں؟ آئندہ نسلیں کیا کہیں گی کہ ہسپانیوں نے سمورہ کے مقابلہ میں عربوں کی ہوا بگاڑ دی، ایک ادنیٰ سا قلعہ فتح نہ کرسکے، اس بدنامی کو آپ لوگ برداشت کرسکتے ہیں؟ میں کہوں گا، ہرگز نہیں، اسلئے اے اُمرائے عرب! وافسرانِ فوج، ہم نے تمھاری رائے لینے کی غرض سے تمھیں مدعو کیا ہے، بتاؤ اس مہم میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اور ہمیں مشورہ دو کہ ہم دوبارہ اس قلعہ پر حملہ کرکے بزور اسے قبضہ میں کرکے اس پر علم اسلامی برپا کریں یا نہیں، ہم جانتے ہیں کہ اس حملے میں سخت نقصان برداشت کرنا پڑے گا، مگر ہمیں اپنے سینہ سپر بہادروں پر پورا اعتماد ہے کہ وہ سمورہ کو یقیناً فتح کرینگے"۔

تمام اُمرا و قائدین آپس میں مشورہ کرنے لگے، پھر ان میں سے ایک سپہ سالار نے جو سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، ایستادہ ہوکر کہا:۔

" امیرالمؤمنین! ہم آپ کی رائے سے متفق ہیں، کیونکہ ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ جلالقہ کی سطوت روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے، ہمیں لازم ہے کہ ہم اس خطرے کا تدارک کریں، اور انھیں ایسی کاری ضرب لگائیں کہ پھر سر نہ اُٹھا سکیں اگر امیرالمؤمنین کا حکم ہو تو کل ہی ہم خدا کا نام لیکر ایک لاکھ بہادر سپاہ سے سمورہ پر یورش کرکے اسے فتح کریں اور اس پر اپنا جھنڈا بلند کردیں"۔

اس جواب سے عبدالرحمٰن کے چہرہ پر مسرت نمودار ہوئی اور تشکرانہ لہجہ میں کہا:۔

" اللہ تم جیسے بہادروں سے مجھے محروم نہ رکھے، اچھا، اب تم حملہ کی تیاری میں مشغول ہو جاؤ، آئندہ ہفتہ کے اسی دن یہاں سے ہم کوچ کرینگے"۔

۲

دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد

عربوں نے جب تمام اندلس فتح کرلیا، اور وہاں کے قلعے اور استحکامات کو مسمار کرکے مدافعین کو تتر بتر کردیا تو ان میں کے تیس سور ما جنگجو فرار ہوکے ایک پہاڑ پر جا بسے جسے الصخرہ کہتے ہیں وہاں پر شہد اور درختوں کی جڑیں کھا کر گزارہ کرنے لگے، لیکن عربوں کے ماتحت ہونا منظور نہ کیا، عربوں نے ان کی نافرمانی کی پرواز کی انھیں یہ گمان نہ ہوا تھا کہ وہ میں جنگ جو بیج کی طرح نشو و نما پاکے ہزاروں کی تعداد

میں ہو جائینگے اور ایک بڑی فوج کی صورت جمع ہو کر آئے دن حملے کرتے رہینگے اور اکثر قلعے ان کے ہاتھ سے چھین لینگے۔ چنانچہ الصخرہ ہسپانی جلالقونکا گھونسلا اور وطن پرستی کا کوہ آتش فشاں بن گیا، تمام فرار شدہ ہسپانی وہاں اکٹھے ہو کے ۱۳۱ھ (۷۴۷ء) کا تھولک شاہ اذفونش کی قیادت میں عربوں پر حملہ آور ہو کے انھوں نے سمورہ اور اسکا سنگین قلعہ واپس چھین لیا اور اس میں قلعہ بند ہو کے عربوں کا مقابلہ کرنے لگے، عربوں نے بارہا اس قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، اخیر میں سمورہ کا قلعہ آشیانۂ عنقا کی طرح ناقابل تسخیر ہو گیا۔

عبد الرحمٰن الناصر کے ہاتھ جب زمام خلافت آئی تو اسکے چچاؤں نے بعض نمک حرام سپہ سالاروں سے ملکر اس کے خلاف بغاوت کردی۔ ملک میں خانہ جنگیوں کی آگ ہر طرف بھڑک اُٹھی۔ جس سے خلیفۂ اموی نے مجبور ہو کر جلالقہ کا خیال چھوڑ دیا، اور پہلے گھر کے باغی دشمنوں کو زیر کرنے میں مشغول ہو گیا جو اسکی حکومت میں شریک ہونے کے خواہشمند تھے۔ ان باغیوں میں فتنہ پرداز خائن اسحاق بن امیہ اور چند خلافت کے مخالف گروہوں کی شمولیت سے باغیوں کا پلہ بھاری ہو گیا، جس سے عبد الرحمٰن کو سخت جدوجہد کرنی پڑی، آخر میں اپنے چچاؤں اور باغیوں پر غالب ہو کے ان کا اثر تک مٹا دیا، مگر اسحاق ابن امیہ روپوش ہو گیا۔ خانہ جنگیوں سے فارغ ہوتے ہی عبد الرحمٰن از سر نو حکومت عربیہ کو مضبوط کرنے اور اندرونی لڑائیوں میں جو ممالک اسکے ہاتھ سے نکل گئے انھیں واپس لینے کا عہد کر لیا۔ سب سے پہلے اس نے سرکش جلالقہ کو شکست دیکر سمورہ کا سنگین قلعہ واپس لینے کی ٹھان لی۔ جو اس افسانہ کا اصلی موضوع ہے۔

۳

رات کا آخری حصہ گزرنے کو ہے، سمورہ کے باشندے میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں، سکوت کا عالم ہے یکایک غافل سونے والے قیامت خیز گھنٹوں اور ناقوسوں کی آواز سے گھبرا کے اُٹھ بیٹھے، کلیسوں کے مناروں اور قلعہ کی برجیوں سے بجلی کی کڑک کے مانند آوازیں گونجنے لگیں کہ "دشمن آپہنچے، دشمن آپہنچے"۔

قلعہ کی فصیل پر چڑھ کے لوگوں نے دیکھا کہ سمورہ کے گرد عربوں کی ہزاروں جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔ تمام دشت و جبل ٹڈی دل عربوں سے بھرے ہوئے ہیں، اس اثنا میں پہاڑ کی اوٹ سے آفتاب عالمتاب نورانی شعاعوں سے نمودار ہوا اور حملہ آوروں کی تلواروں اور نیزوں کو چمکا کے آنکھوں کو چکاچوند کرنے لگا۔ اس فوجی سیلاب کو دیکھتے ہی سمورہ کے باشندوں کو یقین ہو گیا کہ آج خون کی ندیاں بہنے والی ہیں، بربادی کی گھڑی سر پر آپہنچی، سمورہ کے تمام پیر و جوان اپنے ہتھیار سنبھال کے مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔

عربوں کے لشکر میں بھی حرکت پیدا ہو گئی، سپہ سالار اور قواد اپنے اپنے گھوڑوں کو کاوے دے رہے ہیں جن کے پیچھے ایک لاکھ بہادر تیغ آزما، نیزہ باز، تیر انداز پیادہ اور سوار جن کو عبد الرحمٰن نے چُن چُن کر اس معرکے کے لئے انتخاب کیا تھا صف بستہ پیشقدمی کر رہے ہیں۔ عبد الرحمٰن بخوبی جانتا تھا کہ سمورہ میں نہایت خوددار، تجربہ کار اور وطن پرستوں کی فوج ہے جن پر غلبہ پا لینا آسان نہیں ہے ان کے مقابلہ میں بہترین ثابت قدم، جانفروش سپاہ اور جنگی فنون کے ماہر سردار کی ضرورت ہے، وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے اور بہادر کو بہادر ہی زیر کر سکتا ہے۔"

آناً فاناً میں فریقین کی فوج بھڑ گئی، دن بھر سخت معرکہ ہوتا رہا، موت کا بازار گرم ہوا۔ جانیں ارزاں فروخت ہونے لگیں، خون کے نالے بہنے لگے، سر شام سمورہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا، یعنی عربوں نے اس کا مضبوط قلعہ فتح کر لیا اور شہر میں ظفریاب داخل ہو گئے۔ مگر انھوں نے ایک سخت غلطی کی جیسی کہ ان کی عادت ہے، نصرت کے نشے میں انھوں نے دشمن کا تعاقب نہ کیا نہ تمام جنگی استحکامات کو کامل طور سے قبضے میں کر کے شہر میں امن قائم کیا، بلکہ لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔ ان کی لاپروائی اور بیجا مشغولیت سے جلالقہ نے فائدہ اُٹھایا۔ ان کے تمام زعماء و سردار جنگل میں جمع ہو کے دوبارہ عربوں پر حملہ کرنے کا مشورہ کرنے لگے، ان کے مشورہ میں عبد الرحمٰن کا باغی سردار اسحاق بن امیہ بھی شامل تھا جس نے ان کی ہمت بڑھا دی اور اپنے ہم جنس فتحیاب عربوں پر دوبارہ حملہ کرنے کا نقشہ پیش کیا جس کو سبھوں نے منظور کر لیا۔ اور اسپر عمل کرنے کے لئے وقت کے منتظر ہوئے۔

جب آدھی رات گذر چکی تو اچانک جلالقہ عربوں پر ٹوٹ پڑے، جن کو عرب نہ روک سکے، اور پسپا ہو کر شہر کے ماحول خندقوں کو عبور کرنے لگے، تقریباً پچاس ہزار عبور کر گئے، اور باقی میدان میں کام آئے، جلالقوں کا ارادہ ہوا کہ تعاقب کر کے انھیں اور نقصان پہنچائیں، مگر اسحاق بن اُمیّہ اپنی قوم کی زیادہ بربادی نہ دیکھ سکا اسلئے جلالقوں کو روکتے ہوئے کہا:۔

خبردار عربوں کا پیچھا نہ کرو، میں ان کی عادت و مہارت جنگ سے خوب آگاہ ہوں، وہ لوگ کسی خاص وجہ سے پسپا ہوئے ہیں تاکہ میدان میں نکلکر تمھیں گھیر لیں، اور تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں، اسلئے بہتر ہے کہ تعاقب نہ کرو، گھر ہی میں بیٹھ کے اپنا مرکز سنبھال لو۔

۴

اگر [illegible] عبد الرحمٰن بیحد رنجیدہ اور غمگین ہوا۔ مگر اس منحوس دن کے بعد دوبارہ انتقام لینے کی فکر میں لگ گیا، کیونکہ وہ نہ چاہتا

تاکہ تاریخ اسکے شاندار کارناموں میں ایک ذلت کا ٹیکہ بھی لگاوے جو آئندہ نسلوں کے لئے مضحکہ خیز ہو۔ اس بنا پر مصمم ارادہ کرلیا کہ کسی صورت سمورہ کو فتح کرکے جلالقہ ہی کے خون سے اس دھبّے کو دھوکے چین لیگا۔

قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس شخص نے عربوں کو سمورہ سے نکلوانے کی سازش کی تھی اسی اسحاق بن اُمیّہ نے جلالقہ سے انتقام لینے میں عبدالرحمٰن کا ہاتھ بٹایا۔

سمورہ کے واقعہ کے چند ہی روز بعد اسحاق نے عبدالرحمٰن سے اپنی خطاؤں کی معافی کی درخواست کی، اور جان کی امان پاکے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عبدالرحمٰن نے اس کی بڑی قدر کی اور اپنے بہترین سرداروں کے مصاف میں اسے جگہ دی، تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی وقعت بڑھ گئی، اور عبدالرحمٰن کا قابلِ اعتماد مشیر خاص ہوگیا۔ اور جلالقہ سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا، اور جس طرح اس نے فتحیاب عربوں کو سمورہ سے پسپا کرنے کی ترکیبیں جلالقہ کو سمجھائی تھیں اسی طرح سمورہ کو دوبارہ فتح کرنے اور اسکے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا خاکہ تیار کرکے عبدالرحمٰن کی خدمت میں پیش کردیا، جسکو خلیفہ نے بخوشی منظور کرلیا، مگر اسحاق کے وجود کو میدانِ جنگ میں لازمی گردانا۔

۳۲۷ھ (مطابق ۹۳۸ء) کی ایک صبح کو عبدالرحمٰن الناصر نے دولاکھ چیدہ فوج کا قائدِ اعظم ہوکر سمورہ کی جانب کوچ کیا، اس حملے میں اس نے منجموں کی باتوں کی بالکل پرواہ نہ کی جو اس مہم کے خلاف حکم لگا رہے تھے کہ یہ حملہ بھی کامیاب نہ ہوگا کیونکہ سورج گہن کے تیسرے دن فوج کی روانگی مقرر ہوچکی تھی۔

چند روز میں عربوں کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پہنچا اور اس نے سمورہ کو اس طرح گھیر لیا جس طرح سمندر جزیرے کو گھیر لیتا ہے۔ دوسرے ہی دن صبح کو قوت جلالقہ چیں بول گئی، قلعہ عربوں کے قبضہ میں آگیا، اسکے دروازے کھولدئے گئے۔ اور عبدالرحمٰن صبا رفتار گھوڑے کی پشت پر فرطِ مسرت سے جھومتا ہوا قلعے میں داخل ہوا۔ چونکہ عرب گزشتہ شکست کی بھڑاس نکالنے پر تُلے ہوئے تھے اسلئے دل کھولکر انتقام لینے لگے، اگرچہ سردار انھیں روکتے رہے مگر وہ کب ماننے والے تھے، انتقام کا بھوت ان کے سروں پر سوار تھا، عبدالرحمٰن نے بھی ان کی جانب سے چشم پوشی کرلی، اور انھیں ان کی حالت پر چھوڑ کے خود گھوڑے پر سوار ہوکر چند سرداروں کی معیّت میں لاشوں اور زخمیوں کی خبر لینے قلعے سے باہر نکل کر میدانِ جنگ کا معائنہ کرنے لگا، اتفاقاً ایک شیرخوار بچّے کی آواز دبی ہوئی لاشوں کے درمیان سے آتی ہوئی سُنائی دی، فوراً گھوڑے کی باگ آواز کی طرف موڑ کے دیکھا کہ فصیل کی منہدم دیوار کے قریب ایک گرے [illegible] پڑا ہوا بچہ بلبلا رہا ہے، فوراً گھوڑے سے اُتر کر بچے کو گود میں لیلیا اور اپنے عبا میں لپیٹ کے پُرشفقت ہاتھوں سے اسے تھپکیاں دیتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ بچہ خلیفہ کی گود میں خاموش ہوگیا۔ اسکے ننھے ننھے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، چنانچہ شام تک میدان میں گھوم کے اس شاہی شامیانے میں آیا جو اس کے لئے اس پُل کے قریب نصب کیا گیا تھا، جس پر سے عرب پسپائی کے دن عبور کرگئے تھے پھر اسی پُل پر سے سمورہ میں داخل ہوئے، عبدالرحمٰن نہایت شان و شوکت سے تخت نما کرسی پر آ بیٹھا، اردگرد اعلیٰ افسر اپنی نشستوں پر متمکن تھے، اور حکم کیا کہ تمام مالِ غنیمت ہمیں پیش کی جائے جسے ہم بھی دیکھیں گے اور ہمارے سردار بھی دیکھیں گے۔ حکم پاتے ہی سپاہی جوق در جوق غلاموں اور کنیزوں کو لئے ہوئے شامیانے کے آگے سے گذرنے لگے، یکایک زور سے رونے اور چلّانے کی آواز شامیانے میں پہونچی عبدالرحمٰن فوراً دربان کی طرف ملتفت ہوکر :-

یہ آواز کیسی آئی کون چلّا رہا ہے؟

دربان جواب دینے نہ پایا تھا کہ ایک نوجوان عورت دیوانہ وار کُھلے بالوں، پھٹے کپڑوں میں صفوں کو چیرتی ہوئی شامیانے کے درمیان آکے کھڑی ہوگئی اور چلّا کے کہا:-

عربوں کا بادشاہ تم میں کون ہے..... کون ہے، بتاؤ کون ہے؟

پہرے دار اسپر جھپٹ پڑے اور اسے چوطرف سے گھیر لیا۔

عبدالرحمٰن۔ ہٹ جاؤ اسے نہ چھیڑو، تم میں سے کوئی جانتا ہے یہ کون ہے؟ اور کیوں اس حالت میں ہمارے سامنے آگئی ہے؟

ایک سپاہی۔ امیرالمؤمنین! یہ عورت چند گھنٹے پیشتر میدانِ جنگ میں دیوانہ وار اِدھر اُدھر دوڑتی، لاشوں کو اُلٹتی پھرتی، کسی لاش پر گرکے اسکے بوسے لیتی پھر اُٹھ کے کسی چیز کو تلاش کررہی تھی، اس حالت میں اسے دیکھ کے ہم نے گرفتار کرلیا اور حضور کے آگے لا رہے تھے۔

عبدالرحمٰن۔ (نہایت نرمی سے) اے لڑکی، ہم ہی عربوں کے بادشاہ ہیں۔ اپنی بپتا سُنا۔ ہم سے کیا چاہتی ہے؟

عورت۔ (غیظ و غضب میں بھری ہوئی شرربار آنکھوں سے دیکھ کر) او، عورتوں کے خونی، ان کے بچوں کو ذبح کرنے والے سفاک! لا میرا بچہ مجھے دلوا کیا یہی عدل و انصاف لیکر تو ہم پر حملہ آور ہوا ہے، یہی تیرے عہد و پیمان ہیں جو تو نے ہمیں پناہ دینے کے لئے کئے تھے؟ دیکھ تیرے سپاہی شہر بھر کو کس طرح لوٹ رہے ہیں، ماؤں کی گودیوں سے بچّے چھین رہے ہیں، ننھّوں کو ذبح کررہے ہیں، [illegible] کررہے ہیں، عبدالرحمٰن! کیا اسی لئے تجھے الناصر (مددگار) کا لقب دیا گیا ہے۔ واہ..... کیا اچھا ناصر، اور کیا

عمدہ لقب ہے !!!

عبدالرحمٰن کو اس عورت کی باتوں نے خشمگین کر دیا، غصہ سے چہرہ تمتمانے لگا، گردن اُٹھا کے شہر کی طرف دیکھا جہاں آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں - اور دلخراش رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی ہیں، پھر اس پریشان حال مظلوم عورت کو ترحم آمیز نظر سے دیکھنے لگا، گویا اس کا ضمیر مجسّم ہو کر اسے ملامت کر رہا ہے کہ تیری فوج محض اسلئے شہریوں پر ظلم و ستم کر رہی ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کی مدافعت کی اور حملہ آوروں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کیا۔

عبدالرحمٰن ـــ (سرداروں کی طرف ملتفت ہو کے) جاؤ، اسی وقت سپاہیوں کو ظلم و تعدی سے روک لو۔ اگر کوئی نہ مانے تو اس کی گردن اُڑا دو۔ (عورت سے مخاطب ہو کے) لے زیادہ پریشان نہ ہو، ہم ابھی شہر میں قتل و غارت موقوف کر کے امن قائم کئے دیتے ہیں، بس ؟

عورت ـــ (روتی اور ہچکیاں لیتی ہوئی) اور میرا بچہ، میرا دودھ پیتا لال، جسے تیرے وحشی سپاہی نے میری گود سے چھین کے میری جان نکال لی ہے اسے مجھے واپس دلوائیگا؟ یا تو بھی ان فعلوں کو جائز سمجھتا ہے جسے تمام شریعتیں حرام سمجھتی ہیں، تیرے سپاہی جس تعدی اور جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں ان سے تو راضی ہے؟ جن کو مسیحؑ اور محمدؐ دونوں نے منع کیا ہے، اگر تیرے دل میں والدین کی محبت کا کچھ بھی احساس ہو، تو خدا کے لئے میرا ننھا مجھے واپس دلوا دے۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، عبدالرحمٰن! میں تیرے قدم چومتی ہوں۔

عبدالرحمٰن ـــ (مسکراتا ہوا) اے لڑکی! عبدالرحمٰن اتنا سنگدل نہیں ہے جتنا کہ تو سمجھ رہی ہے، ممکن ہے کہ اللہ نے اپنی عنایت سے اسوقت تجھے ہمارے پاس بھیجا ہو، لے دیکھ یہ بچہ تیرا تو نہیں ہے ؟

یہ کہتا ہوا عبا کا دامن اُٹھا کے اس سوئے ہوئے بچّے کو جسے گھنٹوں سے گود میں لئے ہوئے تھا زمین پر رکھدیا، بچّہ بھی ماں کی قربت محسوس کر کے خوشی سے رونے لگا، بچے کی صورت دیکھتے ہی اس کی ماں اس زور سے چیخی کہ سارا شامیانہ گونج اٹھا، اور جھپٹ کے بچہ پر گر پڑی، اور اسکے رخساروں کو چومنے اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ دھونے لگی۔ پھر بچہ کو سینے سے لگائی ہوئی دیر تک سربسجدہ رہی، بعد ازاں سر کو اٹھا کر شکر گذار نگاہوں سے عبدالرحمٰن کو دیکھتی ہوئی کہنے لگی :۔

اے عادل شہنشاہ! تو سب سے اعلیٰ حاکم، سب سے بڑھکر رحمدل اور سب سے افضل اخلاق کا مالک ہے۔ میری ہرزہ سرائیوں سے درگذر، اللہ تیری عمر دراز کرے، برسوں تو جئے، اور تیرے بعد خدا تیرے بچّوں اور بچوں کے بچوں کو اپنے ۴

۴ سایۂ عنایت میں محفوظ رکھے، تو نے میرا بچہ مجھے دلا دیا، اللہ تجھے ساری دنیا دلائے۔

عبدالرحمٰن نے اپنے کارناموں میں لکھا ہے کہ میں نے پچاس سال تک اُندلس کے تختِ خلافت پر حکمرانی کی، اس مدت دراز میں مجھے صرف چودہ دن خوشی کے نصیب ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مشہور دن وہ ہے جس دن میں نے باغی اور سرکش جلالقہ کو شکست دیکے سمورہ کا مضبوط قلعہ فتح کیا اور ایک آفت رسیدہ سموریہ عورت کو اس کا کھویا ہوا طفل اسے واپس دلا دیا۔

باتیں

از جناب راشد القریشی صاحب چھاؤنی مہو

حسن و الفت کے راز کی باتیں!
کیوں نہ ہوں سوز و ساز کی باتیں

کِس نے دیکھا ہے تجھے حقیقت میں
کون سمجھا مجاز کی باتیں!!

صرفِ عجز و نیاز کر دیں گی
بندۂ بے نیاز کی باتیں

ہو رہی تھیں ابھی تخیل میں
ان سے راز و نیاز کی باتیں!

کس سے کہئے دمِ وداع ہنوز
حسنِ حسرت طراز کی باتیں

کیوں میں ناکامیوں سے گھبراؤں
یہی ہیں خاص راز کی باتیں!

تیری چوکھٹ مری جبینِ نیاز
اور کیا ہیں نیاز کی باتیں!!

دل میں بھرتی ہیں سوزِ الفت کا
مطربِ بے نواز کی باتیں

ورنہ ہیں تکمیلِ عشق میں راشدؔ
شوقِ حسرت نواز کی باتیں!!

اِفلاس!

اس نظم کے چوکٹے میں افلاس کی ایک مہیب اور خوفناک تصویر آپ دیکھیں گے جس کے نقش جناب مولوی افتخار احمد صاحب فخرؔ کے موقلم نے تخلیق کئے ہیں۔ غایت افلاس کا نتیجہ اکثر خودکشی اور بے دینی پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ ✽ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

نفس مضمون سے قطع نظر، نظم کی فصاحت اور سلاست قابل داد ہے اور بعض اشعار میں خوش کلامی اور اچھوتے خیالات حد کمال تک پہنچے ہوئے ہیں مثلاً اس شعر کی تعریف نہیں کی جاسکتی ؎

وہ فوارے کبھی جو ناز سے لیتے تھے انگڑائی ✽ غریبوں کی عفونت سے انھیں آتی ہے اُبکائی

یہی وجہ ہے کہ فخرؔ صاحب کو سائنس کالج پٹنہ سے انعامی مشاعرہ منعقدہ ۲۱ دسمبر ۴۱ء میں اس نظم کی وجہ سے انعام میں ایک نقرئی کپ ملا۔ ہم شکریہ کے ساتھ اس نظم کو درج کر رہے ہیں اور متوقع ہیں کہ موصوف آئندہ بھی اپنے رشحاتِ فکر سے "مشہور" کو نوازتے رہیں گے۔

ایڈیٹر

نہ پوچھ افلاس و نکبت کا نتیجہ ہمنشیں مجھ سے
بہت ہیں نکبت و افلاس کے گھر میں مکیں مجھ سے

بشر سے جبکہ نادانستہ کوئی چوک ہوتی ہے
سزا پھر اس کی قدرت کی طرف سے بھوک ہوتی ہے

پھر اس کے واسطے دُنیا جہنم زار ہوتی ہے
جہانِ رنگ و بو میں زندگی بیکار ہوتی ہے

بھیانک رات، عفریتِ حوادث نیچے تانے
کوئی ایسے بھیانک خواب کی تعبیر کیا جانے

افق کی وسعتوں پر پھیلنے لگتے ہیں اندھیارے
فضا مغموم، منظر مضمحل، افسردہ نظارے

فلک پہ ابر کے ٹکڑے اداسی بن کے چھاتے ہیں
غریبوں کی زبوں حالی پہ تارے مُسکراتے ہیں

بہار آتی ہے لیکن اپنی رعنائی نہیں لاتی!
وبا کی طرح آتی ہے مسیحائی نہیں لاتی!

لبِ تالاب جس دم غنچۂ نورس چٹکتے ہیں
دلِ مجروح میں ٹوٹے ہوئے کانٹے کھٹکتے ہیں

بوقتِ صبح خوش ہو کر جو طائر چہچہاتے ہیں
تو خوشحالی کے عشرت خیز نغمے یاد آتے ہیں

وہ فوّارے کبھی جو ناز سے لیتے تھے انگڑائی
غریبوں کی عفونت سے انھیں آتی ہے اُبکائی

غریبوں کی بھٹکتی ہے کھُلے سر خانہ ویرانی
ترس جاتی ہے پھر دو گز کفن کو لاشِ دہقانی

بوقتِ تنگدستی آشنا نہ بیگانہ میگردد
صراحی چوں شود خالی جُدا پیمانہ میگردد

کبھی انسان جب افلاس سے مجبور ہوتا ہے
تو خود اس کا وجود اس کے لئے ناسور ہوتا ہے

در و دیوار پر مفلس کے اک حسرت برستی ہے
لحد شرمندہ ہو جس سے وہ اسکے دل کی بستی ہے

تڑپتے لوٹتے ہی مفلسوں کے دن گذرتے ہیں
سمجھ لو مختصر یہ ہے کہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

یہ مجبوری! اگر نالے دل سے باہر آ نہیں سکتے
جو آئیں بھی تو تا بابِ اجابت جا نہیں سکتے

کرم مفلس پہ جب کرتی نہیں ہے چشمِ ربّانی
تو جھنجھلا کر اُٹھا لیتا ہے سجدے سے وہ پیشانی

کوئی جب اسکو صبر و ضبط کی تلقین کرتا ہے
تو جھلّا کر خدائے دھر کی توہین کرتا ہے

کرن سورج کی نیزے کی اَنی معلوم ہوتی ہے
ثریّا اس کو ہیرے کی کنی معلوم ہوتی ہے

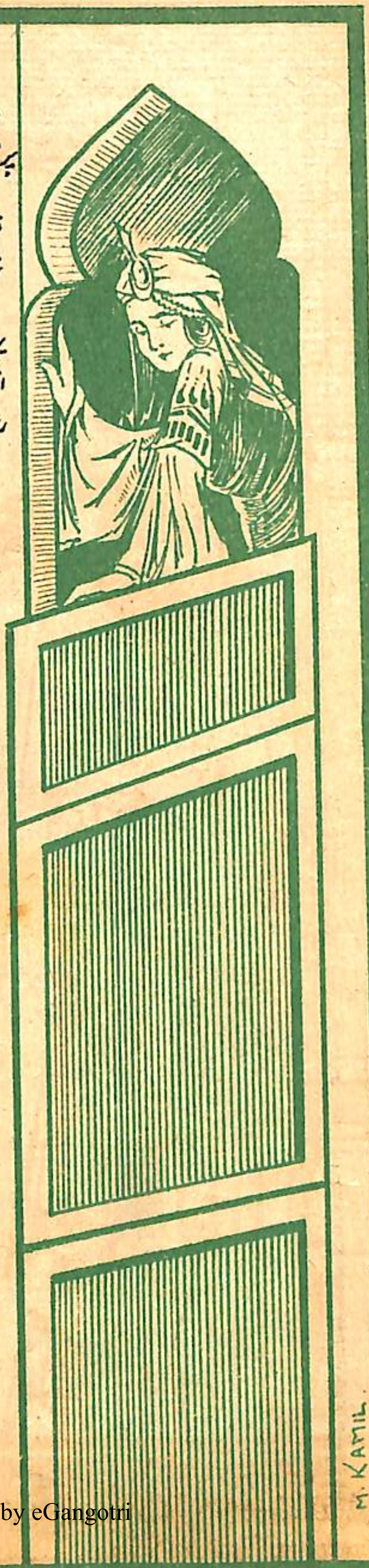
سماجی بھیڑئیے جب در پئے آزار ہوتے ہیں
رہِ مفلس میں سو سو طرح کے خار بوتے ہیں!

غریبوں کے لہو سے ہولیوں کے کھیلنے والے
لگاتے ہیں زبانِ شوخ پر قانون کے تالے

تو تنگ آ کر وہ دُنیائے مہذب چھوڑ دیتا ہے
اور آبادی سے پھر وابستگی وہ توڑ دیتا ہے

مگر پھر بھی سکوں ملتا نہیں جب اسکو صحرا میں
تو میٹھی نیند سو جاتا ہے وہ آغوشِ دریا میں

زِ دُنیا نفرتے دارد، تو وحشت دارد از عقبےٰ
دریں بازارِ قلاشی نہ دیں دارد و نے دنیا



ابھی تو اپنے ہی معنی سمجھ رہا ہوں میں

حضرت اصغر شعری بھوپالی دَورِ حاضر کے ایک مستند اور باکمال شاعر ہیں آپکے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ذیل کے پاکیزہ اشعار قلب و دماغ کو وجدانی سُرور سے مخمور بنانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ مطلع اولیٰ کے ثانی مصرعہ میں "حباب گریز پا" کی داد نہیں دی جاسکتی، یہ قادر الکلامی کا نادر نمونہ ہے، یوں تو تمام غزل ہی مرصع ہے مگر خصوصیت کے ساتھ صاد شدہ اشعار بہت ہی پُرکیف اور وجد آگیں ہیں امید کہ قارئین "مشہور" جن کا بفضلہ معیارِ سخن بہت بلند ہے اتنی اچھی غزل پر شعری صاحب کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرینگے۔ ایڈیٹر

بقا سے پہلے ہی آمادۂ فنا ہوں میں — مجھے نہ چھیڑ حبابِ گریز پا ہوں میں
ہجومِ شوق سے گھبرا کے جب اُٹھا ہوں میں — فضائے قدس میں گم ہو کے رہ گیا ہوں میں
نگاہِ مست کا عنوانِ مُدعا ہوں میں — شراب پینے سے پہلے بہک گیا ہوں میں
حوادثاتِ زمانہ سے کھیلتا ہوں میں — چراغِ رہگذرِ منزلِ فنا ہوں میں
نہ جانے ساز ہوں یا ساز کی صدا ہوں میں — بتا سکے تو بتا دے کوئی کہ کیا ہوں میں
قیودِ ذوقِ تمنا سے ماورا ہوں میں — انھیں انہی کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں میں
بطورِ خاص تجلی کا سامنا ہوں میں — حجابِ ہستیِ دل لیکے اُٹھ گیا ہوں میں
متاعِ درد کی لذت سے آشنا ہوں میں — جہاں سکون ملا ہے تڑپ گیا ہوں میں
سُنیں خموشی سی مگر اہلِ دل سنبھل کے سُنیں — جو ساز توڑ کے نکلی ہے وہ صدا ہوں میں
محیط ہے مری فطرت، بسیط ہے مرا شوق — مجاز بن کے حقیقت پہ چھا گیا ہوں میں
فریبِ حُسن مری سادگی تو دیکھ ذرا — ترے کرم کو کرم ہی سمجھ رہا ہوں میں
فروغِ سوز، گدازِ الم، متانتِ آہ — ہمیشہ آگ کے شعلوں سے کھیلتا ہوں میں
نہیں ہے کیوں مجھے احساسِ ہستی و مستی — تمہارے پاس سے شاید گذر رہا ہوں میں
ہیں اہلِ بزم بصد شوق گوش بر آواز — جو ساز میں ابھی مضمر ہے وہ صدا ہوں میں
فضائے دل میں باندازِ اضطراب و خلش — تڑپ رہے ہیں وہ آنسو جو پی گیا ہوں میں
تجلیِ مہ و انجم، بساطِ لالہ و گل، — بہت حسین فریبوں سے کھیلتا ہوں میں
کبھی نظر جو اُٹھا دی ہے جوشِ مستی میں — نہ جانے کتنے حجابات اُٹھا گیا ہوں میں
کہاں ہے فرصتِ تشریحِ کائنات مجھے — ابھی تو اپنے ہی معنی سمجھ رہا ہوں میں

زمانہ اب مرے زیرِ قدم ہے اے شعری
حدودِ کون و مکاں سے گذر چکا ہوں میں



آئینہ دیکھ رہا ہے وہ سنورنے والا

نمکحرام قاتل!

از
جناب حضرتِ دیوانہ
بریلوی

حضرتِ دیوانہ بریلوی دُنیائے ادب میں ایک باکمال اور مشہور ہستی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ افسانہ نویسی میں گنتی ہی کے چند لوگ آپکے مقابلہ میں لائے جاسکتے ہیں ورنہ عام طور پر ادب کی اس صنف میں موصوف کو معراج کمال حاصل ہے چنانچہ ذیل کے افسانہ میں تفتیش جرم کا جو نفسیاتی پہلو طوطے کی زبانی پیش کیا گیا ہے وہ جسقدر اچھوتا ہے اسیقدر مطابق فطرت بھی ہے۔ بظاہر آپ اسے اتفاق سے تعبیر کیجئے یا کچھ اور کہئے۔ مگر دیکھا یہی ہے کہ بیگناہوں کا خون اسی طرح رنگ لاتا ہے اور قاتل اپنی ہوشیاری کے باوجود بچ نہیں سکتا ؎

قریب ہے، یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا!

"مشہور" دیوانہ صاحب کا ممنون ہے کہ انتہائی مصروفیت کے باوجود آپنے بہت اچھا افسانہ لکھکر سالنامہ کو زینت بخشی۔ ایڈیٹر

(✻)

"ملتو!..... کمبخت......... دیکھ میرا دم گھٹا جا رہا ہے....

..... ارے دوڑیو......... قتل......... مدد........"

یہ آخری الفاظ تھے جو سر یمتی راجکماری سرلا دیوی کے مُنہ سے دم توڑتے وقت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر نکلے ——— وجہ یہ تھی کہ ان کے ملازم خاص مسمی ملتو نے جس کا نام حصول مراتب کے بعد درباری احترام کے لئے "لالتا پرشاد" قرار پاگیا تھا اپنے عزم بالجزم اور پرجوش غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ان کا گلا ایک بپھرے شیر کی یقینی گرفت کی طرح دبا دیا اور اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کو ان الفاظ کے دہرانے کی سکت کسی طرح باقی نہ رہے۔

حملے کے بعد یہ دوسری کوشش تھی کہ یہ الفاظ ان کے مُنہ سے نکل سکے لیکن لالتا پرشاد نے اس کا معقول اہتمام کرلیا تھا کہ تیسری بار ان کی آواز ہرگز کام نہ دے۔ وہ چونکہ ان کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا اسلئے اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں کی ساری قوت اور اپنے بھاری جسم کے جملہ وزن کا ایک ایک جزو صرف کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ حتیٰ کہ آخری ہچکیوں کے بعد بے جان ہوکر راجکماری نے اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ دئے۔

لالتا پرشاد پر کوئی خوف و ہراس طاری نہ ہوا اور نہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ اس کی خونی آنکھوں کا جنون اور اس کے چہرہ پر ارتکاب جرم کے خوفناک اثرات اب بھی اسی طرح بھیانک اور ڈراونے تھے۔ مخملی گدوں والی آرام کرسی کے تکیہ پر راجکماری کا سر ایک حسرتناک زاویہ پر ڑک گیا۔ ان کی زربفت کی بنارسی ساری کا آنچل سینے کی پردہ پوشی سے منکر ہوکر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ ان کی بڑی بڑی آہو مثال آنکھیں فنا اور بقا کے درمیانی ارتکاز اور بے بسی سے آلود ہوکر چھت سے لگ گئیں۔ سچے موتیوں کا سُت لڑا ہار ان کے سینہ پر ایک بے ترتیب حالت میں اپنی آب و تاب سے آنکھوں میں خیرگی پیدا کرنے لگا ——— لالتا پرشاد کی نظر اس ہار پر پڑی تو اس کے چہرہ پر نت نئے جذبات کی رنگینیاں نمودار ہوگئیں ——— وہ آگے بڑھا ——— گھنڈی کھولکر ہار اُتارا ——— اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر اس کے وزن کا جائزہ لیکر اس بیش بہا خزانہ کو اپنی جیب کے سپرد کردیا ——— اس کو مطلق خوف نہ تھا کہ راجکماری کی "فریاد" کسی کے کانوں تک پہونچی ہوگی ——— یا کسی نے اس کی آواز پر مدد کے لئے قدم اُٹھایا ہوگا وہ اسی اطمینان قلبی کے ساتھ انگوٹھوں کے بل دروازہ کی طرف بڑھا۔

چٹخنی کھولی ——— باہر مُنہ نکالکر اِدہر اُدہر دیکھا ——— ہر طرف خاموشی ——— سکون مطلق ——— طاری تھا ——— اس نے دروازہ پھر بند کردیا۔ چٹخنی بھی لگادی۔ اور پھر ——— اپنی نمکحرامی کے ثبوت ——— اپنی سفاکی کے نتیجہ کچھ دیر تک بغور دیکھتا رہا ——— غالباً اس کی نظریں اپنے سامنے والے مُردہ لبوں سے آئندہ تجاویز کی رہنمائی کے لئے کچھ پوچھنا یا کہنا چاہتی تھیں۔ وہ اب بھی پیکر صبر و سکون بنا ہُوا تھا ——— جُرم مستوفی ——— اور مجروح پیش نظر ——— دونوں باتوں نے ابھی اسکو اپنی توجہ اور خیالات کا رُخ بدلنے نہ دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسوقت کوٹھی بھر میں سوائے بُڑھی باورچن کے اور کوئی موجود نہیں ——— اور پھر تقدیر سے وہ بھی بہری اور کچھ آنکھوں سے بھی مجبور ——— دوسرے نوکر چاکر سب کے سب فرصت کا وقت گذارنے ادہر ادہر چلدئے تھے۔ وہ سب کا سردار تھا اور معمولاً ایسے وقت میں سب کو ہاٹھ بازار جانے کی اجازت دیدیا کرتا تھا۔ سبکو رخصت ہونے سے پہلے اسکے فرائض میں یہ داخل تھا کہ سب کمروں میں روشنی کا اہتمام

کرے ۔ مسہری پر بستر اور کوچ کرسیوں پر گدے آراستہ کرے اور راجکماری کے مخصوص شوق کی چڑیوں کو جن میں ہیرامن طوطے ۔ پہاڑی مینا ۔ لال منیان طوطی ۔ قمری اور دیگر خوشرنگ اور خوش گلو پرند شامل تھے دانہ پانی دیکر ان کے گنگا جمنی پنجروں پر زربفت اور مخمل کے کارچوبی غلاف چڑھا دے ۔

شریمتی راجکماری سرلا دیوی ـــــ راجہ جے چند کی اکلوتی بیٹی ـــــ عین معراج شباب میں ـــــ شادی کے دو سال بعد ـــــ دفعتہً بیوہ ہو گئی ۔ بال بچہ بھی کوئی نہ ہوا جس سے جی بہلتا ۔ برسوں سوگ منانے اور ہر دم زار و قطار رونے کے بعد ذرا دل کی بھڑاس کم ہوئی تو باپ کی منت سماجت پر ـــــ اپنی فرمائش سے ـــــ ریاست کے ایک گوشہ میں ـــــ اپنے لئے علیحدہ خوبصورت کوٹھی تعمیر کرالی ۔ دل کے بہلنے کی صورت یہ نکالی کہ ہر قسم بولنے اور چہکنے والے نایاب پرند بڑی تلاش کے بعد کثیر رقموں پر خرید کر پالے گئے ۔ سونے چاندی کے پنجرے بنے ۔ اور ان کی تعلیم کے لئے ماہر فن ملازم رکھے گئے ۔ راجکماری دن بھر ان سے باتیں کیا کرتی اور وہ بھی کچھ اسکے "درد دل" سے آشنا ہو کر ہر دم اپنے خوشنوا نغموں سے سامعہ نوازی کیا کرتے ۔

کوٹھی کی دیکھ بھال اور دیگر ضروریات کے انتظام کے لئے منشی لالتا پرشاد کا انتخاب ہوا ـــــ یہ راجہ کے مُنہ چڑھے تھے ۔ پُرانے تجربکار ۔ منتظم ۔ دیانت دار اور ہمدرد مانے جاتے تھے ۔ لیکن سچ پوچھئے تو حضرت تھے بڑے "چلتے پرزے" اس قاتلانہ حملہ کی وجہ اور بنا یہ تھی ۔ کہ آج لالتا پرشاد کے سامنے ہی راجکماری کو بنک کے حساب کی کتاب وصول ہوئی ۔ اس کو یقین تھا کہ حساب پر نظر پڑتے ہی راجکماری کو معلوم ہو جائیگا کہ اس میں متعدد رقمیں ایسی بھی درج ہیں جن کا تعلق راجکماری سے اصلاً نہیں ۔ بلکہ خود بدولت نے راجکماری کے فرضی دستخط بنا کر اپنی قماربازی اور شراب نوشی کے نتائج بھگتنے اور انہی سلسلوں کا قرض ادا کرنے کے لئے چیک پر چیک لکھ کر روپیہ حاصل کیا ہے ۔ چیکوں کے علاوہ اور معاملات بھی تھے جنھوں نے اس کا دماغ پراگندہ کر دیا تھا ۔ بسا اوقات یہ بھی ہو چکا تھا ۔ کہ راجکماری کے قیمتی زیورات پر ہاتھ صاف کر کے جوہریوں اور صرافوں سے دام کھرے کئے جا چکے تھے ـــــ صرف اس امید موہوم اور خیال خام پر کہ کسی نہ کسی دن بازی جیت کر یہ زیورات واپس اور قرضہ کا روپیہ پورا کر دیا جائے گا ۔ لیکن وہ ساعت نہ آنا تھی نہ آئی ۔ خوش قسمتی سے اب تک نہ تو افشائے راز ہوا اور نہ جلد ہونے کے کوئی اسباب پائے جاتے تھے اسلئے رفتہ رفتہ یہ "سرقہ" عادت ثانیہ بن گیا اور ایک مساوات کا عالم پیدا ہو گیا ۔ حتیٰ کہ آج وہ نامبارک گھڑی سامنے تھی ۔ جبکہ پانی سر سے اونچا نظر آرہا تھا ۔ راجکماری نے تحکمانہ لہجہ میں جسوقت یہ کہا کہ ـــــ "دو شام کو فرصت پاکر ذرا میرے پاس آنا" تو اس کے ہوش اُڑ گئے اور اس "طلبی" کے متعلق تمامی معاملات اور کوتاہیاں دوڑ دوڑ کر [illegible]

فرائض منصبی سے فرصت پانے کے بعد اس نے راجکماری کو اپنا منتظر پایا اس کی بے عنوانیوں کے جملہ ثبوت اور نمک حرامیوں کے سارے اسباب اسکے سامنے میز پر آراستہ تھے ـــــ چیک کی کتاب ۔ بنک کی پاس بک ۔ بلکہ ساری کا ایک جڑاؤ پن بھی جس کو پوشیدہ طور پر وہ اپنے بکس میں محفوظ کر چکا تھا ۔ راجکماری نے اس کے جرائم کا اظہار غیر معمولی غصہ کے ساتھ کیا ـــــ اور بغیر صفائی طلب کئے یا کوئی جواب سُنے ۔ اسی غصہ کی حالت میں اُٹھکر ٹیلیفون پر پہونچ گئی تاکہ پولیس کو اطلاع دیکر مجرم کو اسکے کیفر کردار تک پہونچایا جائے . . . .

لیکن دفعتہً لالتا پرشاد آگے بڑھا . . . . اور اسکو خود یاد نہیں کہ کیونکر اور کس طرح واقعات مابعد عالم ظہور میں آئے ـــــ ہاتھا پائی کی نوبت ـــــ ان کا کرسی پر گرنا ـــــ چیخنا ـــــ آواز روکنے کے لئے گلا دبانا ـــــ اور مآل کار ان کا ختم ہو جانا ۔

کمرہ میں اسی طرح خاموش کھڑے اب اس کو اپنی "شومیٔ قسمت" کا خفیف سا احساس ہوا ۔ جرم سے بچنے اور اس کی پردہ پوشی کے لئے اسکو مجبوراً یکے بعد دیگرے شدید جرائم کا ارتکاب کرنا پڑا ۔ لہذا اب اسکے لئے ضروری تھا کہ اخفائے جرم کی ہر ممکن کوشش کرے ـــــ اگر وہ فرار ہوتا ہے تو یقیناً الزام اپنے سر لیتا ہے ـــــ اگر ٹھیرتا ہے تو پولیس والوں کے چنگل سے بچنا محال ہے ـــــ ایک سوال تھا کہ اسکے چکراتے ہوئے دماغ میں دفعتہً گھوم گیا ـــــ آخر ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت مناسب ہوگی ؟ ـــــ اس کا جواب تھا اور صرف ایک ! یعنی یہ کہ ٹھہرنے کی حالت میں پولیس والوں کو دھوکہ فریب دینا تو ممکن لیکن روپوشی کے نتائج ـــــ ظاہر اور معلوم ۔ چنانچہ اسکے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکلا ۔ "ہاں ! ـــــ یہ ممکن ہے ـــــ ابھی کم از کم ایک گھنٹہ کا وقفہ ہے ـــــ میں کوشش کرتا ہوں ۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہو ـــــ برسر تقدیر"

لالتا پرشاد آدمی تھا بڑا ہوشیار اور فطرتی ۔ اسپر پیہم دماغی کاوشوں اور مسلسل بیجا حرکتوں کے شبانہ روز غور و خوض نے اسکے دماغ پر مزید صیقل کا کام کر دیا تھا ۔ مختلف تجاویز کو سوچنے ۔ وزن کرنے اور ان کے عملدرآمد کا نقشہ کھینچنے اور خاکہ تیار کرنے کے بعد بالآخر اسکی "مجرمانہ قابلیت" آڑے آہی گئی ۔ چنانچہ پہلا کام اس نے یہ کیا کہ کمرہ کے باہر نکلا ۔ دروازہ میں قفل لگا کر کنجی جیب میں رکھی اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا ۔ وہاں سے ہاتھوں میں دستانے پہنکر اُلٹے پیروں اسی کمرے میں واپس آیا ۔ میز پر رکھی ہوئی چیکوں کی کتاب کو دہکتی ہوئی انگیٹھی کے سپرد کیا ـــ پاس بک اُٹھا کر ایک طرف گوشہ میں ڈالدی ۔ اور پھر پائیں باغ والے کمرے سے جھاڑو لاکر ہر ممکن نشان کو مٹانے کے لئے فرش پر ہر طرف سنبھال سنبھال کر صفائی کر دی ۔ اس سے فراغت پاکر اس کمرہ کو مقفل کر کے دوسرے کمرہ میں [illegible] خوب سا گوندلگایا اور اس کو ہاتھ میں لئے

ہوئے پچھلے دروازہ سے سیدھا باغیچہ کے مال خانہ میں چلا گیا۔ یہاں پہنچکر اس نے ایک طرف پُرانا گنوارو جوتہ پڑا دیکھا۔ جو کبھی باغ کے مالی کے پاؤں کی زینت کا باعث تھا۔ جوتا دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھِل گئیں۔ فوراً اپنا جوتا اُتار کر وہیں کھاد کے انبار میں چھپا دیا۔ اور اس کو بکوشش تمام پہن لیا۔ ہر چند کہ جوتا اس کے کافی تنگ تھا اور اپنی بوسیدگی اور "سودیشی پن" کے باعث مختلف مقامات سے پاؤں کی درگت بنائے دیتا تھا۔ لیکن اسوقت یہ کیا بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم تکالیف صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لینا اس کے لئے عین راحت تھی۔ یہ تمام بیرونی، کارروائیاں تاریکی شب میں بلا تکلف عمل میں آئیں۔ کیونکہ لالتا پرشاد کوٹھی کے گوشہ گوشہ سے بخوبی واقف اور ہر شے کی جگہ اور قیام سے آشنا تھا۔

اب وہ گھوم کر اصلی کمرہ کے پیچھے والی کھڑکی کی طرف گیا۔ جس کے اوپر چڑھ جانا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کھڑکی کے اندرونی حصہ میں سوزن کاری کے دبیز بردے پڑے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے باہر کی جانب روشنی کا کوئی اثر نہ تھا لالتا پرشاد نے گوندوالا کاغذ اوپر والے شیشے پر چسپاں کر دیا اور پھر خدا معلوم ہیرے کی کنی یا کوئی دوسرا شیشہ تراشنے کا اوزار جیب سے نکالکر اس کے چاروں طرف پھیر دیا۔ یہاں تک اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے بعد اس نے بقول شخصے "اطمینان کا لمبا ٹھنڈا سانس لیا" اور پھر مزید اطمینان کے لئے ہر طرف نظریں دوڑا کر دفعتہً ایک گھونسا اس جگہ مار دیا جہاں کاغذ چسپاں تھا۔ شیشہ کا وہ حصہ جسپر نشان بنایا گیا تھا اندر کی جانب گر گیا اور اس خوبی کے ساتھ کہ اسکے گرنے کی آواز خود لالتا پرشاد تک کو نہ سُنائی دی۔ اس نے اب باسانی ہاتھ ڈالکر چٹخنی کھولدی۔ کھڑکی کے اندر قدم رکھکر وہ اندر جانے کو تیار ہی تھا کہ دفعتہً کچھ یاد آگیا۔ اور اُلٹے پیروں باغیچہ میں جا کر چونے کے انبار پر چڑھ گیا۔ قصداً اس کو خوب سارونڈنے اور جوتوں کے تلے میں سانئے کے بعد واپس آکر کھڑکی سے کمرہ کے اندر پہونچ گیا۔

وہ بڑھکر بدنصیب مقتول کے سامنے آیا ——— پیچھے ہٹا ——— پھر آگے بڑھا ——— اور اپنے دماغ پر زور دیکر قدموں کو ہر اس انداز اور پہلو سے حرکت دی جو اس کی یاد میں حملہ کرتے وقت واقع ہوئی یا ہونا ممکن تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کشتم کشتا میں پہاڑی مینا کے پنجرے کو ٹھوکر لگنے کی وجہ سے اسکے کھانے کے مٹر اور چنے فرش پر بکھر گئے تھے۔ اپنے جوتوں سے اس نے ان کو بھی خوب سارونڈا۔ کچلا۔ مقصد یہ تھا کہ پولیس کے لئے ہر ممکن صورت فریب اور شبہ کی پیدا کر دے۔ مختلف میزوں کے خانے کھولے ——— بند کئے ——— کچھ کھُلے چھوڑ دئے ——— کرسیوں کے گدّے ——— کچھ ادھر، کچھ ادھر بکھیر دئے۔ مختصر یہ کہ کمرہ کے جملہ سامان میں ایک بے ترتیبی کا عالم پیدا کر دیا ——— اس نے اپنی آخری تدبیر کے سلسلہ میں یہ کیا کہ کمرہ کے صدر دروازہ میں چابی لگا دی تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ کمرہ اندر سے مقفل ہے۔

وہ کھڑکی کے راستے سے باہر واپس آیا۔ باغیچہ کے مال گودام گیا۔ وہاں اپنے جوتے تبدیل کئے اور مال خانہ کے راستہ سے مکان میں داخل ہو گیا۔ اس نے ہر پہلو پر غائر نظر ڈال کر اطمینان کر لیا کہ ہر شے اور ہر کام کے معمول میں بظاہر کوئی فرق پیدا ہونے نہ پایا تھا۔ اس نے یہ بھی احتیاط کے ساتھ غور کر لیا کہ مال خانہ کی ہر چیز اسی طرح آج بھی چھوڑی گئی جس طرح ہمیشہ وہ اپنے کاموں سے فراغت پاکر چھوڑنے کا عادی تھا۔ اس نے پہلو کا دروازہ کھُلا چھوڑ دیا تاکہ حسب عادت دیگر ملازمین کو اندر جانے میں نہ تو کوئی نئی بات محسوس ہو۔ اور نہ کوئی تکلیف ہی۔ سونے کے لئے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے لیمپ بھی گل کر دیا۔ گویا اسطرح چارا لگا کر اس نے جال بچھا دیا ——— اب فقط شکار پھنسنے کی دیر تھی۔

اس کو اطمینان تھا کہ بظاہر کوئی صورت ایسی باقی نہ چھوڑی گئی تھی کہ اسپر ذرا بھی شبہ کیا جا سکے۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور انہی خیالات سے ہم آغوش بستر پر لیٹ کر نیند کا انتظار کرنے لگا ——— لیکن نیند کہاں؟ اسکو وہ عارضی سکون بھی نصیب نہ تھا جو نیند سے پہلے دماغ اور دیگر اعضا پر طاری و ساری ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ ہر آواز اور آہٹ پر کان لگائے ہوئے۔ اندھیرے میں غیر اطمینانی تنفس کے ساتھ اس نے کروٹ لی تو ہار کے بڑے بڑے موتی اس کے سینے میں چُبھ گئے۔ اپنے قبضۂ قدرت میں اس "دولت" کے دل خوش احساس نے دماغی کوفت کو ایک ساعت کیلئے برطرف ہی نہیں بلکہ اس کو ایک ایسے عالم انبساط میں پہنچا دیا جہاں اسکو اپنے قرض کی ادائیگی سے سبکدوشی اور آئندہ زندگی میں فراغت پانے اور اطمینان نصیب ہونے کا خواب نظر آیا۔ اس نے طے کیا کہ وہ ایک ایک کر کے سارے موتی فروخت کر دے گا جس سے قرض کی ادائیگی کے بعد بھی اسکے پاس کافی رقم بچ رہے گی۔ اس کام کے لئے اس نے سوچ لیا کہ کشمیر، حیدر آباد، میسور کی بڑی بڑی ریاستیں اور وہاں کے شوقین منچلے رئیس موزوں اور مناسب ہونگے اور ممکن ہے انہی ریاستوں میں سے کسی نہ کسی میں اس کی آئندہ ملازمت کا ٹھکانا بھی ہو جائے۔ اس جرم کا سارا الزام مالی کے سر عائد ہونے کے بعد اس کی شخصیت پاک اور صاف تو ہو ہی جائیگی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مالی اپنی بریت اور بے قصور ہونے کا کیا ثبوت بہم پہونچاتا ہے۔

رات کی طوالت، عاشقوں کی شب فرقت، سے بھی کچھ زیادہ ثابت ہوئی لیکن خود صبح کو ساتھ [illegible] واقعات سے دوبدو ہونے کے لئے وہ بھی تیار ہو بیٹھا۔ حسب معمول اشنان سے فراغت حاصل کی اور جب کوٹھی کیطرف

لا تو راستہ میں خادمہ کشتی میں چائے کا سامان لاتی ہوئی ملی۔ ادھر لالتا پرشاد
سب معمول مال خانہ میں اپنے کارِ منصبی انجام دینے میں مصروف ہوگیا۔ ادھر خادمہ
ورچیخانہ میں چائے کی تیاری میں مشغول۔ لیکن ان مشاغل کو زیادہ دیر نہ گذری تھی
کہ خادمہ گھبرائی بولائی ہوئی مالخانہ میں داخل ہوئی اور لالتا پرشاد کے قریب ہوکر
بی آواز سے بولی "لالہ جی! راجکماری اپنی خوابگاہ میں نہیں —— معلوم
ہوتا ہے کہ رات بھر مسہری خالی پڑی رہی۔ بستر پر شکن تک نہیں آئی میں نے
بڑے کمرے کا دروازہ بھی دیکھنا چاہا لیکن وہ اندر سے بند ہے۔ مجھے تو کچھ دال میں
کالا معلوم ہوتا ہے۔ آپ چلئے۔ چل کر دیکھئے تو۔"

حالانکہ لالتا پرشاد اس خبر وحشت اثر کو سننے کے لئے گذشتہ شب کے
اولین حصہ سے تیار اور مستعد تھا لیکن بناوٹی حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے
دفعۃً اٹھ بیٹھا اور گرتا پڑتا خادمہ کے ساتھ خاص کمرے کے دروازے کیطرف
چلا۔ دروازہ بمشکل تمام کھلا۔ اندر ان لوگوں نے راجکماری کو کرسی پر مردہ پایا —
اب کیا تھا۔ ایک کہرام مچگیا۔ تو چل۔ میں چل۔ دم زدن میں نوکر چاکر سب جمع
ہوگئے۔ لالتا پرشاد نے سب کو معاملہ کی اہمیت کا احساس کرایا اور پھر سب کو باہر
نکالکر کمرہ مقفل کردیا۔ اسکے بعد فوراً ٹیلیفون پر ڈاکٹر اور پولیس کو اطلاع دی۔
ڈاکٹر کے چند لمحہ بعد پولیس بھی آپہونچی جو ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔
لالتا پرشاد نے سکونِ قلب اور نہایت مستعدی کے ساتھ پولیس والوں کو تحقیقات
میں ہر ممکن مدد دی۔ ڈاکٹر کو اپنا فیصلہ سنانے میں چنداں دیر نہ لگی۔ پولیس والوں نے
کھڑکی۔ اسکے ٹوٹے ہوئے شیشے اور کھرے وغیرہ کا بغور معائنہ کیا۔ قالین پر نقوش
قدم بھی دیکھے۔ اور کھڑکی دانوں سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کا سلسلہ باغیچہ
کے مال گودام تک دیکھ لیا۔ مال گودام میں مالی کا جوتہ اور اس کے تلے میں مٹر
اور چنے کے دانوں کا پسکر چپک جانا بھی دریافت کرلیا۔ ان کی تحقیقات کے نتائج
ظاہر تھے۔ یعنی قتل — اور استحصال بالجبر —— ہار کی گم شدگی آخر الذکر الزام
کی دلیل تھی اور راجکماری کی نعش اول الذکر کا ثبوت۔

سب انسپکٹر پولیس نے باغبان کے متعلق مختلف سوالات کرنے کے بعد معلوم
کیا کہ ریاست کا ملازم ضرور تھا لیکن راجکماری کے باغیچہ کی دیکھ بھال کے لئے ہمیشہ
دوسرے دن یہاں آتا تھا۔ چنانچہ کل اس کی غیر حاضری کا دن تھا۔ اس کی ملازمت کو
ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ روزانہ صبح کے وقت سات اور آٹھ کے درمیان کام
پر آنا اس کا معمول تھا۔ لالتا پرشاد نے اسکے مکان کا پتہ وغیرہ پولیس کو اچھی طرح
سمجھا دیا۔ ڈاکٹر اور انسپکٹر میں کچھ دیر مشورہ ہونے کے بعد طے پایا کہ راجکماری کی
نعش ان کی خوابگاہ میں اسوقت تک محفوظ رکھی جائے کہ تفتیش معاملہ اور
تحقیقات حادثہ مکمل ہوجائے۔ ڈاکٹر [illegible] انسپکٹر ایک سپاہی
کو ہمراہ لیکر روانہ ہوگیا۔ اور اپنے ساتھ اس خاص اہمیت رکھنے والے جوتے کو بھی

لیتا گیا۔ دوسرے سپاہی نے جو موقعہ پر تعینات رہا یہ بتا دینے میں ذرا تامل نہ کیا کہ
"داروغہ جی اور کہاں جاتے مالی کو گرفتار کرنے گئے ہیں"

دورانِ تحقیقات لالتا پرشاد نے نہایت متانت اور سنجیدگی کا بالقصد
اور بالجبر اظہار کیا۔ موقعہ پاکر اس نے ہار جیب سے نکال کر اپنے بکس میں رکھدیا اور
اس ارادے کے ساتھ کہ ان جھگڑوں سے فرصت پاکر اس کا پہلا کام اسکے ایک دو
موتیوں کو فروخت کرنا ہوگا۔ اطمینان یہ بھی تھا کہ مالی کی گرفتاری کے بعد اسکو سکونِ
قلب اور آزادی حاصل ہونا اس کا قانونی حق ہوگا۔ وہ دیر تک سپاہی سے بیٹھا باتیں
کرتا رہا۔ "کیوں صاحب! اب اور کیا کارروائی ہوگی؟"

"کچھ نہیں۔ بس اب تو قانونی خانہ پُری کرنا ہے۔ داروغہ جی آئینگے
اور آپ کا بیان قلم بند کرکے تفتیش مکمل کردینگے۔ پھر مقدمہ کے دن شہادت کے لئے
آپ لوگوں کو عدالت جانا ہوگا۔

اتنے میں راجکماری کے کمرہ سے چڑیوں کے چہکنے کی صدا بلند ہوئی۔
لالتا پرشاد نے اسطرف انگلی اٹھاکر اشارہ کرتے ہوئے کہا "آج بیچاری یہ
چڑیاں بھی پریشان ہیں اور صبح کے دانہ پانی سے بھی محروم۔"

"صبح کا ناشتہ تو سب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو بھوک تو
مجھے بھی معلوم ہورہی ہے۔"

لالتا پرشاد نے اشارہ پاکر فوراً کانسٹبل کے لئے صرف ناشتہ کا نہیں بلکہ
پیٹ بھر دینے کا انتظام کردیا۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اس کا سا موقع شناس ایسی
حالت میں کانسٹبل کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے چوک جاتا"

کچھ دیر بعد سب انسپکٹر چند اور سپاہیوں کو ساتھ لیکر واپس آگیا۔ اس نے
بڑھکر نشست گاہ کا دروازہ کھولا۔ جس کی آہٹ پاکر چڑیوں نے ایک شور برپا کردیا
وہ کمرے کے اندر گیا۔ اور ادھر ادھر نظریں ڈالکر بولا "کیا کوئی یہاں آیا تھا۔؟"

کانسٹبل نے آگے بڑھکر جواب دیا۔ "نہیں حضور کوئی نہیں آیا"

لالتا پرشاد نے کمرہ کے اندر جھانک کر سب انسپکٹر کے سوال کی وجہ فوراً
معلوم کرلی۔ ایک پہاڑی مینا پنجرے سے نکل کر فرش پر پڑے ہوئے دانے چن رہی تھی
اس نے وہیں سے کہا۔ "حضور عالی یہ کوئی خاص بات نہیں۔ ان جانوروں کی عادت
ہے کہ اکثر اپنے پنجرے کی کھڑکی چونچ سے کھولکر باہر نکل آتے ہیں۔ کوئی ہرج نہ ہو
تو میں اسکو پنجرے میں بند کردوں اور سب کو دانہ پانی بھی دیدوں۔ میں ابھی ان سے
دریافت کررہا تھا کہ اگر اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی ہو تو کمرہ کی صفائی کرکے ہر
چیز ترتیب سے رکھدوں۔

سب انسپکٹر نے جواب دیا "اچھا تم جانوروں کو دانہ پانی دے سکتے ہو۔"
وہ خود کمرے کے وسط میں کھڑا ہوگیا۔ لالتا پرشاد دوڑ کر ایک جگ میں
پانی اور دوسرے برتن میں دانہ وغیرہ لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے پہاڑی میناؤں کے

پنجرے کے غلاف اتار کر ان کو حسب ضرورت دانہ پانی دیا۔ اسکے بعد طوطی اور قمریوں وغیرہ کو سب کے بعد طوطوں کا نمبر آیا۔ آخری پنجرے کا غلاف اُتارنے پر ایک چمکدار سبز پروں کا طوطا دکھائی دیا۔ جس نے روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ اپنی سُرخ چونچ کو پنجرے کی تیلیوں سے رگڑنے اور خونِ کبوتر کی طرح سُرخ سُرخ آنکھوں کو حرکت دینے کے بعد بھیانک آواز سے چیخ کر کہا:۔

" للتو۔ کمبخت ــ میرا دم گھٹا جا رہا ہے ــ ارے دوڑیو ــ ــ قتل ــ مدد"

یہ برق صفت الفاظ کچھ ایسے صاف لہجے اور صحت الفاظی کے ساتھ ادا کئے گئے کہ حاضرین کو سُننے اور سمجھنے میں ذرا تکلف نہ ہوا۔ لیکن للتا پرشاد پر دفعتہً بجلی سی گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے پانی کا جگ چھوٹ گیا۔ دانہ برتن سے اچھل کر ہر طرف بکھر گیا۔ اب اس کو نہ وہ سکون حاصل تھا نہ حاضر دماغی۔ وہ خوف سے بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد پنجرے سے پھر آواز آئی۔

" للتو۔ کمبخت ــ دوڑیو ــ قتل ــ مدد"

اور اسکے بعد طوطے نے ان الفاظ کی دُھن باندھ دی۔ لالتا پرشاد نے اپنی اسی حالتِ پراگندگی اور مفلوج العقلی میں ایک انسانی آواز بھی سُنی، جو مشتمل تھی ان روح فرسا الفاظ پر۔ " گرفتار کر لو اس نمکحرام کو" لالتا پرشاد کے حواس کو ایک اور زبردست دھکا لگا۔ جب اس نے اپنے شانے پر کسی مضبوط ہاتھ کی گرفت کا احساس کیا۔ اس کی مایوس نظریں اپنے سامنے والے سپاہیوں کی آنکھوں سے وجہ مخاصمت دریافت کرنے لگیں اور اس کی زبان سے جو جملہ نکل سکا وہ یہ تھا " تم مجھے ناحق کیوں گرفتار کرتے ہو۔ تم نے تو خود کہا تھا کہ مجرم تو مالی ہے" انسپکٹر نے لالتا پرشاد کے جرم آلود چہرہ پر نگاہیں جما کر کہا۔

" یہ بھی تو تمھاری خام خیالی تھی۔ شب گذشتہ میں ان جوتوں کا استعمال مالی کے لئے ناممکن تھا۔ وہ دو دن سے ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ میں ابھی اس کی حالت دیکھ کر آرہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اصلی مجرم کا سراغ مل گیا۔ اب ثبوت کی تکمیل کے لئے میں تمھاری اور تمھارے مال و اسباب کی تلاشی لیتا ہوں"

آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اندر لالتا پرشاد کے صندوق سے ست لڑا ہار برآمد کر کے سر دست اس " نمکحرام قاتل" کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

غزل

از جناب قابیدار بخت صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل پرنسپل دار العلوم السنۃ الشرقیہ لاہور

لے اُڑی مجھکو گردشِ ایّام
عرش پر گونجتا ہے میرا نام

ہوش ہے ہجر و وصل کا جسکو
ایسے عاشق کا عشق بھی ہی خام

کانپتا ہے لرز رہا ہے دل!
تو نے مطرب لیا ہے کس کا نام

تو اگر اپنے آپ کو پالے؟
عرش سے بھی پرے ہو تیرا مقام

چند قطرے ادھر بھی اے ساقی
سن کے آئے ہیں تیرا فیضِ عام

عشق کا راز بھی نہ جو سمجھے!
ایسی دُنیا کو دُور ہی سے سلام

ہمکو رُسوا کیا زمانے میں
جان دینے کا مل گیا انعام

عشق میں کارگر نہیں ہوتی
میری تدبیر ہو چکی ناکام

توڑ کے پاؤں بیٹھا ہے بیدار
شکریہ تیرا گردشِ ایام

سلطان اورخان اور تھیوڈورا کی داستانِ معاشقہ

تاریخ ترکیہ کا ایک دلچسپ رومان

سالنامہ مشہو کیلئے

از جناب محمد حفیظ صاحب صابر نور محلوی

سنہ ۱۳۲۷ء شباب پر تھا۔ سلطان اورخاں ، ترکان آلِ عثمان کا دوسرا تاجدار سیر و شکار کی نیت سے بروصہ سے جانب شمال ترکی سرحد کے قریب خیمہ زن تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ روز بادل گھر گھر کر آتے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی سی بارش بھی ہوجاتی تھی۔ اس دن مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے شکاری مہم روانہ نہ ہوسکی۔ اور سلطان جی بہلانے کی نیت سے تن تنہا اپنے سیاہ عربی گھوڑے پر سوار ہوکر خیمہ گاہ سے نکل پڑا۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر ہلکے فاختئی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ سامنے حدِ نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو سے کہسار کی فضا مہک رہی تھی۔ سلطان مناظر کی دلچسپی میں کچھ اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اسے خیال ہی نہ رہا۔ کہ وہ خیمہ گاہ سے دُور نکل آیا ہے۔ سورج آہستہ آہستہ دُور پہاڑیوں کے پیچھے مجلہ مغرب میں اُترا جا رہا تھا۔ شام کی تاریکی بڑھ رہی تھی وہ لوٹنے ہی والا تھا۔ کہ پیچھے سے گھوڑے کی زوردار ٹاپ سُنائی دی۔

سلطان کو خیال گذرا ، کہ کوئی دشمن ہے۔ کیونکہ مسیحی حکمرانوں کی نگاہ میں سلاطین ترکیہ کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ پھر وہ یونانی سرحد کے قریب تھا۔ اسلئے اس نے تلوار سنبھالی۔ اور ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا آواز اب صاف سُنائی دے رہی تھی۔ مگر گھنے درختوں کی وجہ سے ابھی تک آنیوالا نظر نہ آیا تھا۔ یکایک آواز دوسری طرف گھوم گئی۔ اور بیشتر اسکے کہ سُلطان کچھ اندازہ کرسکتا۔ اسکے کانوں میں ایک نسوانی آواز آئی۔ جس سے خوف و دہشت کا اظہار ہوتا تھا۔ اب کمینگاہ میں چھپے رہنا خلاف مصلحت تھا۔ اس نے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ اور کھلے میدان میں آگیا۔ اس نے سامنے پہاڑ کے دامن میں ایک مُنہ زور گھوڑے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اسپر زرنگار زنانہ لباس میں ملبوس کوئی حسینہ سوار تھی اسکے پریشان بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اور وہ گھوڑے کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ سلطان دیکھتے ہی سمجھ گیا۔ کہ گھوڑا بے قابو ہوکر بھاگ رہا ہے۔ اور کوئی دقت جاتا ہے۔ کہ اس کا حسین سوار کسی گہرے کھڈ میں گر کر ہمیشہ کیلئے ختم ہوجائے۔ سلطان نے اپنا گھوڑا اس گھوڑے کے پیچھے ڈالدیا۔ پہلا گھوڑا اسی رفتار کے ساتھ جھاڑیوں کو پھاندتا ہوا سرپٹ اُڑا چلا جا رہا تھا۔ سلطان نے اسکی رفتار کا اندازہ کیا۔ اور پھر سیدھی سڑک چھوڑ کر کھیتوں سے ہوتا ہوا اسکی طرف بڑھا۔ چند منٹ کی تگ و دو کے بعد آخر اسکے قریب جا پہنچا۔ اور جھک کر کمال صفائی سے اس گھوڑے کی باگ تھام لی۔ گھوڑے کے یکایک رُک جانے کی وجہ سے حسینہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گر پڑی۔ سلطان نے دونوں گھوڑوں کو ایک جھاڑی میں باندھ دیا۔ اور بھاگتا ہوا حسینہ کی طرف بڑھا۔ اور یہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ کہ وہ بیہوش ہوچکی تھی۔ اس نے فوراً اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

کافی دیر کے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور خلاف توقع اپنے قریب ایک وجیہ صورت ، دراز قد اور شکیل و سجیلے نوجوان کو دیکھا۔ تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور حیرت بھری نگاہوں سے اسکے دلکش خد و خال اور بیش قیمت شکاری لباس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے دربار میں ایک سے ایک حسین و شجاع مرد دیکھے تھے۔ مگر اس نوجوان کے خد و خال میں کچھ ایسی دلکشی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی مسحور کردینے والی کشش تھی۔ کہ باوجود کوشش کے وہ اس کیطرف دیکھتے رہنے سے باز نہ رہ سکی۔ سلطان جو ابھی تک اسکے زرنگار لباس کو دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی طرف آنکھیں چُرا چُرا کر دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے بائیس تیئیس سالہ ایک پیکر جمیل تھا۔ اس کی نیلمیں شعلہ کی طرح چمکدار آنکھیں جن میں متانت و حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کتابی چہرہ۔ گھنی بھنویں۔ دراز پلکیں۔ لمبے لمبے بال۔ سُرخ پتلے ہونٹ۔ اعضاء کا دلفریب تناسب اور اس پر چُست نیلے رنگ کا مخملین شکاری لباس عجیب ہی بہار دکھا رہا تھا۔ پھر اسکے دیکھنے کا انداز اتنا دلنشین اور روح نواز تھا۔ کہ سلطان کو اپنے دل میں بے اختیار گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ وہ نحیف سی آواز میں بولی۔ "میں کہاں ہوں ! اور آپ۔ ۔ ۔ ۔ "

"آپ اسوقت ڈیموٹکا سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ترکی سرحد کے قریب ہیں۔ اور میں دولت ترکیہ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میں آپ سے آپ کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

وہ مسکرائی "میں شاہ یونان کنٹیکٹ کوزین کی اکلوتی بیٹی تھیوڈورا ہوں"

سلطان کے مُنہ سے بے اختیار کلمہ حیرت نکل گیا۔ "اچھا تو آپ ہی مہ جبین تھیوڈورا ہیں۔ میں نے آپکے بارے میں اس سے پہلے بھی بہت کچھ

...ر رکھا ہے "

" آپ نے میرے بارے میں کیا کچھ سُن رکھا ہے "؟ وہ مصنوعی حیرت کے ...نہ بولی۔

سُلطان اس سوال سے گھبرا سا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا " آپ کے حسن وجمال اور خاصکر شہسواری کے کارنامے تمام ترکی میں مشہور ہیں۔ اور میں ایک عرصے سے آپ کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" ایک سپاہی کو اپنے دل میں ایک شہزادی کے دیکھنے کی تمنا رکھنا، کچھ دل لگتی بات نہیں معلوم ہوتی! "

" محترم شاہزادی! اسے آپ بعید از اخلاق سمجھتی ہیں تو سمجھیں مگر میں نے جو میرے دل میں تھا عرض کر دیا " سلطان نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

" معاف کیجئے گا! معمولی سپاہی اس قسم کی تمناؤں کو اپنے دل میں پرورش نہیں کیا کرتے!! "

" اس سے آپ کا مطلب ؟ " سلطان گھبرا کر بولا۔

وہ ایک مسحور کن مُسکراہٹ کے ساتھ بولی " مطلب یہ کہ آپ معمولی سپاہی نہیں ہیں "

" تو پھر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" خاندان شاہی کے کوئی معزز فرد۔ ۔ ۔ ۔ یا پھر خود سلطان اور خان۔ ۔ ۔ "

اب سلطان کچھ زیادہ کہہ نہ سکا۔ اس کا راز طشت از بام ہو چکا تھا اس نے بالآخر اپنا سلطان اور خاں ہونا قبول کر لیا۔

دونوں کتنی ہی دیر تک آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے کون جانتا تھا۔ کہ کیوپڈ نے دو دلوں کو ایک ہی تیر سے زخمی کر دیا ہے۔ دونوں پہلی ہی نظر میں نقد دل ہار بیٹھے تھے۔ مگر انجام کے خیال سے دونوں فکرمند تھے۔ شریعت اسلام نے اہل کتاب سے نکاح جائز قرار دیا تھا۔ مگر مسیحی دنیا اس رشتے کو کب آسانی سے قبول کر سکتی تھی۔ یہ خیال دونوں کو بے چین کر رہا تھا۔

سلطان کافی دُور تک اس حسینہ کو پہونچانے کے لئے گیا۔ جب دونوں علیحدہ ہوئے۔ تو کتنی دیر تک سلطان حسرت بھری نگاہوں سے کھڑا دیکھتا رہا۔ اور تھوڑی دور ابھی بار بار لوٹ کر اسے دیکھتی جاتی تھی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

ان دنوں بلغاروی درندوں نے اردگرد کے علاقوں پر یورشیں کر کر کے اپنی دھاک جما رکھی تھی۔ کمزور حکومتیں ان کے دستِ ظلم سے نالاں تھیں۔ مگر کسی میں طاقت نہ تھی۔ کہ ان کا مقابلہ کر سکتا۔ یونانی سلطنت جس کا دار الخلافہ ان دنوں قسطنطنیہ تھا۔ خاصکر ان کے تاخت وتاراج کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ پھر خود یونان میں بھی بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ان [illegible] کے لئے مسیحی حکومتوں کو بلاتے تھے۔ مگر کوئی ان برگشتہ بخت اور تباہ حالوں کی فریاد نہ سنتا تھا۔

ترکوں نے جو یورپی لٹیروں کی ستم رانی دیکھی۔ تو اپنی بحری قوت کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اور ارادہ کر لیا۔ کہ ان وحشی درندوں کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر کے چھوڑینگے۔ کیونکہ انھیں خود ان کی دستبرد سے خوف تھا۔ کہ کل کو کبھی ترکی پر چڑھ دوڑیں۔ وہ ابھی جزائر یونان اور بلاد یورپ پر حملہ کی تیاریاں ہی کر رہے تھے۔ کہ کنیٹ کوزین نے جو سلطنتِ یونان کا حکمراں تھا۔ مسیحی حکومتوں سے امداد نہ ملنے پر بلغاروی درندوں کے خلاف ترکوں سے امداد کا خواہاں ہوا۔ ترک اس نادر موقع کو کب چھوڑنے والے تھے۔ بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے امداد دی گئی۔ چند ہی روز بعد ایک تجربہ کار ترک جرنیل کے ماتحت ایک نبرد آزما لشکر جہاز پر سوار کر کے اس کی مدد کے لئے روانہ کیا گیا۔ ساحل بلقان پر جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی ترک جرنیل تھوڑے سے منتخب جوانمردوں کو ساتھ لیکر ڈیموٹکا کی طرف بڑھا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب جاسوسوں نے یہ خبر دی کہ کنیٹ کوزین بلغاریوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سرویا کی طرف بھاگ گیا ہے اور اس کی بیوی آرینا شہر کے اندر محصور ہے۔ اور بلغاری محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔

ترکی جرنیل یہ سُنکر بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے اسی وقت کوچ کا حکم دیا۔ اور اگلی صبح تاریخ یونان کا وہ یادگار معرکہ کارزار گرم ہوا۔ جس نے بلغاریوں کے ساتھ ساتھ تمام یورپی حکومتوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ ترکی بہادروں نے ایسی جوانمردی کے ساتھ بلغاری شیروں کا مقابلہ کیا۔ کہ تاریخ یونان اس قسم کی لڑائی کا واقعہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بلغاری ان دنوں کسی کو بھی اپنا مدِمقابل نہ سمجھتے تھے۔ مگر ترکوں سے مقابلہ ہوتے ہی انھیں یقین ہو گیا۔ کہ ان جوانمردوں سے نبرد آزمائی ہنسی کھیل نہیں۔ اور شام ہونے سے پہلے ہی لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ ہزیمت خوردہ بلغاروی فوجیں اس بدحواسی کے ساتھ میدانِ جنگ سے بھاگی ہیں۔ کہ پیچھے لوٹ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ کی۔ ترکوں نے کافی دُور تک انکا تعاقب کر کے انھیں چُن چُن کر قتل کیا۔ اس لڑائی میں ترکوں کو ہزاروں قیدی اور کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔

اظہار شکریہ کے طور پر ملکہ آرینا نے ترکی جرنیل اور سردارانِ عساکر ترک کو اپنے خاص محل میں دعوت دی۔ اور ان کی خاطر و تواضع کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر سامان کئے۔ مگر ترکی جرنیل نے محل میں جانے سے اس بنا پر انکار کر دیا۔ کہ چونکہ اس کا برگشتہ بخت میزبان اسوقت خانماں بربادی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور شہر میں موجود نہیں ہے۔ اسلئے وہ آنے سے معذور ہے۔ یہ شاندار جواب تہذیب یورپ کے لئے بالکل نیا تھا۔ وہ نہیں سمجھتے تھے۔ کہ اسلام کے پیرو اتنے مہذب اور اتنے بلند کیرکٹر [illegible] کنیٹ کوزین کی بہت تلاش

دستجو کی۔ مگر جب اس کا پتہ نہ ملا۔ تو ملکہ آرینا کی دعوت قبول کئے بغیر واپس آگیا۔

ترکوں کی اس طرح بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر پوپ اعظم اور دیگر مسیحی حکمرانوں کے سینے پر سانپ سا لوٹ گیا۔ اور انھوں نے اس خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مگر ہر مرتبہ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ ترکان احرار کا مقابلہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

ادھر ترکوں نے سلطان اورخان کے مشورے سے شاہ یونان کینٹ کوزین کو اسکی بیٹی کے لئے پیغام دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ وعدہ کیا۔ کہ اگر وہ یہ رشتہ کرنا منظور کریں۔ تو ترک ہمیشہ اس کی پشت پناہی کے لئے تیار رہینگے۔

اس حیرت انگیز پیغام نے تمام مسیحی دنیا میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ تمام متعصب عیسائی برافروختہ نظر آتے تھے۔ مگر کلیسائے یونان نے اس قرابت میں اپنی سیاسی مصلحت دیکھی۔ اور اجازت دیدی قسطنطنیہ کے شاہی محل میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہر طرف ایک جشن عید بپا تھا۔

سلطان اورخان بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر خود برات کے ساتھ نہ گیا۔ بلکہ اپنے سفیر کے ہمراہ بہت سے معزز سرداران ترک کو تیس جہازوں پر سوار کر کے سیبریا بھیجا۔ ادھر سے شاہ کینٹ کوزین اپنے معزز درباریوں اور مہ جبین تھیوڈورا کے ساتھ وہاں آگیا۔ اور وہاں بڑے جاہ وجلال کے ساتھ تاریخ ترکی ویونان کی یہ قابل یادگار تقریب انجام پذیر ہوئی۔ شاہ یونان اپنے معزز مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ایک گرجے میں رسم نکاح کی ادائیگی کے بعد دلہن رخصت کر کے ترک سفیروں کے سپرد کر دی گئی۔ سلطان نے صرف اس بات کا اقرار کیا تھا۔ کہ دولہن کو تبدیل مذہب پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ اسکے علاوہ کسی مسیحی رسم کو قبول نہ کیا تھا۔

جیسے ہی دلہن کی سواری بروصہ پہنچی۔ اورخان اپنے معزز ارکین دولت اور خاندان شاہی کے افراد کے ساتھ شہر کے باہر دولہن کے استقبال کے لئے آیا۔ اور وہاں اسلامی طریقے پر دوبارہ نکاح ہوا۔

اس طرح اُس رومان انگیز ملاقات کا اختتام اس شاندار طریقہ پر ہوا۔ اور حرم سلطانی میں پہلی مسیحی ملکہ داخل ہوئی۔

دل کی پکار

(یا ایک مہجور محبت کی فریاد)

از جناب نبی احمد صاحب ترویدی

جب بزم حسن و عشق میں لایا گیا مجھے
دیکر مری نظر کو نوید نشاط نو
دل پر مرے محیط ہوئے جلوہ ہائے حسن
دل بستگیٔ روح کے ساماں کئے گئے
رگ رگ میں میری دوڑ گئی برق آرزو
لہرائی قلب و روح میں سرشاریوں کی موج
ہوتی رہیں نوازش پیہم کی بارشیں
اپنا بنا کے مجھکو کیا بے نیاز دہر
میں جب بھی اتفاق سے برہم ہوا کبھی
القصہ کی گئی مری اس درجہ دلدہی

اک دلنشیں سا گیت سُنایا گیا مجھے!!
پیغام التفات سُنایا گیا مجھے!
آئینۂ جمال دکھایا گیا مجھے!
اور اک ادائے نو سے لبھایا گیا مجھے
یُوں حامل شباب بنایا گیا مجھے
جام سرور بخش پلایا گیا مجھے
آغوش نازنیں میں سُلایا گیا مجھے
اک مرکز بلند یہ لایا گیا مجھے
اک دلنشیں ادا سے منایا گیا مجھے
تا حد ممکنات نوازا گیا مجھے!

لیکن نہ جانے ان کی نظر کیوں بدلگئی
شاکی ہوں میں تغافل بے انتہا کا آج
اب میں ہوں اور خلوت تاریک ہے مری

جب سر چڑھا لیا تو گرایا گیا مجھے
کیا جانے کیا سمجھ کے بھلایا گیا مجھے
دانستہ سوز غم میں جلایا گیا مجھے

بے مہر۔ لو تنہ اپنی ذرا غور تو کرو
وعدہ کیا تھا مجھ سے مسلسل نباہ کا
کرنا ہی تھا جو دل کو مرے پائمال ناز
ہوگا کرم کے بعد ستم بھی مرے لئے
دینا ہی تھا فریب اگر التفات کا
ہونا ہی تھا جو میری محبت سے بے نیاز
یہ انتہائے جبر نہیں ہے تو کیا ہے پھر

بے جرم و بے خطا ہی ستایا گیا مجھے
پھر کیوں خراب جور بنایا گیا مجھے
کیوں نغمۂ شباب سُنایا گیا مجھے
یہ راز کیوں نہ پہلے بتایا گیا مجھے
کیوں اپنے آستاں پہ بُلایا گیا مجھے
کیوں خواب آرزو سے جگایا گیا مجھے
ہنسنے نہ پایا تھا کہ رُلایا گیا مجھے

اے کاش آئے عہد گذشتہ کی تمکو یاد
ہے میری رُوح سوز محبت سے شعلہ ریز
میں ہو چکا ہوں جذب تمھارے جمال میں
اس سلسلے کو ختم کرو اور ابھی آجاؤ

دیکھو وہ خواب تم، جو دکھایا گیا مجھے
جل جاؤں گا جو اور جلایا گیا مجھے!
آتا نہیں یقیں کہ بھلایا گیا مجھے
سمجھوں گا میں کہ غم سے بچایا گیا مجھے

آؤ جو تم تو جاگ اُٹھے پھر مرا نصیب!
ہو پھر مجھے یقین کہ نوازا گیا مجھے!!



جوش نہیں تو کچھ بھی نہیں!
طاقت اور قوّت کی لاثانی دوا
جوش
بہترین دوا
طاقت حاصل کرنے کی لاثانی دوا
مشہور دواخانہ دہلی
JOSH
جوش
مشہور دواخانہ کی وہ پیٹنٹ دوا ہے جس نے دوبارہ جوش جوانی
پیدا کرکے ملک کے سُست اور ناکارہ لوگوں کو زندگی بخشی ہے اور وظیفہ
زوجیت عطا کرنیکے قابل بنا دیتا ہے۔ یہ دوا حلق سے اُترتے ہی تازہ
خون بنکر رگوں میں دوڑنے لگتی ہے۔ چہرہ پر شباب کھِلنے لگتا ہے
اعضائے رئیسہ دل۔ دماغ۔ جگر اسی دوا سے قوّت
حاصل کرتے ہیں معدہ قوتِ ہضم اسی دوا سے مستعار
لیتا ہے غرض قوتِ باہ کی یہ وہ اکمل دوا ہی جسکے
بعد کسی اور دوا کی ضرورت نہیں رہتی۔
تجربہ بہترین کسوٹی ہے
قیمت چوبیس ۲۴ گولی کا بکس تین روپیہ آٹھ آنہ
پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا
JOSH
منیجر مشہور دواخانہ دہلی
کامل آرٹسٹ

زخمِ دل!

از جناب کوثر صاحب چاندپوری

خاک پاک چاندپور مردم خیزی کے اعتبار سے لازوال شہرت کی مالک ہے بالخصوص شعر و ادب سے اسکو خاص نسبت ہے، اس سرزمین سے اکثر شاعر و ادیب پیدا ہوئے جن کی شہرت و ناموری کا سکہ بڑی عزت سے ادب کے بازاروں میں قبول کیا گیا اور اب تک چل رہا ہے۔ چنانچہ عصر حاضرہ میں ادبی حیثیت سے جو افتخار مولانا کوثر چاندپوری کو حاصل ہے۔ اسے اربابِ ادب اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی تصانیف کم و بیش پچاس کے قریب ہیں اور وہ مضامین علیحدہ ہیں جو مختلف رسائل میں۔ تاریخی۔ تنقیدی، اصلاحی، اور مزاحیہ رنگ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ سالنامہ مشہور کے لئے کوثر صاحب نے "زخم دل" ایک بہترین ادبی افسانہ ارسال فرمایا ہے اور مزاحیہ رنگ میں "دعوت" لاجواب مضمون ہے اُمید کہ قارئین ہر دو افسانوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونگے۔

ایڈیٹر

(✻)

— ۱ —

وہ بہت دیر سے بیہوش پڑا تھا، اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جس نے اسکی خوشنما اور کشادہ پیشانی کو چھپا رکھا تھا، تاہم صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ نہایت حسین نوجوان ہے۔ اس کے چہرہ پر شگفتگی کھیل رہی تھی۔ مگر رنگ میں سُرخی کی وہ جھلک باقی نہ تھی، جو خون کی فراوانی کے باعث تندرستی میں محسوس ہوا کرتی ہے، پھر بھی معصومیت اور نیک دلی کے تمام آثار نمایاں تھے، اس کے خوبصورت اور باریک ہونٹ جن پر سفید گلاب کے کھلے ہوئے پھول کی طرح تبسم لہریں لے رہا تھا، پیاسے مسافر کے ہونٹوں کی طرح خشک تھے، نرس اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی اور بار بار اس کے خاموش اور غیر متحرک لبوں میں اسے جنبش سی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو میں پانی پیونگا!

نرس چاہتی تھی وہ بول اُٹھے۔ اور جلد بول اُٹھے، کاش وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکے کہ اسے کیا تکلیف ہے، اسکے کہاں چوٹ لگی ہے، ممکن ہے ڈاکٹر نے اس کی چوٹ کے مقام کو اچھی طرح سمجھا نہ ہو۔ پٹی اس کے سر پر باندھی گئی ہے چوٹ ممکن ہے کہیں اور لگی ہو، مریض کی بیہوشی، مسلسل اور خطرناک بیہوشی سے نرس کو اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ دیر تک مریض کے سراپا کو دیکھتی تو آپ ہی آپ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں جنھیں وہ اپنی سفید اور شفاف دستی سے خشک کر لیتی۔

بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت پریشان ہوئی تو اُٹھکر کمرے میں ٹہلنے لگی اسکے دماغ میں مسلسل یہی خیال آتا کہ اسے اچھا ہو جانا چاہئے، یقیناً وہ اچھا ہو جائیگا شاید ڈاکٹر پوری توجہ سے کام نہیں لے رہا۔

نرس ڈاکٹر پر بے التفاتی کا الزام لگا کر کچھ تکلیف سی محسوس کرتی اسکی رائے میں ڈاکٹر کافی فرض شناس اور ہمدرد تھا۔ اب تک نرس کو ڈاکٹر کی ہمدردی اس کی ذہانت اور رحمدلی کا اعتراف رہا تھا لیکن آج وہ اسکے ان اوصاف کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، وہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹر کی انسانیت پر شبہ نہ کرے پھر بھی وہ ایسا کر رہی تھی، معلوم نہیں اسوقت کیوں وہ ڈاکٹر کی نیت پر شبہات کرنے پر مجبور تھی؟ کیا اسے مریض نوجوان سے محبت ہو گئی تھی؟

_____ مگر اتنی جلدی، اس میں شک نہیں کہ بجلی دفعتہً ہی گرا کرتی ہے، لیکن آثار بتا دیتے ہیں بجلی گرے گی اور کہاں گرے گی، یہاں تو یہ علامات بھی مفقود تھیں۔ ڈاکٹر اس کا دوست تھا وہ اس سے محبت کرتا تھا، نہایت خاموش اور گہری محبت، البتہ جب سے نرس کا یہ نیکدل ہمسایہ جو اسوقت موٹر کے حادثہ سے مضروب ہو کر ہسپتال میں زیر علاج تھا اس کے قریب آ گر رہا تھا وہ محسوس کر رہی تھی ڈاکٹر کے طرز عمل میں خفیف سا تغیر پیدا ہو گیا ہے، اور وہ نرس کو اس انداز سے دیکھ رہا ہے جیسے اس کے جسم میں کسی خطرناک، اور متعدی بیماری کے جراثیم داخل ہو گئے ہوں۔

نرس کو اپنے ہمسایہ سے ہمدردی تھی بہت زیادہ اور حد سے زیادہ ہمدردی، اسی لئے اس نے رات کی نگرانی کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے تھے، نرس ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتی تو مریض کی مسہری کے پاس آ کر اس کے مُنہ کیطرف جھک جاتی اور یہ سُننے کی کوشش کرتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، کچھ کہہ بھی رہا ہے یا خاموش ہے مریض کے دل کی ہلکی ہلکی دھڑکنیں، اور دھڑکنوں کی دھیمی دھیمی آوازیں اُسے کہتی ہوئی سُنائی دیتیں، تم میرے قریب ہی بیٹھی رہو! نہایت صاف طور پر

یہ الفاظ نرس کے کانوں میں پہونچے اور اتنے زور سے پہنچے کہ وہ چونک کر باہر کی طرف دیکھنے لگتی، کہیں ڈاکٹر تو نہیں سُن رہا۔

نرس رات بھر جاگتی رہی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے یہ نہ سمجھا کہ رات سونے کے لئے ہے یا پہلے کبھی وہ سوئی بھی ہے؟ صبح ہوتے ہوتے مریض نے کروٹ لینے کی کوشش کی۔ نرس جو اس کے ہر تغیر کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی بڑی احتیاط سے اسکے قریب آئی اور مریض کو کروٹ بدلنے میں اس نے بڑی جانسوزی کے ساتھ امداد دی۔

میں کب سے سو رہا ہوں؟ مریض نے کروٹ بدلتے ہی پوچھا۔

آپ اپنے معمولی وقت پر سوئے تھے، نرس نے کہا۔

معمولی وقت پر، اور میرا سر کیوں دکھ رہا ہے؟

آپنے تکیہ پر سر نہیں رکھا تھا اب میں نے تکیہ سر کے نیچے رکھدیا ہے لیجئے اب آرام سے سوئیے!

اور آپ یہاں کیوں آئی ہیں، آپ کو کس نے بُلایا تھا؟

میں آپ ہی آگئی تھی!

آپ تو ہسپتال کی نرس ہیں، کیا میں ہسپتال میں ہوں؟

جی ہاں، آپ زیادہ سوچنے کی کوشش نہ کیجئے، اطمینان رکھئے، آپ اپنی زندگی کے معمولات سے ذرا بھی الگ نہیں ہیں۔

نہیں، میں کافی الگ ہوں، ـــــ میں شیریں کا تعاقب کرتے کرتے اس سے بہت پیچھے رہ گیا۔ کاش میں اسے ڈھونڈھ لیتا۔

اچھا اب سوجائیے نا!

سوجاؤں، نہیں مجھے نیند نہیں آتی، آپ سوئیے!

آپ کے لئے نیند بہت ضروری ہے!

پھر کوئی سُلانے والی دوا پلادیجئے، ـــ ہاں سنئے اب مجھے شام کے واقعات یاد آرہے ہیں۔ افوہ! آپ تو مجھے ڈاکٹر کے ساتھ سیر کو جاتی ہوئی شہر کے باہر کسی مقام پر ملی تھیں اور وہیں غالباً مٹرک کے موٹر پر میری موٹر پل سے ٹکرا گئی تھی، کیا میری ہڈی ٹوٹ گئی۔؟

نہیں ہڈی بالکل نہیں ٹوٹی، آپ قطعی اچھے ہیں۔

نہیں اچھا نہیں ہوں، میرا دل گھبرا رہا ہے، ـــــ مجھے ابتک اپنا کام کر لینا چاہئے تھا، آنسوؤں کے موٹے موٹے اور گرم گرم قطرے اسکے رخساروں پر بہنے لگے۔ نرس نے جلدی سے دستی نکالکر آنسو پونچھتے ہوئے کہا، گھبرائیے نہیں!

میں نہیں گھبراتا، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ اسوقت مجھے دنیا گردش کرتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے، ساری دُنیا میری آنکھوں کے سامنے [illegible] دل کو مضبوط رکھئیے! نرس نے کانپتی ہوئی غمناک آواز میں کہا اور

میرا دل ہی بہت کمزور ہے!۔

یہ کہکر وہ پھر بیہوش ہوگیا، نرس نے دوڑکر ڈاکٹر کو اطلاع کی۔ ڈاکٹر سورہا تھا، نرس نے اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہا

ڈاکٹر، ڈاکٹر، جلدی اُٹھئے!

کیا ہے، مس روز؟

آپ کے مریض کی حالت بہت خراب ہے، جلدی چلکر اسے دیکھئے!

کیا ڈیوٹی پر کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟

ہے، مگر میں چاہتی ہوں آپ ہی تکلیف کریں،

آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں مس روز، یہ میرے آرام کا وقت ہے!

آپنے مریض کا آپریشن کیا ہے آپ ہی اسکی تکلیف کو اچھی طرح سمجھ سکینگے!

مس روز! ہر ڈاکٹر مریض کی تکلیف کو اچھی طرح سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے

میری رائے میں آپ میں یہ اہلیت زیادہ ہے۔

لیکن میرے خیال میں آپ کو کسی ایک مریض سے اتنی زیادہ دلچسپی ہونی چاہئیے کہ آپ نرس کی حیثیت چھوڑکر مریض کے بے وقوف رشتہ داروں کی حیثیت میں آجائیں۔

ڈاکٹر! یہ دلچسپی اختیاری نہیں قدرتی ہے۔

بجا ہے، گویا اختیاری ہوتی تو مجھ سے ہوتی؟

اچھا چلئے یہ وقت باتوں کا نہیں ہے!

اور میری فیس کون دیگا؟

میں، ڈاکٹر تم مطمئن رہو، میں تمھاری پوری فیس ادا کرونگی!

لیکن کبھی کبھی میری فیس بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

پھر بھی ادا کر سکنے کی حد سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

۲

مسٹر کاؤس نئے نئے شہر میں وارد ہوئے تھے اور ایسے حصہ میں انھوں نے رہنا پسند کیا تھا جو ہسپتال سے بہت قریب تھا اکثر نرسیں جن کے رہنے کو سرکاری مکانات نہ تھے قریب کے مکانات میں کرایہ دیکر رہا کرتی تھیں، مس روز، کاؤس جی سے ملے ہوئے ایک دوسرے مکان میں رہتی تھیں۔ اور اکثر آتے جاتے وہ اسے دیکھا کرتے تھے۔ مس روز غالباً اتنی ہی حسین تھی جتنے خود کاؤس جی تھے۔ روز کے یہاں آنے والی نرسیں جو کسی وقت دل بہلانے کی غرض سے روز کے گھر آجاتی تھیں۔ کاؤس جی کی ہمسائگی اور ان کے حسن و شباب پر تبصرے کرنے لگی تھیں، کوئی کہتی کاؤس جی، اور روز ایک ہی مصور کی بنائی ہوئی دو تصویریں ہیں، مصور نے ایک کو دیکھکر دوسری تصویر بنائی ہے [illegible] کہتی مس روز! تمھیں ـــ کاؤس جی سے بہتر ہمسایہ نہیں مل سکتا۔ یہ مکان بہت سازگار معلوم ہوتا ہے اسے کہہ

ٹیلیفون ۴۵۵۵

تار کا پتہ: "کلوریم" لاہور



پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ



سوائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں کو شفا دینے کے لئے اکسیر اعظم ہے

خالص ہندوستانی جڑی بوٹیوں اور قیمتی اجزا کا مرکب ہے

عرصہ پندرہ سال سے ہندوستان اور ممالک غیر سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے!

زاید از ۳۷۵۰۰۰ آنکھوں کے لاعلاج مریض شفاء کامل حاصل کر چکے ہیں!!

آنکھوں کے ماہر ترین ڈاکٹر، حکیم، وید، راجہ، نواب اور ہر طبقہ کے معززین اس اکسیر کے استعمال سے شفا حاصل کرنے کیلئے سفارش کرتے ہیں

ہزارہا سرٹیفکیٹ و سفارشات میں سے ایک تازہ ترین چٹھی کی نقل از پنڈی گھیب مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۴۲ء "جناب منیجر صاحب پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ۔ تسلیم۔ میرے ایک عزیز رشتہ دار کی آنکھیں کافی عرصہ سے خراب تھیں سینکڑوں ادویات کا استعمال کرایا گیا مگر افسوس کہ کوئی دوا بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ دو دفعہ سول سرجن صاحب سے اپریشن بھی کرایا گیا ایک دفعہ اپریشن کھوکر کی ضلع گوجرانوالہ اور دوسری دفعہ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں مگر سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اتفاقاً میں نے ایک شیشی پرل کلوریم کی آپ کے ایجنٹ راولپنڈی سے خرید کر استعمال کرائی خدا جانے یہ دوا تھی یا جادو کہ چند ہی دنوں میں خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اب متواتر پرل کلوریم جو کہ ایک زندہ معجزہ سے کسی طرح کم نہیں استعمال کرا رہا ہوں میں آپ کو اس قابل قدر ایجاد پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں جس ایجاد نے سول سرجنوں کو مات کر دیا ہے اگر اس دوا کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو یہ ناقدر شناسی ہوگی آپ کا دعاگو ایس ایم صدیق لیڈر مرچنٹ پنڈی گھیب (آپ اس تحریر کو بندگان خدا کی بھلائی کیلئے استعمال میں لا سکتے ہیں)

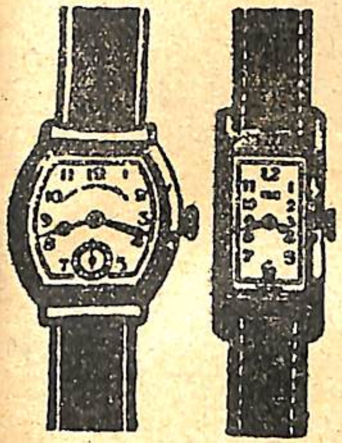
پریس کی متفقہ رائے علاوہ ہندوستان کی چوٹی کے اخبارات صرف لاہور کے ممتاز ترین اخبارات کے ریویو کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں، روزانہ ملاپ، پرتاپ، ویر بھارت۔ شہباز۔ انقلاب۔ احسان۔ زمیندار۔ عالمگیر، پیام مست قلندر۔ گورو گھنٹال۔ چترا پکچر۔ وغیرہ پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ سوائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں مثلاً کالا موتیا، نیلا موتیا، سبز، ہر قسم جیچک سے ضایع آنکھیں، جالا، پھولا، ہائی ما دیا، دمالو، پیا، ہر قسم آنکھ کا بیٹھ جانا۔ ککرے، پڑبال، آنکھوں سے پانی بہنا، چوٹ سے آنکھ ضایع ہونا وغیرہ وغیرہ کو شفا دینے میں اکسیر اعظم ہے موجد نے اس دوائی کو ایجاد کر کے ہندوستان پر بڑا بھاری احسان کیا ہے۔ یہ دوا خالص ہندوستانی جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور موجد نے ہندوستان کے ۵۰ بڑے بڑے شہروں میں دورہ فرما کر زاید از ۳ لاکھ آنکھوں کے لاعلاج مریضوں کو اس کے استعمال سے شفا بخشی ہے۔ ہم پرزور سفارش کرتے ہیں کہ جس بھائی بہن کی آنکھ میں کوئی بھی بیماری ہو وہ اس دوائی کا استعمال کریں کیونکہ اچھی چیزوں کی تبلیغ کرنا کار ثواب ہے۔ **قیمتیں** سپیشل پوٹینسی بارہ روپے بارہ آنے نارمل بڑی شیشی چار روپے بارہ آنے نارمل چھوٹی شیشی دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک خرچہ پیکنگ پرچہ ترکیب استعمال ہر زبان میں ہمراہ شیشی ہوگا اسپیشل پوٹینسی کی دوائی منگوانے کیلئے پانچ روپے پیشگی آنا لازمی ہے اپنے شہر کے مشہور دوا فروشوں سے طلب کریں نقال پیدا ہو چکے ہیں ان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کیلئے کارڈ بورڈ کے بکس پر موجد کا فوٹو ملاحظہ فرما کر اصل چیز کو حاصل کریں **لوکل ایجنٹس** چیف ایجنٹس میسرز بیلی رام اینڈ برادرز انارکلی۔ لوکل ایجنٹ میسرز کشن چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ چوک انارکلی۔ میسرز مہرو برادرز چوک انارکلی۔ میسرز نرائن داس بھگوان داس انارکلی۔ میسرز شنکر میڈیکل ہال ۳۰۔ نسبت روڈ لاہور میسرز دیوان چند اینڈ کمپنی میکلوڈ روڈ۔ نگر بیار پرلز متصل اڈہ لوہاری لاہور کریسنٹ میڈیکل سٹورز باداؤ نگہ سنگھ بلڈنگ دی مال لاہور۔ ایمپائر میڈیسن چوک چکلہ اندرون لوہاری گیٹ لاہور۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی نمبر ۹ (M.D.) ہیٹ روڈ لاہور

دس ہزار روپیہ کی گھڑیاں مُفت انعام!

RS 10000/

ہماری کمپنی نے اپنی تین مشہور فائدہ مند دوائیوں کی مشہوری کیلئے ہر شیشی کے خریدار کو ایک فینسی میوٹ رسٹ واچ اور ایک تولہ سونا لنڈن نیو گولڈ مُفت دینے کا فیصلہ کیا ہے جلدی کریں اور فائدہ حاصل کریں



بال عُمر بھر نہیں اُگتے

ہماری مشہور دوائی اصلی جوہر حسن کے لگانے سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کیلئے دُور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر دوبارہ اس جگہ بال کبھی پیدا نہیں ہوتے جگہ ریشم کی طرح ملائم نرم اور خوبصورت نکل آتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ پندرہ آنے (Rs. 1/15/-) تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپیہ (Rs. 5/-) اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی میوٹ رسٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت اور مضبوط ہے مضبوطی اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے اور ایک تولہ سونا لنڈن نیو گولڈ بالکل مُفت بھیجا جاتا ہے۔ ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین ۳ شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔ اور چار تولہ سونا اور چار ۴ گھڑیاں مفت انعام بھیجی جاتی ہیں۔

بال کالا تیل ۱ء

اس بال کالا تیل کے استعمال سے بال ہمیشہ کیلئے سیاہ ہو جاتے ہیں اور تمام عمر کالے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بے نظیر سنیاسی تحفہ ہے۔ فائدہ نہ ہونے پر قیمت فوراً واپس ہوگی۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے (Rs. 1/15/-) تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپے (Rs 5/-)۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی میوٹ رسٹ واچ اور ایک تولہ سونا لنڈن نیو گولڈ مفت بطور انعام بھیجے جاتے ہیں۔ گھڑی نہایت خوبصورت اور مضبوط ہے مضبوطی اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے۔ ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین ۳ شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک معاف اور چار تولہ سونا اور چار گھڑیاں مُفت انعام۔

کالے گورے ہو گئے

اگر آپ اپنے چہرے کا رنگ کالے سے گورا تبدیل کرنا چاہتے ہیں یا اپنے مُرجھائے ہوئے چہرہ پر سے بدنما کالے داغ کیل پھنسیاں۔ چیچک کے داغ اور چھائیاں دُور کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو ہمارا سائینس کے اصولوں سے تیار کردہ لنڈن بیوٹی لوشن استعمال کریں جس سے آپکے جسم یا چہرہ کا رنگ شرطیہ طور پر کالے سے گورا ہو جائیگا۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے (Rs 1/15/-) علاوہ محصول ڈاک۔ تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپیہ (Rs. 5/-)۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی میوٹ رسٹ واچ اور ایک تولہ سونا لنڈن نیو گولڈ بالکل مُفت بھیجا جاتا ہے۔ یہ گھڑی نہایت خوبصورت اور مضبوط ہے مضبوطی اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے۔ ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین ۳ شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک معاف اور چار تولہ سونا اور چار گھڑیاں مُفت انعام بھیجی جاتی ہیں ؀

منیجر لنڈن کمرشل کمپنی ایم ڈی بکس 165 / ۱۶۵

تین ادیبوں کا سنگھٹن



بمبئی کی ایک ادبی صحبت میں مولانا ماہر القادری اور حکیم محمد تقی ایڈیٹر مشہور دہلی اور خواجہ صابر ایڈیٹر تہذیب بمبئی میں فوٹو لیا گیا

سامنے ایڈیٹر مشہور - داھنی طرف خواجہ صابر

بائیں طرف مولانا ماہر القادری



نواب محمد صادق علی خانصاحب



ابو الفاضل مولانا - راز - چاندپوری



حکیم نور محمد دہلوی
رکن طبی بورڈ مشہور دواخانہ دہلی



حکیم رشید الزبیر صاحب دہلوی
نائب سیکٹری طبی بورڈ
مشہور دواخانہ دہلی



مسٹر ہریش چندر جین اسسٹنٹ
منیجر دی نیشنل ایڈورٹائزنگ
سروس بمبئی



عبدالحمید خاں بوہیرے
ایڈیٹر صبح امید بمبئی



حضرت نیر مارہروی

میں ہرگز گدھا نہیں ہوں

از جناب مولانا نصر اللہ خاں صاحب عزیز بی اے۔ مدیر "مسلمان" سابق مدیر "مدینہ" بجنور

مولانا نصر اللہ خاں صاحب عزیز بی۔ اے مدیر "مسلمان" لاہور کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ اخبار "مدینہ" بجنور کے صفحات پر مولانا کے قلم کی گلکاریاں نقش وفا کی طرح مٹ نہیں سکتیں۔ ہم ممنون ہیں کہ عزیز صاحب نے صحافتی مصروفیت کے باوجود "مشہور" کے لئے ایک دلچسپ افسانہ ارسال فرمایا۔

ایڈیٹر

"بڑی بی!" ——— "بڑی بی!" ——— آواز کی گونج ختم ہوتے ہی بڑی بی کمرے میں تھی۔

بھدی، بے ڈیل، اپنے آپ سے باتیں کرنے والی ——— یہ اس کی پرانی ملازمہ تھی۔ جو زندگی کی دردناکیوں کے مجسم ہو جانے سے بنی تھی ——— معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی اس کے آنسو جھریوں کے بنے بنائے راستوں پر بہ نکلتے تھے۔ مالک کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس کی ایک ٹانگ غیر ارادی طور پر حرکت کر رہی تھی۔ بوڑھی خادمہ دروازے میں سے داخل ہونے سے پہلے بلائے جانے کا مقصد جانتی تھی۔ اس نے بغیر زبان ہلائے ہاتھ ناشتہ کی کشتی کی طرف بڑھا دیے ——— مالک ناشتہ کر چکا تھا۔ پانچ بسکٹوں میں سے ڈیڑھ بچا ہوا تھا۔ اور بسکٹوں کی پلیٹ میں کچھ چورا بکھرا ہوا تھا۔

وہ کمرے سے چلی گئی۔ اب وہ اکیلا تھا۔ چند ناول رفاقت کے منتظر تھے

تکان اور کوفت بہت بڑھ گئی تھی ——— آہ زندگی کتنی مشکل ہے! ——— سردیوں کے موسم میں صبح دس ہی بجے جاگ اٹھنا اپنے خلاف کتنی بڑی جنگ لڑنا ہے ——— دس بجے کے بعد اس غریب کو بستر سے اٹھنے کے لئے بھی کافی زور لگانا پڑتا تھا ——— پھر یہ مرحلہ طے ہوتا تو آنکھیں اعلان جنگ کر دیتیں ——— ہم نہیں کھلتیں! ہم نہیں کھلنا چاہتیں! ابھی بہت سویرا ہے!

اور وہ انہیں کشتیوں میں رات کے آرام سے حاصل کی ہوئی ساری طاقت ضائع کر دیتا تھا۔

یہ ریلوے آفس کا کلرک تھا۔ اور اب کچھ عرصہ سے متواتر پندرہ پندرہ دن چھٹی لیتا جا رہا تھا۔ تاکہ اپنی صحت کو بحال کر لے ——— اس کی صحت یوں تو بھلی چنگی تھی۔ لیکن ایک رحمدل ڈاکٹر نے ہر پندرہ دن کے بعد اس کی پیش کردہ فیس پر رحم کھاتے ہوئے بیماری کا سرٹیفکیٹ دے دیا کرتا تھا۔

یہ چاندی اور سونے کی ٹکلیاں اور یہ رنگین ملاکوں سے چھپے ہوئے کاغذ بڑے خطرناک امراض پیدا کرنے والے جراثیم ہیں ——— اور ڈاکٹر نے معلوم کر لیا تھا کہ کلرک کی جیب کو رسولی میں بدل [illegible] اسے اپنے زیر علاج رکھ لیا۔ بس ہر پندرہ دن کے بعد ان کی جیب کا غیر مرئی اپریشن ہوتا تھا۔ اور خطرناک قسم کا گندہ مواد ——— ہاتھ پاؤں کا میل ——— گاڑھے پسینے کی کمائی ——— کا ایک حصہ خارج کر دیا جاتا تھا۔

غریب طبقہ کو دولت سے پیدا ہونے والے سارے امراض سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش دنیا کی ہر سوسائٹی میں ہوتی ہے۔ متوسط طبقہ کو کم خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے اندر کچھ نہ کچھ قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن "جبل الطارق" قسم کے سیٹھ پورے طور پر خطرے سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ وراثتی اور اکتسابی اسباب سے دولت کے بیماروں کو خود بیماری بن جاتے ہیں۔

چٹان کی طرح کا جسم رکھنے والا کلرک بیوی بچے نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک متوسط طبقے میں شامل تھا۔ ورنہ دراصل تو وہ غریب ہی تھا۔

خیر تو ان دنوں وہ تندرستی کے کسی مرض میں مبتلا تھا ——— صبح جاگنے کے بعد ہاتھ منہ دھونے ناشتہ کرنے اور دو تین سگرٹ سلگا چکنے کے بعد اس کا بدن الگ اور دماغ الگ تھک کر چورا ہو جاتا ہے ——— کہئے! اب بھی اسے ذرا دیر کے لئے تفریح کا حق حاصل نہیں؟ ——— آپ نہ مانیں تو نہ سہی! اسے تو اپنے حق کا لحاظ ہے ——— وہ تو اپنے فرض کو پورا کرے گا۔

اس نے ناولوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور ایک ضخیم ناول کھولا۔ اب تک اس نے اکیاسی صفحے چند دنوں کی عرق ریزی سے دیکھ لئے تھے۔ جس ورق سے اب اس نے اپنا مطالعہ شروع کرنا تھا۔ اس کا ایک کونا دہرا کیا گیا تھا ——— وہ سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ مطالعہ کرتے وقت شور کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کے تنفس کی کرخت آواز خلل انداز ہوتی تھی۔ اسے اپنے سانس پر غصہ آجاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ سانس کے بغیر جیا جا سکے۔ وہ بگڑ کے کبھی کبھی سانس کو سینے میں اس ارادے سے روک لیتا تھا کہ بس اب ختم لیکن پھر انجام کار زور سے ایک "خوں" ہوتی۔ اور پھیپھڑے اتنے زور سے ہوا [illegible] زلزلہ سا آجاتا تھا ———

—— اس قسم کے علمی تجربات کی وجہ سے اس کا مطالعہ تیز رفتار نہیں تھا

وہ علمی انسان بھی بننا چاہتا تھا، نرا کتاب کا کیڑا ہو جانے سے کیا حاصل!

کتاب پڑھتے پڑھتے اسے اونگھ سی آ گئی۔ اس کا سر جھکتا چلا جا رہا تھا۔

ابھی کرسی کے بازو سے ٹکرانے نہیں پایا تھا کہ گلی میں ایک مختصر سا دھماکا ہوا۔ دھماکے سے وہ چونک گیا۔ دیکھا تو گلی میں ایک گھڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور بہتا ہوا پانی نظر آیا —— بہشتی کچھ بڑبڑاتا ہوا جا رہا تھا۔

آگے آگے گدھا۔ گدھے کی پیٹھ پر پانی کی مشک —— لیکن آج اس کا سر گھڑے سے خالی تھا۔

کلرک نے ناول رکھ دیا —— اور خیال کیا کہ انسان کی شان ایسی نہیں ہے کہ وہ مفکر ہو۔ کچھ سوچے کچھ سمجھے۔ کچھ غور و خوض کرے اور تحقیق کی نگاہ سے ہر معاملے کو دیکھے۔ چنانچہ وہ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچا کہ ——

اس بہشتی کا سر آج پہلی دفعہ گھڑے سے خالی دیکھا گیا ہے —— اگرچہ اس کے گدھے کی پیٹھ مشک سے خالی نہیں ہو سکی —— میں، بہشتی، اس کا گدھا، اور یہ گلی، سردیاں ہوں۔ گرمیاں ہوں! آئت وار ہو، جمعرات ہو، مہینے کی یکم ہو، یا ستائیسویں، ۱۹۳۸ء ہو یا ۱۹۴۳ء، عید ہو یا محرم —— وہی بہشتی! وہی گدھا!

اس بہشتی کی زندگی کیسی ہوگی۔ پانی کا کام کرنے کی وجہ سے بھیگی ہوئی اور سرد۔ —— زندگی! زندگی! ہر روز کہیں آدھی رات کو اٹھنا۔ گدھے کو تیار کرنا۔ اور نلکے کے سر پر سوار ہو جانا۔ ایک گھڑا اور ایک مشک ——

ایک بہشتی اور ایک گدھا —— ہر روز یہاں سے گزرتے ہیں۔ کئی کئی بار گزرتے ہیں۔ ایک ہی جیسے حالات کے ساتھ —— بالکل نہ بدلنے والے حالات!

گلی بھی نہیں بدلتی۔ گدھا بھی نہیں بدلتا۔ بہشتی بھی وہی ہے ——

ہاں لیکن میں خود بھی تو وہی ہوں۔ مجھے کیا حق ہے کہ کسی کی یک رنگی پر اعتراض کروں —— اس مسئلے پر غور کرتے کرتے میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ یہ دونوں میرے قوائے فکریہ کو کھا جائیں گے —— یہ دونوں کون ہیں! یہ دونوں کیا ہیں —— بہشتی اور گدھا! گدھا اور بہشتی —— کیسی جوڑی ملی ہے۔

اسے خیال آ رہا تھا کہ گدھا بچارا دبلا پتلا ہے۔ مگر باہمت ہے۔ آدھی رات سے پانی ڈھونا شروع کرتا ہے۔ پانی ڈھوتے ڈھوتے دن کے گیارہ بج جاتے ہیں۔ گیارہ بجے اور اسے ایک آدھ گھنٹے کی چھٹی ملی۔ جھکی ہوئی بھوک کی نگاہیں جب سبز سبز چارے پر پڑتی ہوں گی تو اسے ساری مشقت بھول جاتی ہوگی۔ چارے کی جو تھوڑی سی مقدار اس کے نصیب میں ہوتی ہے۔ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد وہ پھر اپنے فرض کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اب غذا قوت میں بدلتی رہے گی۔ اور قوت پانی ڈھونے میں استعمال ہوگی۔ پانی ڈھونے سے پھر غذا حاصل ہوگی۔ یہ زندگی کے پہیے کی گردش ہے —— نہیں معلوم چارہ کھانا اس کا مقصد زندگی ہے یا

پانی ڈھونا؟ یہ مجھے کیا معلوم ہوگا۔ اس کے مالک کو بھی معلوم نہیں۔ بلکہ خود اس کو معلوم نہیں —— اس کے مالک کا بھی وہی پروگرام ہے۔ گیارہ بجے تک پانی ڈھو...

پھر روکھے سوکھے چند لقمے حلق سے اتار لینا —— پھر گدھے کے...

ذرا دیر کے لئے دھوپ میں پڑ رہنا —— اور پھر وہی گھڑا اور وہی بہشتی...

روٹی کھانا اور پانی ڈھونا —— وہ بہشتی اس وقت سامنے ہو تو پوچھوں کہ... سانس لیتا ہے چلتا پھرتا ہے اور بہشتی بنا ہوا ہے کیا ہے تیرا مقصود؟ —— کیا ہیں تیرے... کے معنی؟ —— اور یقیناً وہ اپنے گدھے کی طرح کوئی جواب نہ دے سکے۔ وہ اپنے گدھے... بہتر ہے ہی کہاں۔ وہ بھی تو ایک حیوان ہی ہے —— ایک گدھا ہی ہے —— انسان نام کا... بہشتی نام کا گدھا! —— وہی چکر قوت سے غذا، غذا سے قوت —— مرغی سے انڈا، انڈے...

یہاں پہنچ کر وہ بیٹھے بیٹھے چونک سا گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا... کوئی نہیں تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ اسے یہ خیال آ گیا تھا کہ میں بھی تو گدھے سے بہتر نہیں... بہشتی کے گدھے کا دو ٹانگوں والا بھائی۔

انسان کبھی کبھی اپنے اوپر بھی تنقید کر گزرتا ہے۔ بڑی دلچسپ ہوتی ہے... لیکن اس سے کوئی دوسرا لطف نہیں لے سکتا۔ ہر آدمی اپنے متعلق ایک خاص رائے... یہ رائے بارہا بدلتی ہے لیکن ایک نہ ایک رائے بہرحال برقرار ضرور رہتی ہے... اپنے آپ سے بھی زیادہ پرائیویٹ ہوتی ہے۔ بارہا آدمی کی نگاہ نادانستہ طور پر اپنی... شخصیت پر جا پڑتی ہے لیکن وہ "غض بصر" کر لیتا ہے —— اپنے آپ کو... آپ سے چھپاتا ہے۔ تو دوسروں کو کیا دکھائے گا۔

کلرک کو اپنے غلط انداز فکر پر غصہ آ گیا —— اس نے حواس کو مجتمع کر کے... تحقیقی نظر ڈالی۔ کچھ سوچا اور بے آوازی سے بڑبڑایا کہ میں ہرگز گدھا نہیں ہوں... وہ سوچ رہا تھا کہ گدھے کی ٹانگیں چار ہوتی ہیں لیکن اس کی ٹانگیں یقیناً دو ہیں... باری اپنی دونوں ٹانگوں کو آگے بڑھا کر، حرکت دے کر اور ٹٹول کر دیکھا —— د... پھر اس کا ہاتھ اتفاقاً اپنے ایک کان سے جا لگا۔ یہ بھی بالکل چھوٹے چھوٹے، نازک نازک... قسم کے انسانی کان تھے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ گدھا نہیں ہے۔ وہ جھلا ر... آپ اپنی توہین کیوں کی، مجھے اپنے آپ سے معافی مانگنی چاہیئے —— مگر پھر اسے... کہ جب میری زندگی بھی اسی طرح بے معنی ہے جس طرح بہشتی کی، اور بہشتی کے گدھے... کائنات بھی کھانے اور کمانے تک ہی محدود ہے، تو میں اپنے آپ کو کیوں بہتر سمجھ... آخر وہ اپنی ذہنی کشمکش سے تنگ آ گیا اور اس نے عقلی دلائل سے الگ ہو کر... میں فیصلہ کر دیا۔ کہ ممکن ہے میں انسان نہیں ہوں گا لیکن میں ہرگز گدھا... کیونکہ میں میں ہوں —— لوگ بہت سارے مسائل کو اسی طرح حل کیا کر... آخری الفاظ بدحواسی میں دماغ سے اس کی زبان پر منتقل ہو گئے —— اس... ساتھ ہی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی —— اور گھبراہٹ میں اس کے... صرف اتنا ہی نکلا "میرے آقا!" ——

ریاضِ سخن

محترمی قاضی محمد ریاض الدین صاحب انصاری علی گڈھ یونیورسٹی کے ڈبل ایم اے اور بی ٹی ہیں اردو زبان کے مشاق شاعر پختہ کار نثر نگار اور انشاء پرداز ہونے کے علاوہ علم ریاضی کے زبردست ماہر ہیں۔ ذیل کی موسیقیت بھری غزل جس میں سادگی، سلاست، فصاحت، صفائی، روانی وغیرہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں میرے بیحد اصرار پر آپ نے ارسال فرمائی ہے۔ قاضی صاحب کا متواتر سکوت جرم ادبی تک پہنچ چکا تھا۔ اور تعجب نہ تھا کہ عدالت العالیہ ادبیہ کی جانب سے آپ پر فرد جرم لگ جاتی۔ کیونکہ ادبی دُنیا میں گمنامی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ اور عشق کی دُنیا میں تشہیر سے بڑھ کر کوئی نیک نامی نہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرا اصرار آڑے آیا اور موصوف نے وہ بلند پایہ غزل بھیجی جو گذشتہ کئی سال کے متواتر سکوت کا نعم البدل ہو سکتی ہے۔ ایڈیٹر

حسینوں سے دل کوئی کیونکر بچائے، نگاہیں کوئی کس طرح ان سے پھیرے
کسے بخشتے ہیں یہ بیدرد رہزن، کسے چھوڑتے ہیں یہ ظالم لٹیرے
عجب کشمکش میں ہیں اہل محبت، نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے
کہاں جائیں، کس سے کہیں، کیا کریں یہ، بلاؤں کے مارے مصیبت کے گھیرے
بس اپنا تو ہر پہر کے یہ مشغلہ ہے، اندھیرے، اُجالے، اویرے، سویرے
کبھی نازنینوں کے کوچوں کے چکر، کبھی مہ جبینوں کی گلیوں کے پھیرے
غم و درد نے چھاؤنی چھائی ایسی، مصیبت نے ڈالے وہ دن رات ڈیرے
کہ عیش و خوشی، راحت و شادمانی، کبھی بھول کر پاس پھٹکے نہ میرے
حسینوں کو عشاق سمجھے ہیں اپنا، خدا ان سے سمجھے، سمجھ ان کی پھیرے
یہ کس کے ہوئے؟ یہ کسی کے نہیں ہیں، نہ اِسکے، نہ اُسکے، نہ تیرے، نہ میرے
نہ مونس، نہ ہمدم، نہ کوئی یگانہ، نہ گھر در کوئی ہے، نہ کوئی ٹھکانہ، !
یہاں دن گزارا، وہاں رات کاٹی، جدھر منہ اُٹھا، چل پڑے منہ اندھیرے
ملیگا نہ تم کو طلبگار ایسا، وفادار اتنا، پرستار ایسا
مگر تم کسی کے نہ ہو کر رہو گے، ہزاروں جتن پر ہوئے جب نہ میرے
کسی کے پھٹے میں کوئی پیر دے کیوں، پرائے بکھیڑے میں آخر پڑے کیوں
کسی کو غرض، واسطہ، بحث، مطلب، مجھے ان کے شکوے، گلے ان کو میرے
دل و جان و ایماں پہ بجلی گراتا، ہر اک گام پر حشر سو سو اٹھاتا
سرِ بام کون آگیا ہے الٰہی، یہ گیسو سنوارے، یہ زلفیں بکھیرے
وہی دل، وہی غم، وہی آہ و زاری، وہی بے کسی، بے بسی، بے قراری
زمانے نے پلٹے لئے گو ہزاروں، مگر وائے قسمت پھرے دن نہ میرے
ریاضؔ اسمیں کوئی تعجب نہیں ہی، جو مقبولیت تجکو حاصل ہے اتنی!!
یہ دلکش، دلِ آویز رنگِ تغزل، یہ پُرسوز، پُر درد اشعار تیرے!

خاص

سالنامہ مشہور دہلی کیلئے



اِرشادِ بیخود



وحید العصر فرید الدہر امتیاز الشعراء افتخار الملک حضرت حاجی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرتِ داغ مرحوم (خدا انھیں عرصہ دراز تک زندہ رکھے) آج رنگ تغزل میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ زبان قلعۂ معلیٰ آپکے بعد ختم ہے۔ جس مشاعرہ میں تشریف لاکر غزل پڑھ دیتے ہیں سامعین کو سکتہ طاری ہو جاتا ہے اور کیسا ہی نام آور شاعر کیوں نہ ہو اُس کا رنگ نہیں جمتا۔ یہ حقیقت ہے جسے ارباب دہلی بخوبی جانتے ہیں۔ ذیل کی غزل نہیں بلکہ نظم ہے مگر اس میں بھی جو فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ اس قابلِ رشک طرز اور دل آویز ادائے بیان کا کیا کہنا؟ ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ نظم حضرت بیخود نے ایک پبلک جلسہ میں پڑھی تھی اور مجمع کو تصویر حیرت بنا دیا تھا۔ میرے اصرار پر موصوف نے یہ نظم برائے اشاعت "مشہور" کو عطا فرما کر قارئین مشہور کو لطف اندوزی کا موقع بخشا۔ ایڈیٹر

کچھ بھی اگر دلوں میں محبت وطن کی ہے
ہم سب پہ آج فرض حفاظت وطن کی ہے

دل میں بسی ہوئی جو محبّت وطن کی ہے
بہتر ہوائے خلد سے نکہت وطن کی ہے

اس اختلافِ مذہب وملت کو چھوڑ کر
ہم سب پہ آج فرض حمایت وطن کی ہے

آبادیٔ وطن سے ہیں وابستہ عزّتیں
بربادی سب کے حق میں قیامت وطن کی ہے

اس جانِ ناتواں کو فدائے وطن کریں
لیکر ہم اپنے سر جو مصیبت وطن کی ہے

کس کی مجال ہے جو ادھر دیکھ بھی سکے
دشمن کی بھی نگاہ میں عظمت وطن کی ہے

دلمیں اِدھر تو خونِ شجاعت کا جوش ہے
لب پر اُدھر دعائے حفاظت وطن کی ہے

اے آسماں نظر نہ لگے دیکھ شوق سے!!
یہ شان یہ شکوہ یہ شوکت وطن کی ہے

کمبخت آسماں نے دکھائی ہیں گردشیں
بیتاب و بے قرار جو خلقت وطن کی ہے

بائیس خواجگان کی چوکھٹ ہے یہ زمین
بیخود یہ آشکار حقیقت وطن کی ہے

کے پیسے کی

نظر کے اُس پار

از جناب سیّد محمد تقی صاحب امروہوی

مسائل ہیئت پر یہ دلچسپ مقالہ محترم سید محمد تقی صاحب امروہوی سابق ایڈیٹر جینگاری کی قلم کا رہینِ منت ہے۔ کائنات کی وسعت کا اندازہ کرنے کی ابتک جتنی کوششیں کی گئی ہیں ہمارے خیال میں وہ سب ناکام ہیں۔ دُنیا نے جب سے وہ پیدا ہوئی ہے اس نیلگوں آسمان سے ہٹکر کوئی اور چیز نہیں دیکھی۔ انسانی علم و فراست کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی لئے ذوق مرحوم نے اس باب میں یہ کہکر ہتھیار ڈالدئیے ؎ احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے ؛ نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا؛ بہرحال سائنس کے دلدادہ اور ریاضی داں احباب اس مضمون کو دلچسپی سے ملاحظہ فرمائینگے۔

ایڈیٹر

(※)

جنگ اور سیاست۔ آتشین اسلحہ اور انسان کُش ہتھیاروں کی جھنجھناہٹ بڑھتے ڑھتے اتنی ہمہ گیر ہوگئی ہے کہ انسانیت کو مسائل ہیئت پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملتی ور آجکل عام انسان کی نظریں اپنے محدود ماحول سے اُٹھکر آسمانی فضاؤں میں پرواز کرنے کی طاقت کھو چکی ہیں۔ لیکن اس ہنگامۂ دار و گیر میں ایسے افراد بھی موجود یں جو ہمارے تنگ خیالات کی دُنیا سے الگ ہوکر آسمانی مخلوق کی بابت غور کرتے رہتے ہیں اور جو کائنات کی وسعت و نہایت کو ناپنے کا عزم کر چکے ہیں۔

یوں تو سائنس نے ہماری زندگی اور زندگی کے ہر گوشہ میں عجیب عجیب ختراعات و ابتداعات کئے ہیں لیکن ہماری سماج نے محدود اعمال و حرکات کے ادہ بھی اس نے اپنی بلند نظریوں اور دقّت بینیوں کا ثبوت دیا ہے۔ موجودہ علم ہیئت س کی بہترین مثال ہے۔ سائنس نے علم ہیئت میں وہ وہ انکشافات کئے ہیں جن پر لب مرحوم کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے ؎

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہئے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

رہے اب انسانی نظر خورد بین اور دُور بین کی مدد سے اُن چیزوں کا مشاہدہ کر سکتی ہے ن کا تخئیل بھی پانچسو سال پہلے کا انسان نہ کر سکتا تھا۔ گذشتہ پچاس برس کی در پے۔ لگاتار اور انتھک جدو جہد کے بعد علمائے سائنس نے ایسے چھوٹے چھوٹے ذرّوں انکشاف کیا ہے جن تک زمانہ ماقبل میں انسانی تصور کی رسائی محال تھی۔ زیادہ دن یں گذرے کہ یونان کے مدارس فکر و نظر کے اساتذہ مشائیت اور اشراقیت کے لکوں کے ماتحت مادہ کی بابت نئے نئے نظریئے رکھتے ہیں۔ ارسطو کے مقلدین یعنی اسکول کے ماننے والے۔ مادّہ کو ذرّات پر مشتمل مانتے تھے۔ چنانچہ آج بھی ہمارے عربی مدارس کے فضلاء مادّہ کی وسعت کو اسی حد تک محدود سمجھتے ہیں۔ لیکن آجکل جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں اس نظریہ کی قطعی تردید کردی گئی ہے۔ آج طبیعات اور کیمیا کے ماہرین اسے، ساعات، پر مشتمل مانتے ہیں۔ یہ ساعات، جواہر فردہ۔ (جوہر فرد) سے مرکب ہیں۔ اس جوہر فرد، کا ایک مرکز ہے جسکے گرد، برق پارے، حرکت کرتے رہتے ہیں مرکز میں ایک اثباتیہ اور ایک منفیہ ہے جن کے متعلق ہم کم سے کم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ ایک برقیہ جس کا قطر $\frac{1}{5\times10^{10}\times10}$ مینٹی پانچہزار کروڑواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے چاروں طرف ایک سکنڈ میں کروڑوں بار چکر کاٹتا ہو۔ بتائیے اس کا تصور کسقدر دشوار اور مشکل ہے۔ یہ اُس دنیا کا ذکر ہے جسپر ہم رہتے ہیں ذرا اپنے تصور کو بڑھائیے اور پھیلائیے اور اندازہ لگائیے کہ ہم جس زمین پر رہتے ہیں اسکے اوپر ایک سیارے میں کتنی نہایتیں اور کسقدر وسعتیں ہیں۔ اگر آپ سطح سے فوق کی طرف نظر ڈالیں تو آپ کو دُنیا کے اردگرد عجوبات کا ایک سمندر جوش زن معلوم ہوگا۔

زمین کی عمر

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر ہم ساتھ ہی زمین اور سورج کی عمر کی بابت بھی تھوڑا سا غور کرلیں تاکہ ہماری عجوبہ دُنیا کا ایک اور نیرنگ ہمارے سامنے آجائے۔ طبقات الارض کے علماء نے بیان کیا ہے کہ اس زمین کی عمر جس پر ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے اور زمین پر زندگی کے آثار نمایا ہوئے تیس کروڑ سال گذر چکے ہیں۔ مگر اسکے مقابلہ میں انسان کا وجود صرف تین لاکھ سال سے ہے اور ذوالعقل انسان کا صرف پندرہ بیس ہزار

ل ہے ۔ اسکے برعکس سورج کی عمر اسّی کھرب سال بتائی گئی ہے ۔

کائنات کی وسعت

یہ کائنات جس کا شاید لاکھواں حصہ انسانی نظر کی پکڑ میں آتا ہے کتنی وسیع
کس حد تک پھیلی ہوئی ہے اس کا اندازہ عام افراد کو نہیں ہے ۔ لیکن ماہرین علم ہیئت
اگر پوچھا جائے تو وہ ناقابل تصور اعداد بتانے کے بعد بھی اپنی موجودہ بے بضاعتی کا
ار کرینگے ۔

سرسری اندازہ لگانے کیلئے پہلے ہمیں کچھ اپنی زمین اور اپنے سورج کی بابت
نا چاہیئے تاکہ ہم کائنات کی بابت بظاہر خلافِ قیاس تخمینوں کا اندازہ لگا سکیں ۔
ری زمین جس پر ہم رہتے ہیں ایک بہت بڑا کرّہ ہے ۔ ہماری زمین کا محیط تقریباً
یس ہزار میل ہے ۔ اتنی بڑائی کے وجود زمین آفتاب کے مقابل کہیں چھوٹا کرہ ہے
تاب جسامت کے اعتبار سے زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے ۔ زمین کا محیط ہے ۲۵ ہزار
ں اور آفتاب اس سے بڑا ہے ۱۳ لاکھ گنا ۔ اب قیاس کیجئے آفتاب کتنا بڑا ہوگا ۔
ن آپ کا قیاس قطعی واماندہ ہوجائے گا جب آپ یہ سنیں گے کہ کائنات کے
در میں ہمارا یہ اتنا بڑا آفتاب ایک ناچیز قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے تقریباً
۴۰۰۰ × ۱۰ (چار کھرب) ستارے ایسے ہیں جو بجائے خود آفتاب ہیں جن
ں کچھ ہمارے آفتاب سے چھوٹے اور کچھ اس سے کئی گنا بڑے ہیں ۔ ان ہی ستاروں
ہمارا کہکشانی نظام بنتا ہے ۔ اس نظام کی حدبندی کہکشاں کرتی ہے ۔ صحیح تر
زہ کرنے کیلئے ہیئت داں ایک دوسرا طریقہ استعمال کرتے ہیں ۔ مناسب ہے کہ
حساب سے ہم بھی اپنے تخمینوں کو قائم کریں ۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار
ں فی سکنڈ ناپی گئی ہے ۔ روشنی کی اسی رفتار سے کائنات کی وسعت کے اعداد بتائے
تے ہیں ۔ روشنی کی اس رفتار کی رو سے ایک شعاع کو آفتاب سے چلکر ہمارے کرہ
پہنچنے میں ۸ منٹ لگتے ہیں ۔ لیکن آپ بالکل متعجب نہ ہوں کہ اسی روشنی کو جو
سرعت سے بعید ترین مسافت طے کرجاتی ہے ہمارے کرہ سے قریب ترین سیاروں
پہنچنے میں چند منٹ ۔ چند گھنٹے ۔ چند دن ۔ چند ہفتے یا چند مہینے نہیں بلکہ ۴ سال
ہیں اور بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ مدّت صرف ہوجاتی ہے ۔ یاد رہے یہ
ب ترین سیاروں کا ذکر ہے ۔ لیکن کہکشاں کا قطر اسقدر بڑا ہے کہ یہ سریع الحرکت
اپنی حیرت انگیز شتابی کے باوجود بھی کہکشاں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک
اکھ ۲۲ ہزار سال میں پہنچ پاتی ہے ۔ ممکن ہے ان اعداد کو سنکر اب آپ یہ رائے
م کرلیں کہ کائنات کی وسعت ان حدود تک جاکر ختم ہوگئی ہے ۔ لیکن آپ کا یہ خیال
ط ہے ۔ اس کہکشانی نظام کے اس طرف بھی کروڑوں کہکشانی نظام موجود ہیں ۔
یس صرف ۔ کوہ ولسن ۔ کی سو انچ قطر کی دوربین ہی مشاہدہ کرسکی ہے ۔ کہئے کیا ان

سی بیوں کا فاصلہ تصوّر میں آسکتا ہے لیکن ابھی آپ کو اور آگے جانا ہے ۔ بعض سحابیے اس
بھی زیادہ فاصلہ پر ہیں یعنی وہ ہم سے اسقدر دُور ہیں کہ روشنی کو اُن سے جدا ہوکر ہم تک
آنے میں ۲۴ کروڑ سال مطلوب ہیں ۔ اور بہت سے ستارے تو ایسے ہیں جن کی روشنی نے
اپنے ستاروں سے چھوٹ کر تاحال ہماری زمین کی صورت تک نہیں دیکھی اور نہیں معلوم وہ کب
یہاں پہنچ پائے ۔

سب سے بڑی دُوربین

کائنات کی حیرت انگیز وسعت کی بابت یہ ساری معلومات طاقتور دوربینوں
کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے لیکن ترقی پسند دُنیا کی کوششیں ابھی تک جاری ہیں اور یورپ و
امریکہ کے ماہر سائنسداں قانع نہیں ہوئے ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں جہاں تک ہوسکے مزید
معلومات حاصل کی جائیں ۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ طاقتور مشینیں اس مقصد کے لئے تیار کی
جارہی ہیں اور کی گئی ہیں ۔ اس سلسلہ میں تازہ ترین اور کامیاب کوشش امریکہ والوں کی ہے
امریکہ میں ایک بہت ہی طاقتور دُوربین بنائی جارہی ہے ۔ اس کا شیشہ ہر چیز کو انسانی
نظر کے مقابل دس لاکھ گنا بڑا دکھائیگا ۔ دُوربین کا دہانہ دوسو انچ کے قطر کا رکھا گیا ہے ۔
آجتک کسی بھی بڑی سے بڑی دُوربین کا دہانہ اسقدر بڑا نہ تھا ۔ اسی طرح یہ دوربین موجودہ
دُنیا کی سب سے طاقتور دُوربین ثابت ہوگی اور اس سے کائنات کا وہ حصہ نظر آئیگا جہاں
تک تاحال انسانی فہم وتخیل کی بھی رسائی نہیں ہوئی ۔ اس دُوربین کے مکمل ہونے کے بعد
کہا جاسکے گا کہ ابھی انسان کے تخیل کو کسقدر مزید وسیع دُنیا کا دورہ کرنا ہے ۔

ایک غلط کاری

آج تک انسانی کائنات کے احصار کی پے در پے کوششیں کیں اور ایک معینہ مدت
کا ان کوششوں کو آخری چیز سمجھ لیا گیا ۔ دوسری صدی عیسوی (سنہ ۱۵۱ء ۔ ۱۲۷ء) میں مصر
میں ایک مشہور ریاضی داں پیدا ہوا اس کا نام تھا بطلیموس ۔ یہ شخص بلاشبہ پُرانی دنیا کا
لائق ترین ریاضی داں تھا ۔ اسی نے سب سے پہلے کائنات کا احصار کیا ۔ ہرچند اس سے پہلے بھی کئی
یونانی اور منطقی علماء ہیئت نے نئے نئے نظریات پیش کئے تھے ۔ مگر اسکے باوجود کائنات
کا موجودہ تصور ٹھیک طرح نہ پیدا ہوا تھا ۔ فیثاغورث مشہور یونانی فلسفی نے ضرور سب
کے مقابل نئی باتیں کہی تھیں اور سب سے پہلے اسی نے سورج کی مرکزیت کے نظریہ کو پیش کیا تھا
لیکن بطلیموس کو اپنے ماسبق علماء پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے کائنات کو ایک منضبط
شکل میں پیش کیا جو کہ پُرانی ہیئت کے لئے ایک نئی چیز تھی ۔ بطلیموس کے خیال میں ساری
کائنات چند گنتی کے آسمانوں تک محدود ہے ۔ پہلے آسمان کے نیچے چند کُرّے تھے ۔ قمر کے
کُرّہ کا بُعد بطلیموس کے خیال میں ۴۵ میل ہے ۔ کچھ اسی اوسط سے اس نے پہلے دُوسرے
تیسرے غرض سارے آسمانوں کا بُعد معلوم کیا تھا ۔ آٹھویں آسمان کی دُوری بھی بطلیموس
کے خیال میں ایک معلوم شدہ حقیقت ہے ۔ آج بھی ہمارے عربی مدارس میں بطلیموس کی ہیئت
پورے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے ۔ خیر بطلیموس نے اور کوئی غلطی کی ہو یا

یانہ کی ہو البتہ یہ غلطی اس نے بہت بڑی کی کہ ساری کائنات کو ایک محدود چیز فرض کر لیا۔

اسی سلسلہ میں مسٹر شفیق حسن ایلیا اودھوی کا ذکر کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا آپنے بھی بطلیموسی اور فیثا غورثی نظام کے بین بین ایک نئے نظامِ عالم کا نقشہ تیار کیا ہے موصوف نے کائنات کی وسعت کو بطلیموس کے مقابل زیادہ بڑھا دیا ہے لیکن کائنات کی محدودیت اور لامحدودیت کے معاملہ میں آپکا اور بطلیموس کا خیال یکساں ہے۔ فرق یہ ہے کہ بطلیموس صرف نو اجرام فلکی کے مجموعہ کو کائنات مانتا ہے اور آپ اسے صرف نظامِ شمسی یعنی ہمارے سورج کا نظام مانتے ہیں اور سیاروں کی تعداد ۹ کے بجائے ۱۳ قرار دئے ہیں اور اسی ہمارے آفتاب کے نظام کی طرح مزید ۱۸ ہزار نظام مانتے ہیں لیکن اس حد پر پہنچ کر آپ بھی کائنات کو محدود قرار دیدیتے ہیں۔ آپکے خیال میں یہ نظام قرآنی دلائل سے بھی صحیح ثابت ہوتا ہے چنانچہ آپنے اپنے ایک رسالہ میں ان تمام نظریات کو بیان کیا ہے معلوم نہیں شائع ہوا یا نہیں۔

کائنات کو ناپنے کی یہ کوشش برابر جاری رہی۔ یہاں تک کہ نئے عہد کے سب سے لائق ریاضی دان آئن اسٹائن نے بھی کائنات کی محدودیت ہی کو تسلیم کیا لیکن ان تمام مفکرین میں ایڈنگٹن سب سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے تو بیا کی تخیل کی انتہا ہی کر دی۔ ایڈنگٹن نے صرف یہی نہیں کیا کہ کائنات کو محدود مانا ہو بلکہ پوری کائنات کے برقیوں کو گننے کی بھی اس نے کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ ساری کی ساری کائنات کے برقیوں کی کل تعداد ۷۹،۱۰×۲۹،۱ ہے یہ اس کوشش کی آخری نہایت تھی۔ ممکن تھا اس سلسلہ میں اور کوشش بھی کی جاتی لیکن موجودہ محدودیت کا نظریہ پھر چھوڑ دیا گیا اور خود آئن اسٹائن جیسے مفکرِ اعظم نے بھی محدود فضاء کے فرضیہ کو ترک کر دیا۔

محدود یا لامحدود

اس نقطہ پر آکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پھر کائنات محدود ہے یا لامحدود۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ سوال ابھی تک تشنۂ جواب ہی ہے اور شاید اسوقت تک اسکا کوئی جواب نہ دیا جا سکے گا جبتک بالکل آخری اور قطعی طور پر تمام دنیائے سائینس نہ مان لے کہ اب کائنات کی وسعت اُن حدود سے زیادہ نہیں ہے جن تک ہماری طاقتور دُوربینوں نے ہمیں پہنچا دیا ہے۔ اگر آخری بار ان طاقتور دُوربینوں سے زیادہ طاقتور دوربینیں بھی وہی فیصلہ دیں گی جو پہلے آخری مان لیا گیا تھا تو شاید اس کا تشفی بخش جواب دیا جا سکے گا ورنہ ہر بار طاقتور سے طاقتور دوربینیں نئی نئی اور عجیب عجیب دُنیائیں ہمارے سامنے لاتی رہینگی اور ہم اس سے زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہینگے۔ تاہم امریکہ میں جو نئی دُوربین زیر تعمیر ہے اسکے نتائج معلوم ہونے پر بھی کوئی قرینِ قیاس نتیجہ نکل آنے کی توقع ہے اسلئے کہ یہ دُوربین بلا شبہ انسانی معلومات کی دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کرنے والی ہے اور اس سے کائنات کے وہ چھپے ہوئے گوشے نظر آئینگے جن تک کہ شاید ہمارے سورج کی کرنیں بھی بمشکل ہی کبھی پہنچی ہونگی۔ یقیناً اس دُوربین کی تکمیل کا تمام دُنیا کو بڑی بے چینی سے انتظار ہے توقع ہے کہ "انسانی فہم و فراست کا یہ نادر نمونہ جلد تیار ہو گا"

تازیانہ

از حضرت نقاد

کل چند شاعران فصیح البیان ملے — میں نے کہا کہ بزم میں تشریف لائیے
اہلِ نظر سے داد گرانمایہ لیجئے — فکرِ رسا کے جوہرِ پنہاں دکھائیے
فرمایا صرف داد ہی ہمکو ملی تو کیا — گر ہو سکے تو نقد کسی سے دلائیے
اب شاعری ذریعہ کسبِ معاش ہے — سوچا ہے اس سے دولتِ دنیا کمائیے
مینے کہا کمانیکے سو ڈھنگ ہیں۔ مگر — لِلّٰہ شاعری کو نہ پیشہ بنائیے
سوز و گداز طبع دکھانے کے واسطے — لوہے کو تاؤ دیجئے، بھٹی جلائیے
رنگینیِ مزاج دکھانے کے واسطے — ملبوس رنگئے، رنینوں میں غوطہ کھائیے
گر رفعتِ خیال دکھانیکا شوق ہو — اونچے پتنگ اُڑائیے، بازی لگائیے
گر ہو سکے تو سینہ فگاروں کی یاد میں — شہتیر چاک کیجئے، آرے چلائیے
گر ہو سکے تو حضرت فرہاد کی طرح! — پتھر کو توڑنے کی مشقت اٹھائیے
یہ بھی نہ ہو تو زلف زرفشاں کی فکر میں — سونے کے تار کھینچئے چھلّے بنائیے
جو چاہے پیشہ کیجئے پیشے ہزار ہیں — شعر و سخن کی آپ نہ وقعت گھٹائیے
میرے قریب بیٹھے تھے اک مرد خوش مزاج — مینے کہا کچھ آپ شگوفے کھلائیے
بولے یہاں ہے "پیشۂ آبا سپہ گری" — لیکن تفنگ و تیر نہیں کیا بتائیے
ان شاعروں کو آپ ہی کچھ بھیک دیجئے — ان سائلوں کے آپ ہی نخرے اٹھائیے
یہ بے سُرے گویّوں کی صورت ہوں نغمہ سنج — اور بیٹھے ان کی تال پہ طبلہ بجائیے
ان کو سخن شناسوں کی حاجت نہیں ہی — مایا کے سانپ اُن کیلئے لا بٹھلائیے
لطفِ سرود اٹھانا ہی ہے آپ کو تو پھر — ان شاعروں کو چھوڑیئے مطرب بُلائیے
جب شاعروں نے شعر فروشی شعار کی — پھر آبروئے شعر رہی کیا؟ بتائیے

وہ شاعر غیور گئے، وہ سخن گیا
"بس ہو چکی نماز مصلّےٰ اُٹھائیے"

تاریکی

از جناب
شیر محمد اختر صاحب لاہور

"واعظ" اور "شیخ" یہ دو مقدس شخصیتیں طبقۂ شعرا میں ہمیشہ ہدفِ ملامت بنی رہی ہیں لیکن اب ان کی بدقسمتی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے یعنی ہمارے ادیب بھی اپنی نثر میں اِن پر لطیف طنز کر رہے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اول الذکر طبقہ حقائق سے مُنہ موڑ کر صرف تفریح کے لئے ان پر پھبتیاں کستا ہے۔ اور ثانی الذکر حضرات اسی پردے میں حقیقت کی نقاب کشائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ذیل کا دلچسپ افسانہ لطیف طنز اور ہجوِ ملیح کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اکثر باتیں ہیں بھی خدا لگتی ـــــ امید کہ قارئین کرام محترمی شیر محمد اختر صاحب کی شوخ نگاری سے کوئی خلش محسوس نہ کرینگے۔

ایڈیٹر

(٭)

آج میری کوٹھری پھر تاریک تھی۔ ہفتہ بھر بلیک آوٹ۔ مجھے تیل کی بچت ہوگئی، کس کو معلوم تھا کہ ان دنوں میرے پاس تیل کے لئے بھی پیسہ نہیں۔ آج محلہ بھر میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا برسوں کے بعد چراغ روشن ہوئے ہیں۔

کوٹھری مجھے زیادہ تاریک معلوم ہوتی تھی۔ میرے خیالات کی تاریکی اسے اور بھی تاریک کر گئی۔ نماز کا خطبہ مجھے یاد آرہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ جنگ کے موضوع پر وعظ تھا اور مذہبی کتابوں کی وہ پیشگوئیاں جو اس ہولناک جنگ کے بارے میں بیان کی گئی تھیں اُن کے الفاظ موجودہ ہولناک جنگ کی صحیح تصویر کھینچ رہے تھے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس مادی دنیا میں اگر حالات کا جائزہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ لیا جائے تو اس سے ٹھوکر کا اندیشہ ہوتا ہے۔ انسان تقدیر کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کا مقصد محض چند ٹھوکریں اور بس، ـــــ لیکن کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور زندگی ہے روح کی زندگی۔ جہاں آنکھ جھپکتے ہی سیکڑوں سالوں کی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ اس زندگی میں مادی اسباب سے بے نیاز ہوکر انسان وہ مقام حاصل کرسکتا ہے جسے "خدا کی نیابت" کہا جاتا ہے۔ خدا کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ عقلِ محض جن عقدوں کو حل نہیں کرسکتی وجدان انھیں لمحوں میں کھول کر رکھ دیتا ہے۔

مادی دنیا میں ایک ایسا قانون رائج ہے جس نے خدا کو بھی "ان دیکھا" بنا دیا ہے۔ ایک انسان لاکھوں انسانوں کی قسمتوں کا مالک بن کر انھیں انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ وہ آدمی جسے خدا کی بہترین صنعت کہلانے کا پورا حق حاصل تھا۔ ایک نیم بسمل اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ان ڈھانچوں کا گوشت پوست [illegible]

وہ عمل کیمیا کے ذریعہ سے سیم و زر میں تبدیل ہو کر نئی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یوں اس عالم کے معمل میں تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

مرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے جیتے ہیں۔ انھیں جینا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی قانونِ فطرت ہے۔ اور سُنا ہے کہ فطرت فیاض ہے وہ ایک دکھ کی تلافی راحت سے کر دیتی ہے۔ ایسے نیم مُردہ انسانوں کے لئے روح کی دنیا وہ معاوضہ ہے جو انھیں خون اور گوشت دیکر ملتا ہے۔ مادہ پرست انسان ہر عمل کی جزا اسی دنیا میں اور مادی شکل میں دیکھنے کا قائل ہوتا ہے۔ لیکن اس کا شکار کیا ہوا بسمل تڑپتا ہے۔ اور آنے والی زندگی کے رنگین خواب دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس کا گھلتا ہوا جسم اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کوئی لطیف شے ہو رہا ہے۔ تاکہ اسے روحانی دنیا میں اُڑتے ہوئے تکلیف نہ ہو اس کے جگر کا لہو جب آنکھوں سے بہنے لگتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ رنگین قطرات شرابِ طہور ہے جو اسے فردوس میں ملے گی ـــ اس کی رفیقۂ حیات اگر بلک بلک کر جان دیدے تو وہ اپنے آپ کو حور کا جائز وارث سمجھتا ہے۔ اسکے بچے دوائی کے بغیر مر جائیں تو وہ دوسری زندگی میں غلمان بن جاتے ہیں ـــــ یہ وہ انعامات ہیں جو زندہ رہنے کے صلہ میں اسے ملینگے۔ اس کی زندگی وبالِ جان سہی لیکن اس کی موت ابدی راحتوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

جنگ کی تباہ کاریوں نے تمام جہان کو ایک میدانِ جنگ بنا دیا ہے۔ دنیا کا سارا آرٹ منٹوں میں تباہ ہو رہا ہے۔ مادی دنیا کے پرستاروں نے اپنے لئے جن مقامات کو جنت بنایا تھا وہ بم کے ایک گولہ سے اجڑے ہوئے بیابان بن رہے ہیں۔ ان بسنی آبادیاں لاشوں کا شہر بن رہی ہیں۔ آسمان پر طیاروں کے بادل۔ اُن سے برستی ہوئی آگ۔ زمین پر موت کا سامنہ کھولے ہوئے توپیں۔ طیاروں سے چھلانگتے ہوئے آہنی انسان ـــــ تباہی کی دردناک [illegible]

واعظ نے بتایا کہ یہ مادی ترقی کا انجام تھا۔ یورپ مادہ پرست ہے اس نے زندگی کا مقصد ملک گیری سمجھا، وہ اعمال کی جزا اسی دنیا میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ترقی اس کے لئے موت ثابت ہوئی۔ انسان نے روحانی زندگی کو نظرانداز کر دیا۔ اس کا انجام جنگ! جنگ! جنگ!

کون تھا جو ان حقائق سے انکار کر سکتا تھا۔ سب کانپ اٹھے تھے۔ تقریر کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں تک جا پہنچا ــــ ہمارے ذہن خوف سے جلدی متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اجسام پر بچا کچا گوشت یہ وعظ لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبادت گاہوں میں صحت مند لوگ کم ہی نظر آتے ہیں۔ ــــ اپنے کلام کا یہ اثر دیکھ کر واعظ اور چہکے۔ اب وہ میدان کارزار سے آگے بڑھے۔ قیامت کا میدان اُن کے سامنے تھا۔ وہ دوزخ کا نقشہ اس کمال سے کھینچ رہے تھے گویا حضرت نے ساری عمر وہیں گذاری ہے یا جب دوزخ تیار ہوا تھا تو یہ بھی اسکے محکمہ تعمیرات میں شامل تھے ــــ دوزخ کے حصے، انسان کے اعمال کی سزا، پگھلتا ہوا لوہا جو دوزخیوں کے لئے پانی کا کام دیگا۔ جلا دینے والی آگ ــــ کرب و بلا کے مناظر۔ نفسی نفسی کی پکار ــــ ظالم نے حد کر دی۔ کاش وہ منظر نگاری کا یہ مرقع صفحۂ قرطاس پر رنگوں کی شکل میں پیش کر سکتا۔ یہ شاہکار ہوتا اور آرٹ کا ایک شہ پارہ ــــ

حاضرین رو رہے تھے۔ ان کے اعمال مختلف ڈراؤنی شکلوں میں اُن کے سامنے یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ اور وہ خود بخود اپنے اعمال کی سزا تجویز کر کے اپنا مقام دوزخ میں منتخب کر رہے تھے۔ ان کے آنسوؤں کا شاید یہی باعث تھا۔

روتے ہوئے سامعین اُس ساحر کی سحر بیانی کا مکمل معجزہ بن گئے تھے اس نے آہستہ آہستہ موضوع کو بدلا۔ وہ اب انسان کے کمالات کی طرف رجوع کرنے لگا۔ اس کے سامنے وہ بلند مقامات تھے جہاں صرف روح ہی جا سکتی ہے وہ مسجود ملائک بن گیا ــــ خدا کا نائب مقرر ہو گیا ــــ اس کی نگاہ اسقدر بلند تھی کہ آسمان سے آگے وہ دیکھنے لگا ــــ وہ چاہتا تھا کہ یورپ کے خستہ حال انسان، برباد بستیاں ــــ تڑپتے جسم یکایک اس وادی ایمن میں آجائیں جس کا نقشہ اب وہ حاضرین کے سامنے کھینچ رہا تھا ــــ آنسو خود بخود خشک ہوتے گئے۔

رومال، دستار کے پلو اور قمیص کے دامن آنکھوں کے قریب آنے لگے ــــ اس کے دل میں ہمدردی کا ایک چشمہ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ جس کے بہاؤ میں سارے لوگ بھی بہہ نکلے تھے ــــ وہ انسان جو چند منٹ قبل خوف کی ایک تصویر نظر آ رہی تھی اب رحم کا ایک دیوتا بن گیا ــــ زندگی کا جو مقصد اس نے بیان کیا وہ ان تباہ کاریوں میں نیا نظامِ عالم تھا۔ موجودہ جنگ کو ختم کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا خدا کی بادشاہت کا قیام۔ وجدان پر زندگی کی اساس قائم کرنا یہ مذہب کے آغوش میں ہی میسر آ سکتا تھا ــــ وہ خدا کا خلیفہ تھا اور خدا کی شہنشاہیت قائم کرنے والا ــــ اس کے سامنے بیٹھنے والے ہی وہ منتخب لوگ تھے۔ جو یورپ تو کیا تمام جہان کو ان ہولناکیوں سے بچا سکتے ہیں ــــ

خدا کا پیغام ازل سے یہی ہے کہ دنیا جنت بنی رہی۔ اسکو فردوس بریں بنانے کے لئے مادی اسباب کی ضرورت رہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ ضرورت مادی حالات کی وجہ سے اور زیادہ ہو گئی ہے۔ اسوقت جبکہ ایک ایک منٹ میں لاکھوں اور کروڑوں پونڈ کا بارود ہوا میں پھونکا جاتا ہو امن کا پیغام پہنچانے کے لئے بھی تو اسی نسبت سے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ جنگ میں بارود ضائع ہو جاتا ہے لیکن امن پیدا کرنے کے لئے جو پیسہ خدا کے نام پر دیا جائیگا وہ کبھی ضائع نہ ہوگا۔ اس کا معاوضہ آخرت میں خدا کے ان برگزیدہ انسانوں کو جنت کی شکل میں دیا جائیگا ــــ امیروں کے خزانے چونکہ ڈیفنس کے قرضہ کے بانڈ خریدنے میں صرف ہو چکے ہیں اسلئے غریبوں کی جیبوں پر خدا کا حق تھا ــــ دین ہمیشہ غریبوں سے شروع ہوتا ہے۔ اور غریبوں کو ہی دین کی ضرورت رہتی ہے ــــ آج ہماری خالی جیبیں بھی خدا کی راہ میں خالی ہو گئیں ــــ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آج میں دیئے کے لئے تیل بھی نہ خرید سکا ــــ جنگ کی حفاظتی تدابیر کا عمل درآمد ختم ہو جانے کے باوجود میری کوٹھری میں اسکا اثر باقی تھا، جنت میں میرا محل تو ضرور منور ہوگا اور پھر وہاں روشنی ابدی ہوگی ــــ میں اندھیرے میں بھی دیکھنے لگا ــــ نور میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا ــــ

گلی میں کوئی کہہ رہا ہے ــــ "یار سات دن تو مزے سے گذرے، تاریکی میں وہ کام ہو گئے جن کو کرتے ہوئے روشنی مانع تھی ــــ" اور وہ میری کوٹھری کے سامنے کھڑے یہ رازدارانہ باتیں کرتے رہے ــــ انھیں میری تاریک کوٹھری کے کھلے کواڑوں کی خبر نہ تھی ــــ میں ان کی باتیں سنتے سنتے تنگ آگیا ــــ کہاں وہ نئے نظام عالم کا قیام اور کہاں ان کی یہ بکواس ــــ میں کھانسا ــــ وہ چونکے "اوہ! منشی! آپ اندر تھے" ایک نے کھسیانہ ہو کر کہا ــــ "آپ کا بلیک اوٹ ختم نہیں ہوا"

میرا بلیک اوٹ کب ختم ہونے والا تھا ــــ ان کے لئے بلیک اوٹ کامیابی کا باعث بنا اور میں ــــ یہ سوچ رہا ہوں۔ روحانی دنیا بھی اگر تاریک ہی ہے تو پھر امان کہاں ملے گی ــــ

جنگ ہم سے کوسوں دور ہے مگر اس کا اثر ہندوستان میں محسوس کیا جا رہا ہے بچاؤ کے طریقے سوچے جاتے ہیں ان کی مشق کرائی جاتی ہے۔ میرے مالک نے بھی پورے زور شور سے حصہ لیا۔ کارخانہ میں اس نے اے آر پی کے افسر کو بلوا کر ہمیں لکچر سنایا۔ اسکے سامان کمروں کے دروازے سیاہ کاغذوں سے ڈھانپ دئے گئے۔ روشندان بند ہو گئے۔ باہر سے گھر ایک تاریک گنبد نظر آتا تھا مگر اندر بجلی کے فانوس [illegible] بھی لطف دیتے تھے۔ میں نے یہ سارا

کام خود اپنی نگرانی میں کرایا تھا۔ زندگی میں میرا یہ پہلی بار کا تجربہ تھا۔ شہر میں بلیک اوٹ تھا۔۔۔ سارا شہر اندھیرے میں ملبوس ۔۔۔ موٹروں اور تانگوں کی مدھم روشنیاں، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی دیو یا جن اندھیرے جنگل میں گھور رہا ہو۔۔۔ سارے شہر میں عجیب کیفیت سی طاری تھی۔ لوگ حیران تھے۔ مگر ان کے لئے یہ تجربہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ کتے بھونک رہے تھے شاید وہ بھی اس عجیب مشق پر حیرت کا اظہار کرتے تھے ۔۔۔ سرشام ہی تمام شہر بند ہو گیا ۔۔۔ ہمارے مالک سویرے گھر آ گئے۔ باہر یہ عالم تھا مگر ان کے بنگلے کے اندر رنگ ہی اور تھا۔۔۔ وہاں زیادہ رونق تھی۔ چھوٹے صاحبزادے نے کمرے کی بتیاں اچانک بند کر کے ریڈیو چلا دیا ۔۔۔ ریڈیو کے اندر ۔۔۔ مدھم روشنی تاریک کمرے میں بڑا لطف دے رہی تھی ۔۔۔ گانا ہو رہا تھا، گھر کے سارے لوگ ہنس ہنس کر داد دے رہے تھے ۔۔۔

میری طرح دوسرے ملازموں کی کوٹھریوں میں اندھیرا تھا۔۔۔ اگر ہم کمرے بند کر دیتے تو تیل کے دھوئیں سے دم گھٹنے لگتا اور پھر پولیس کا سپاہی ساری رات ہمارے محلے میں ہی گھومتا رہا۔ کلن نے ایک بار بیڑی جلانی چاہی تھی کہ سپاہی کی ایک ڈانٹ نے اسے دوبارہ ایسا کرنے جرأت نہ ہونے دی۔ ۔۔۔ نہ جانے سپاہیوں کو ہمارے محلے کی زیادہ فکر کیوں رہتی ہے ۔۔۔ امیروں کے گھروں کے طرف وہ جانے کا نام نہیں لیتے ۔۔۔

ہمارا مالک تو بالکل بے دین ہے۔ جنگ شروع ہونے سے اسکے وارے نیارے ہو گئے ہیں۔ ٹھیکے لے رہا ہے۔ اس نے کئی لاکھ روپیہ ڈیفنس بانڈ خریدنے میں لگا دیا ہے۔ وہ جنگ کی خبریں پڑھکر خوش ہوتا ہے۔ جہاز ڈوبنے کی خبر سے تو اسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس سے اور مال کی مانگ پیدا ہوگی۔ ٹھیکیداری کا کام بڑھیگا ۔۔۔ اس کے پاس پہلے ایک کار تھی۔ لیکن اب کئی کاریں ہیں۔ اب تو منیجر کو بھی ایک کار مل گئی ہے۔ کام کی جلدی میں وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے ۔۔۔ جنگ کی ہولناکیاں اس گھر میں آ کر عیش و عشرت کا سامان بن گئی ہیں ۔۔۔ جنگ کا طول پکڑنا اس کی قسمت کو تبدیل کر رہا ہے۔ بربادیاں اس کے لئے آبادی کا ذریعہ ثابت ہو رہی ہیں۔

مجھے نوکری ضرور مل گئی ہے لیکن اس بے دین کی باتیں سنکر رنج ہوتا ہے۔ مولانا کا وعظ کتنا عبرت ناک تھا۔ ایسے لوگوں کی ہوسناکیوں نے جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے ۔۔۔ ہوس کے پاؤں پھیلتے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جنگ بھی لانبی ہوتی جا رہی ہے ۔۔۔

ان ہوسناکیوں کا انجام ۔۔۔ لیکن میں اس منتخب جماعت کا فرد ہوں جس نے ان تباہ حالوں کو نئے نظام عالم کا پیغام دیا ہے۔ میں نے اپنی ساری پونجی چندے میں دیدی۔ جن بستیوں کو توپوں کے گولے موت کا شکار بنا رہے ہیں ان ہی اجڑی ہوئی آبادیوں کو ہمارے الفاظ کاغذ کا جامہ پہن کر خدا کی بادشاہیت کا نغمہ جانفزا سنائینگے ۔۔۔ ہم اندھیرے میں ہیں تو کیا ہوا۔ ہم نے اپنے بھائیوں کے لئے روشنی کی ایک ایسی لہر پیدا کر دی ہے جو انکو تاریکی میں راستہ دکھائے گی ۔۔۔ دنیا پھر نئے سرے سے امن و آشتی کی آماجگاہ بن جائے گی ۔۔۔ ہماری تاریکی دوسروں کے لئے روشنی ہوگی۔

مگر مولانا کے پاس بھی بنگلہ ہے۔ موٹر ہے۔ وہ ہفتہ میں ایکبار مسجد میں آتے ہیں ۔۔۔ ان کے دوست بھی وہی لوگ ہیں جو ہمارے مالک کی دعوتوں پر مدعو ہوتے ہیں ۔۔۔ ہمارے مالک نے سامانِ جنگ کے ٹھیکے سے کمایا ہے اور مولانا نے ۔۔۔ اپنی عمر وقف کر دی ہے۔ خدا کی بادشاہت قائم کرانے کے لئے، وہ خدا کے نائب ہیں ۔۔۔ ان کا بنگلہ ۔۔۔ موٹر ہمارے چندوں سے بنا ہے ۔۔۔ آخر انھیں اور کہیں سے تو نہیں ملتا ۔۔۔ آج کا چندہ ۔۔۔ اس سے پٹرول آئے گا ۔۔۔ ضروریات عیاذ ہو گئی ہیں۔ چیزیں مہنگی ہیں۔ آج کل رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہے ۔۔۔ خدا کے نعمات ان پریشان حالوں تک کیسے پہنچینگے۔ نیا نظام عالم ۔۔۔ یہ کیا ہے۔ جنگ میں ڈیفنس بانڈز کا روپیہ ہوا میں اُڑا دیا جاتا ہے اور ہمارا روپیہ ۔۔۔ ہم نے تو خدا کی راہ میں دیا تھا ۔۔۔ وہ دھوئیں میں اُڑ گیا۔۔۔ مگر اس دھوئیں سے تاریکی اور بڑھ جائیگی یورپ کے بناہ حال تو روشنی چاہتے ہیں ۔۔۔ ان کے لئے تو دو سال سے مسلسل بلیک اوٹ ہے۔ بم کے گولوں کا دھواں ان کی تاریک راتوں کو اور بھی سیاہ کر دیتا ہے ۔۔۔

مگر میرے پیسے ۔۔۔ ان سے ہفتہ بھر دیا جل سکتا تھا۔ میری اندھیری کوٹھری روشن ہو جاتی ۔۔۔ جنگ ۔۔۔ دھواں ۔۔۔ پٹرول ۔۔۔ قیامت۔ مسجد ۔۔۔ خدایا ڈیفنس بانڈز کی طرح ہمارے پیسے بھی ہواؤں میں اُڑ گئے ۔۔۔

ماں کا قاتل!

ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ

از جناب عزیز الدین صاحب ضیا قریشی اکبرآبادی ٹائپسٹ

وہ مدہوش ٹھوکریں کھاتا ہوا تیزی سے قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا
— کہاں ؟ اپنی ماں کے پاس...... اس کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے
...... لیکن اس کا دل اس کو دھتکار رہا تھا — "یہ کیا کر رہے ہو۔ سریش !
تم اپنی ماں کو قتل کر سکو گے ؟ تم بھول گئے کہ تم ماں کو کتنا پیار کرتے تھے۔ وہی تو یہ
ماں ہے جس نے تمھیں پال پوس کر بڑا کیا۔ جس نے راتوں جاگ کر تمھاری نگہداشت کی
اپنے آپ پھٹے کپڑے پہنے اور تمھیں اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ محنت کی اور تمھیں لکھایا
پڑھایا........ ان سب کے بدلے وہ تم سے کچھ نہیں چاہتی — ہاں اگر
چاہتی بھی ہے تو صرف یہ کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ جہاں بھی رہو سُکھی رہو —
کیا تم بھول گئے وہ رات جب تمھیں ایک سو پانچ ڈگری بخار تھا...... وہ
تمام رات تمھارے پاس بیٹھی رہی تھی ...... پلک تک نہ جھپکائی تھی.....
اور تم اس کا یہ بدلہ دے رہے ہو — کچھ تو سمجھو۔ سریش ! یہ مانا کہ جس نے
تم سے سر، لانے کو کہا ہے وہ خوبصورت ہے۔ ہنس مکھ ہے۔ مالدار ہے۔ اور
تمھاری شریک حیات بھی ہے — لیکن ایسی شریکِ حیات کس کام کی جو تمھاری
ماں کی دشمن ہو اور دُنیا میں تمھاری سب سے زیادہ رفیق کو تمھارے ہی ہاتھوں ختم
کرائے........ کیا تم ایک بار پھر غور نہ کرو گے۔ سریش ؟"

اس کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے اور...... اس نے اپنے دل
میں کہا "میں ہرگز خون نہ کروں گا" لیکن وہ چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے
دیکھا کہ ایک نئی روشنی کے دلدادہ اپنی شریمتی جی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے
جا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں جیسے سانپ سا لوٹ گیا ہو۔ اس کو اپنی
پریما کا خیال آیا — اس کا سرو کو شرما دینے والا قد۔ نازک لچکتا ہوا جسم۔
سُرخی مائل تازہ گلاب کا سا رنگ۔ گھنے گھنے ریشم ایسے بال۔ کمان کی شکل کے
پتلے پتلے گلابی ہونٹ۔ پیارا پیارا نقشہ۔ دلآویز برق پاش تبسّم — سبھی کچھ یاد
آیا۔ وہ پھر ڈگمگایا "میں اپنی پریما کی خاطر ہر کام کر سکتا ہوں۔ اس نے میری محبت
کی بھینٹ مانگی ہے — انسان اپنے آرام کے لئے سب ہی کچھ کرتا ہے۔ تواریخ
اس بات کی شاہد ہیں کہ اس نے

ایک ہی کا خون کر رہا ہوں"

وہ گھر آیا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ ماں پلنگ پر پڑی ہوئی
تھی شاید بخار تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ الماری میں سے چھُری
نکالی اور ماں کے کمرے میں آیا — اس نے چھری کی طرف دیکھا......
وہ بجلی کی طرح چمک رہی تھی — پھر اس نے ماں کی طرف دیکھا......
.... اس کا مُنہ کھلا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی شاید وہ اپنے بیٹے کو آرام سے دیکھ
کر خوش ہو رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر جھجکا........ لیکن ہاتھ بجلی کی طرح اوپر سے
نیچے گرا — ایک چیخ نکلی اور خون کے فوارے چھوٹنے لگے........ اس کی
ماں اس کے سامنے مُردہ پڑی تھی — وہ مسکرایا......... وہ محبت کی
بھینٹ چڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ خوشی خوشی کٹا ہوا سر ہاتھ میں لئے چلا جا رہا تھا۔ وہ کشادہ راستے
چھوڑ کر گلیوں میں سے گذر رہا تھا — وہ اپنی "پریما" کے پاس ایک لمحہ میں
پہنچنا چاہتا تھا۔

گلیوں میں اندھیرا تھا۔ وہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تیز قدم بڑھائے
چلا جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا.......... اب اس کو کوئی نصیحت کرنے
یا روکنے ٹوکنے والا نہ تھا........ اب وہ اپنی مرضی کے موافق ہر کام کر سکتا
تھا...... اب وہ اپنی پریما کا ہر حکم بغیر کسی عذر کے بجا لانے کے لئے تیار تھا
— وہ سوچ رہا تھا "میں جاتے ہی اس سر کو "اُس" کے پیروں پر رکھ دوں گا
.... اور وہ......... دیکھتے ہی مجھے گلے سے لگا لیگی...
اس کو اطمینان ہو جائیگا کہ اب ماں کا کھٹکا نہیں۔ پھر کچھ دن بعد ہم...
........" اچانک اس کو ٹھوکر لگی......... ماں کا کٹا ہوا سر
ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا......... لیکن کٹے ہوئے سر سے
آواز آئی — "ہائے بیٹا ! تم گر پڑے...... کہیں چوٹ تو نہیں لگی"

ناخدائے سخن تاج الشعراء

کلامِ فصیح

فصیح العصر حضرت نوح ناروی

جنابِ نوح ناروی مدظلہ العالی نے سالنامہ "مشہور" کے لئے ذیل کی پاکیزہ غزل مرحمت فرمائی ہے۔ ہر شعر میں جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیںگے آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے آورد کا پتہ نہیں ملتا۔ یوں سمجھئے ان اشعار میں فصاحت و بلاغت کا ایک دریا بہ رہا ہے یوں تو غزل کے تمام اشعار مرصع ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ہمیں یہ شعر بہت پسند آیا ؎

ہزار بھیس ہیں کس میں تجھے تلاش کروں ؎ بتا یہ اے مرے بہروپئے زمانے کے

یقین ہے کہ دلدادگانِ سخن یہ غزل پڑھ کر بہت ہی محظوظ ہونگے۔

ایڈیٹر

مجھے اُٹھاتے ہیں یوں پارسا زمانے کے
کہ جیسے ہوں وہی مالک شراب خانے کے

کہیں فسوں کے کرشمے کہیں فسانے کے
تصرفاتِ خصوصی ہیں یہ زمانے کے

وفا سے کام نہ لیں گے حسیں زمانے کے
ڈھلے ہوئے ہیں یہ سب ایک کارخانے کے

جو رُت پھرے تو ہماری نظر میں کیوں نہ پھریں
بھرے بھرے خم و ساغر شراب خانے کے

کسی کا عشق چھپائے سے چھپ نہیں سکتا
پکار اُٹھتے ہیں الفاظ اس فسانے کے

وہ روزِ عید ہے روزِ جزا اُسے نہ کہو
ملیں گے حشر میں بچھڑے ہوئے زمانے کے

جہاں جہاں ہوں طلبگارِ حق یہاں آئیں
کہ قفل کھُل گئے اب سرمدی خزانے کے

رہیں گے ہم بیں تو یہ بھی ہم نے جان لیا
وہی قدیم دُعاگو شراب خانے کے

کہاں سے آگئے کیونکر ملے اب اس کو نہ پوچھ
مرے فسانے میں فقرے ترے فسانے کے

ہزار بھیس ہیں کس میں تجھے تلاش کروں
بتا یہ اے مرے بہروپئے زمانے کے

وہ آئے میری طرف چاند کس طرف نکلا
بہت دنوں میں پھرے دن غریب خانے کے

دکھادے اے قدر انداز دل کو یہ بھی کمال
چلے نہ تیر پر چھے اُڑیں نشانے کے

جُدا جُدا وہ بٹے یاد کرنے والوں میں
الگ الگ جو ورق تھے مرے فسانے کے

چلے ہیں جانبِ میخانہ اس اُمید میں ہم
کہ باکمال ملیں گے وہیں زمانے کے

طواف کرنے کو قبلے سے ابر اُٹھا ہے
یہ مرتبے ہیں ہمارے شراب خانے کے

کہیں فنا ہو نہ سرمایۂ وفاداری
بنے ہیں چور محافظ اب اس خزانے کے

وہ لائے جاتے ہیں محشر میں روبکاری کو
گڑے ہوئے تھے جو مُردے کسی زمانے کے

وہ پھر بہائیں مرے دل میں حسرتوں کا لہو
نقوش ہو گئے دُھندلے نگار خانے کے

کبھی یہ کہتے ہیں ڈھائے ہیں ہم نے ظلم و ستم
کبھی وہ کہتے ہیں کوتک ہیں یہ زمانے کے

سمجھ میں جب نہیں آتے تو ہم سمجھتے ہیں
شرابیوں سے مسائل شراب خانے کے

بیانِ کشتی و طوفاں کا مشغلہ دن رات
جنابِ نوح ہیں شاید اُسی زمانے کے

سالنامہ مشہور کیلئے





قندِ پارسی

پیمانہ در پیمانہ ہست

ہم جناب آغا محشر شیرازی مدیر "برق" بمبئی کے ممنونِ کرم ہیں کہ انھوں نے بادہ شیراز کا ایک وجد آفریں جام قارئین "مشہور" کو پلا ہی دیا۔ یہ اسی عجمی خُم کی مے دو آتشہ ہے جو شاہنشاہ اکبر کے زمانہ میں عرفی نے پیش کی تھی۔ افسوس ہے کہ فارسی کا مذاق اُٹھتا جاتا ہے ورنہ آغا محشر صاحب کی بھی وہی قدر و منزلت ہوتی جو عرفی شیرازی کو حاصل تھی۔ تمام اشعار پُر کیف ہیں، اور لطفِ زبان مستزاد۔ امید کہ اہل سخن دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائینگے۔

ایڈیٹر

بادۂ عشق آفریں پیمانہ در پیمانہ ہست
صحبتِ ساقیِ من میخانہ در میخانہ ہست

تا کجا ایں سلسلہ جُنبانیِ حُسنِ ازل
جلوۂ جانانہ ام، جانانہ در جانانہ ہست

التفاتِ تو ببزمِ خویشتن با دیگراں
از برائے خویشتن افسانہ در افسانہ ہست

قصۂ فرہاد و شیریں وحشتِ لیلیٰ و قیس
حاصلِ دیوانگی دیوانہ در دیوانہ ہست

بے وصالِ تو بیا قلبِ حزینم را ببیں!
در خراباتِ جہاں ویرانہ در ویرانہ ہست

تا بکے تاریک بزمِ عاشقاں شمعِ حرم!
حسرتِ جانسوزِ تو، پروانہ در پیمانہ ہست

محشرِ شاعر تُرا با واعظاں باشد چہ کار
کعبۂ اہلِ خرد بتخانہ در بتخانہ ہست

افسانہ

ایکادشی

از جناب نادم صاحب سیتاپوری

راجن پور کے زمیندار گھنشیام سنگھ بڑے خاندانی جنوار ٹھاکر تھے۔ غدر کے زمانے میں اُن کے دادا نے کئی لڑائیوں میں نواب برجیس قدر بہادر کا ساتھ دیا تھا جس کی پاداش میں ان کے بہت سے گاؤں گراؤں "ضبط کر لئے گئے تھے اور باغی ہونے کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "بلیک لسٹ" میں آ گیا تھا!

راجن پور اور اس کے آٹھ دس پرشے بڑی مشکل سے بچ سکے تھے جن کا انتظام گھنشیام سنگھ کے باپ رام سنگھ کے نام سے ہوا تھا! جو رام سنگھ کی نیک چلنی۔ خوش سلیقگی اور جانفشانی کی وجہ سے ان کے سارے کنبہ کے باعزت زندگی کے لئے کافی تھے ــــ

رام سنگھ جتنا معاملہ فہم منصف مزاج۔ سلیقہ شعار آدمی تھا۔ گھنشیام سنگھ اتنا ہی بدچلن۔ بدسلیقہ اور بدکردار انسان ثابت ہوا۔ باپ دادا کی جمع کی ہوئی گاڑھی کمائی بڑی بے دردی سے لٹانے کے بعد زمینداری پر بھی قرضہ ہو چکا تھا۔ سات ہل کی سیر گھٹتے گھٹتے چار ہی ہل کی رہ گئی! بڑے بڑے سرسبز اور گھنے باغ کوڑیوں کے مول بیچکر کٹوا دئے! پھر بھی گاؤں کے پرانے اور خاندانی چھتری ہونے کی وجہ سے ان کی چوپال میں ہر وقت دس پانچ آدمی جمع رہتے اور برابر ایک آدھ چلم بھری ہی رہتی! اکثر ٹھاکر اونچے لہجہ میں غدر کے زمانے کے سنے سنائے واقعات اور جرمنی کی پرانی لڑائیوں کے قصے اسطرح بیان کرتے جیسے میدان جنگ میں وہ خود موجود تھے! "مہابھارت" کے واقعات کو سچ ثابت کرنے کے لئے اور "ارجن" کے پھینکے ہوئے "بان" کے وجود پر آجکل کے "بموں" اور ہوائی جہازوں کی مثالیں پیش کر کے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی! اپنی گھنی اور لمبی لمبی مونچھوں کو سنوارتے ہوئے وہ کہنے لگتے "اور کیوں نہ ہو وہ اوتاروں کے کرتب تھے یہ ملنشوں کے بکھیڑے!

گو ان کے یہاں کوئی باقاعدہ پنچایت قائم نہ تھی لیکن انکی زمینداری کے تمام مقدمے معاملے اسی چوپال میں فیصل ہوتے جنکو نافذ کرانے کے لئے انھیں کئی بار فوجداریاں کرنی پڑیں۔ بہت سے مقدمہ لڑنا پڑے! اور آخرکار انکی ہیبت چاروں طرف قائم ہی ہو کر رہی! ان کے اثر اور اقتدار سے پاس پڑوس کے سب لوگ دبتے تھے! خصوصًا چھوٹی قوم والے تو ان کے نام سے اس طرح ڈرتے تھے جیسے قصائی سے گائے یا پولیس کے ظالم عمال سے آبرودار!

گھنشیام سنگھ تھے تو پرانے پاپی۔! لیکن بڑھاپے میں ان کی حرص ہوس اور بھی بڑھ گئی تھی! جوانی میں نہ جانے کتنی معصوم اور بے گناہ زندگیوں سے وہ کھیل چکے تھے! جس کو تاک لیتے اس کا آبرو بچانا مشکل ہو جاتا! انسان کی سیاہ کاریاں ذات پات، مذہب و ملت میں کوئی امتیاز نہیں کرتیں! یہی حال ان کا تھا ان کے پاپ کے آگے شودر تو شودر بڑے بڑے چھتری سرنگوں ہو چکے تھے!

نہ جانے کتنے دکھی دلوں کی پکار آسمان کی بلندیوں سے ٹکرا چکی تھی۔ لیکن جب تک دعاؤں کے قبول ہونے کا وقت نہیں آتا آہوں کی تاثیر کام نہیں دیتی! ٹھاکر کے پاپی جیون کے "آنند دوار" ابھی تک کھلے تھے۔ ان کی گناہوں کی زندگی ایک بھی ہچکی نہ لے سکی تھی۔ انسان کا ضمیر ہے کہ اپنی برائیوں کو بھلائی ثابت کرنے کے لئے مثالوں اور لفظوں کے حیلے بہانے ڈھونڈھتا رہے! مصیبت کی گھڑیوں میں اُسے اس جنم کی کرنی یاد نہیں آتی۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اپنے اگلے جنم۔ کے کئے کی سزا مل رہی ہے! یا آئندہ آنے والی مصیبتوں کی تخفیف کے لئے یہ مصیبتیں آئی ہیں! گھنشیام سنگھ نے بھی اپنی دولہن کے مرنے پر۔ یہی سونچا! ایک لڑکی چھوڑ کر مرنے والی اس کے گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے چراغ کر گئی تھی! لڑکی کا سہارا ہی کیا! پرایا دھن! پنچھی پکھیرو کی طرح گھڑی دو گھڑی بسیرا کر کے چلی جائے گی! وہ اسے "بھگوان کی اچھا" ہی کہکر من سمجھا لیتے! انھوں نے اپنا دوسرا بیاہ بھی نہیں کیا! کبھی بھول کر بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ جو کچھ ہوا ہے میرے ہی جیون کے کئے کا پھل ہے۔

گھنشیام سنگھ نے اپنے باپ دادا کی نیکیوں میں کوئی حصہ نہیں بٹایا تھا لیکن ان کی لڑکی رودا اپنے باپ کی پوری طرح ورثہ دار بنی ہوئی تھی! سارے گھر میں آنکھیں کھولکر اس نے پاپ ہی پاپ دیکھا تھا۔ اپنے پاپی باپ کی سیاہ کاریوں اور بدچلنیوں کی بہت سی کہانیاں ادہر اور ایکھ کے کھیتوں میں چپکے چپکے اس نے اپنی ان سکھی سہیلیوں کی زبانی سُنی تھیں جنکے ساتھ ہر صبح و شام وہ "جنگل" جایا کرتی تھی!

دیہات کی لڑکیاں نیم کے درخت کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں پھر ایسے ماحول میں رہ کر جہاں ہر وقت اور ہر گھڑی سینکڑوں جوانیوں کے بننے بگڑنے کے

قصے بیان کئے جاتے ہوں۔ اگر جوانی گنگا جمنا کے سیلاب کی طرح نہ آجائے تو کون تعجب کی بات ہی!

"رودا" کتنی جلدی نوجوان ہو کر بھرپور جوان ہو گئی۔ گھنشیام سنگھ اسے بالکل نہ محسوس کر سکے! باپ بیٹی دونوں غافل اور انجان مسافروں کی طرح چپ چاپ اپنی اپنی راہ چلے جا رہے تھے۔ جن کو ایک دوسرے کے حال کی کوئی خبر نہ تھی! گھنشیام سنگھ نے "نوجوان رودا" کے لئے ابھی تک کسی بر کی بھی تلاش نہ کی تھی۔ ان کی نگاہوں کی اٹھارہ بیس سال کی پہاڑ جیسی جوان لڑکی ابھی دودھ پیتی بچی ہی تھی! کبھی کبھی جب ان کی چوپال میں گاؤں کی جوان لڑکیوں کے شادی بیاہ کے قصے چھڑ جاتے تو وہ اپنے "ناریل" کے حقے سے سلفے کے دو چار کش کھینچکر ٹھنڈی سانس بھرتے" ہاں اب دو چار سال میں مجھے بھی اپنی رودا کا کوئی بندوبست کرنا ہی ہوگا"

کتنے برسوں سے وہ یہی کہتے چلے آرہے تھے شاید دو چار برس سے ان کا مطلب چالیس پچاس سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ نوجوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنے پر سب سے زیادہ مضبوط استدلال وہ یہ پیش کرتے "کہ کچھ رودا مجھ پر بھار تو نہیں ہے" خوشحال مقدم۔ جیون پاسی اور رستم بقال ان کی ہاں میں ہاں ملاکر اکثر تائید اور تائید مزید کے اہم فرائض انجام دیتے! جیسے" ہاؤس آف کامنز" میں کسی خاص معاملہ پر لمبی چوڑی تائیدیں کی جا رہی ہوں۔ ٹھاکر کی آنکھیں چوپال کے کونے کونے میں ناچنے لگتیں۔ گویا ہر در و دیوار سے اس کے اس نیک خیال کی تائید ہو رہی ہے۔

جب کسی کے دانت کے نیچے مردار دب جاتا ہے تو مشکل سے چھوٹتا ہے بڑھاپے میں تو حرص و ہوس کی آگ اور بھی دہک اٹھتی ہے۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ کی بدکرداریاں بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ نکھر چکی تھیں! بیتم چماران کا خاندانی "ہرواہا" تھا۔ اس کا باپ بھی" اوگاہی" کی دو تین قسطیں لیکر بیاج میں زندگی بھر ہل جوتا کیا۔ اب بچپن سے بیتم بھی اپنے باپ کے کئے کی سزا بھگت رہا تھا! بچپن سے کام کاج کرتے کرتے وہ ٹھاکر کے کنبہ میں ہل جل گیا تھا۔ ٹھاکر اسے مانتے بھی بہت تھے انھوں نے اسے" دو قسطیں" دیکر پاس ہی کے ایک گاؤں میں سورج چمار کی لڑکی "مرلیا" سے اس کا گٹھ بندھن کرا دیا تھا جو اپنی خوبصورتی اور" سندرتا" میں پاس پڑوس میں بہت مشہور لڑکی تھی! لوگ کہتے تھے کہ یہ چمار کی نہیں کسی چھتری یا برہمن کی لڑکی ہے۔

رودا اور بیتم قریب قریب ہم سن تھے، دونوں ساتھ ہی کھیلے کودے۔ اور ساتھ ہی جوان ہو گئے! رودا بچپن ہی سے بیتم کو چاہتی۔ مگر بیتم نے کبھی بھول کر بھی یہ نہیں بھلایا کہ وہ ایک نیچ ذات چمار ہے۔ وہ رودا کو ہمیشہ اپنے مالک کی لڑکی اور اونچی ذات کی کنیا کی طرح مانتا تھا۔ رودا نے کتنی بار اپنے "نسوانی وقار" کو کچلکر اس کے مردانہ جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی! آنکھوں کے اشاروں سے کتنی ہی بار سمجھایا۔ لیکن وہ ایکمر تبہ بھی اس کا مطلب یا تو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی!

غریب کی نگاہوں میں پرائی آبرو کی کتنی لاج ہوتی ہے۔ بیتم کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ اس نے رودا کی ایک بات کا بھی جواب کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیا۔ نہ جانے کتنی خاموش اور سنسان تنہائیوں میں وہ اپنے مردانہ جذبات سے لڑائی لڑ کر نکل آیا........ اور رودا....... اسے پاپی نہ بنا سکی!

وہ خوب سمجھتا تھا کہ جس طرح ایک عورت اپنی عزت و آبرو بچانیکی ذمہ دار ہے ویسے ہی مرد بھی! پاپ کی سزا عورت اور مرد دونوں کیلئے یکساں ہے! وہ استقلال اور پامردی کے ساتھ اپنے مضبوط ارادوں پر اٹل رہا۔ اور رودا اسے برابر پاپ کی دہکتی ہوئی آگ میں جلنے کے لئے اشارے ہی کرتی رہی۔

جب سے" مرلیا" بیتم چمار کے گھر بیاہ کر آئی تھی۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ بیتم پر پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے! بات بات پر ڈانٹنا، گالیاں دینا بالکل بند ہو گیا تھا۔ کہاں تو مہینوں اور برسوں اس کی طرف راستہ بھی نہ نکلتے! اور اب دن میں دو دو تین تین مرتبہ خود بیتم کو بلانے جاتے۔ مرلیا اُن کے بلا کھانسے کھنکھارتے درانہ چلے آنے پر لمبا سا گھونگھٹ نکال کر دیوار کی طرف مُنہ پھیر کر بیٹھ جاتی! ٹھاکر کے بہت پوچھنے گچھنے پر بھی وہ کوئی جواب نہ دیتی! اتنے دنوں میں اس نے کبھی آنکھ بھر کر بھی ان کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی!

کاتک بونے کا زمانہ قریب تھا۔ ربیع کی فصل بونے کے لئے کھیتوں کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں! کچھ رات گئے سے سب لوگ، ہل لیکر کھیتوں میں چلے جاتے۔ اور پھر دس گیارہ بجے تک کھیت جوتتے رہتے! بیتم چمار بھی آدھی رات سے مرلیا کو اکیلا چھوڑ کر کھیت چلا جاتا اور اونچی آواز میں" برہے" کے بول دیہاتی لہجہ میں گا گا کر لوٹتی ہوئی رات گذار دیتا! کبھی کبھی ٹھاکر بھی اتنی ہی رات کو ٹہلتے ہوئے پہنچ جاتے اور کھیت کی مینڈ پر کھڑے کھڑے حقے کے دو چار کش کھینچکر اُلٹے پاؤں واپس آجاتے!

ایک چاندنی رات میں جبکہ سارا گاؤں سو رہا تھا۔ کبھی کبھی پاس کے کھیتوں سے بیلوں کے ہنکانے کی آوازیں آجاتی ہیں۔ ٹھاکر اپنے گھر سے نکل کر دبے پاؤں بیتم کے جھونپڑے میں چلے گئے! بیتم چمار تھوڑی ہی دیر پہلے ہل لیکر کھیتوں کی طرف جا چکا تھا۔" مرلیا" ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑی ہوئی جاگ رہی تھی!

"پیتم" قریب پہونچکر انھوں نے دھیرے سے پکارا!

"مرلیا" گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور لمبا سا گھونگھٹ نکالکر چارپائی سے اُٹھنا ہی چاہتی تھی کہ ٹھاکر خود اس کے برابر بیٹھ گئے! وہ سکتہ میں رہ گئی!

"مرلا" کیا پیتم گیا!" انھوں نے پیار کے لہجے میں "مرلیا" کو مرلا بناتے ہوئے پوچھا!

مرلیا نے پلنگ سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمت کر کے جواب دیا۔

"کھیت گئے ہیں .... چاچا"

"اُٹھتی کیوں ہے بیٹھ جا۔"! ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھال لیا۔

مرلیا نے بڑی ہمت کی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے! اس کے قدم اٹھائے نہ اُٹھ سکے۔ زبان رک گئی! بدن کانپنے لگا۔ ٹھاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ اولٹتے ہوئے کہا!

"یہ گھونگھٹ کیوں نکالے ہو؟"

اس کا چاند جیسا خوبصورت چہرہ چمکنے لگا! جیسے ساون بھادوں کی اُجالی راتوں میں بادل کا کوئی ٹکڑا ہٹ جانے سے ماہتاب چمکنے لگتا ہے! اس کی آنکھیں نہ اُٹھ سکیں۔

ٹھاکر کچھ زیادہ بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ان کی چوپال کے پاس سے چند کتوں کے ایک ساتھ بھونکنے اور آدمیوں کے بھاگنے کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل آئے۔ لیکن چلتے چلاتے بھی انھوں نے "مرلیا" کا مُنہ چوم ہی لیا۔

غریب اور مجبور عورت کی آبرو ہی کیا! پھر چار دن کی بیاہی دیہاتی لڑکی تو دو حروف بھی زبان سے نہیں نکال سکتی! باقی رات مرلیا نے رو رو کر اسی سوچ میں گذار دی! گھڑی بھر کو اسکی آنکھ نہ لگ سکی! ذراسی آہٹ میں ایسا معلوم ہوتا جیسے ٹھاکر کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ اور زبردستی اس کا مُنہ چومے لیتے ہیں۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر آج کی بات پیتم سے کہتی ہے تو نہ جانے وہ کیا خیال کرے۔ ایشور جانے اسکے خیال میری ہی طرف سے بدل جائیں یا غصہ میں وہ کوئی ایسی بات کر بیٹھے جس سے زندگی بھر پچھتانا پڑے! پاپی کی زبردستیوں سے آبرو کے لالے پڑے ہوئے ہیں! موذی مر سکتا ہے تو کسی جتن ہی سے! اسکے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے!

صبح ہوتے ہوتے وہ یہی فیصلہ کر سکی کہ آج رات کی ایک بات بھی وہ پیتم سے نہ کہے گی!

دوپہر کے قریب پیتم گھر واپس آیا۔ مرلیا کو دیکھ کر اسکے جیون میں بسنت کی طرح ہریالی آگئی۔ دو چار ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اس نے روٹی کھائی۔ اور ٹھاکر کے یہاں صبح کیلئے گیہوں لینے کو چلا گیا! کیونکہ سویرے گیہوں بونے تھے!

انگنائی میں سفید ساری باندھے ہوئے رودا بیٹھی تھی۔ اسکے سامنے بھنڈی کی ترکاری رکھی ہوئی تھی جسکو وہ کاٹ رہی تھی! پیتم کو دیکھ کر وہ مسکرا گئی۔

"صبح کو گیہوں بونے کے لئے ...... تولدو" اس نے نیچی نگاہیں کئے ہوئے رودا سے کہا۔

"اور جو نہ تولوں" مسکراتی ہوئی وہ بولی۔

تو میرا کون سا گھاٹا ــــ نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ وہ بھی ہنس دیا۔

رودا ہنستی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ "اچھا لو"

سامنے کی سہ دری میں کھاریاں بنی ہوئی تھیں پاس ہی بانسوں کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رودا سیڑھی پر چڑھنے لگی۔ پیتم نے منع کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی! بانس کے ایک ایک ڈنڈے پر چڑھ کر وہ سیڑھی کو ہلا رہی تھی اور اور پیتم کی طرف دیکھ کر مسکراتی جاتی! نہ جانے سیڑھی کی کس کیل میں اسکی ساری اولجھ گئی اور وہ دھڑام سے نیچے آرہی۔!

پیتم نے لپک کر اسے اُٹھا لیا۔

میں منع کرتا تھا ...... چوٹ تو نہیں لگی رودا! اس نے پوچھا۔

رودا نے دونوں باہیں اسکے گلے میں ڈالدیں! اور اپنا سر اسکے کاندھوں پر ٹیک کر اسے بھینچ لیا! اسکے روئیں روئیں سے چنگاریاں برس رہی تھیں! پیتم گھبرا اُٹھا! وہ ڈر رہا تھا کہ آگ پھونس میں لگ چکی ہے کہیں شعلے نہ بھڑک اُٹھیں۔! اس کا دم گھٹنے لگا۔! لاکھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن رودا کے ہاتھوں میں بلا کی قوت آگئی تھی اسکے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی!

"کیا کر رہی ہو رودا ــــ ٹھاکر مجھے اور تمھیں دونوں کو مار ڈالینگے!"

"مگر اب میں کب زندہ ہوں" اس نے جواب دیا!

اچھا آج نہیں ...... پھر کبھی! پیتم نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا!

"پھر کب" رودا نے پوچھا

کاتک بولوں ــــ ایکادشی کو!

رودا نے اس کا مُنہ چوم لیا۔ "کہاں پیارے"

"یہیں چوپال میں کچھ رات گئے!" پیتم کا کلیجہ دھک دھک ہو رہا تھا!

"نسوانی وقار" کو خاک میں ملاتے ہوئے رودا کئی بار اپنے آپے سے گذر گئی اور بمشکل پیتم پیچھا چھڑا سکا۔

دس پانچ دن کے ہیر پھیر سے ٹھاکر کچھ رات گئے پھر ایک دن پیتم کے یہاں پہونچ گئے! تھوڑی ہی دیر پہلے پیتم ہل لیکر کھیت جا چکا تھا۔ مرلیا اسکے

جانے کے بعد سے جاگ رہی تھی! ٹھاکر کے پاؤں کی آہٹ پہچان کر وہ چپ چاپ پلنگ کے نیچے کھڑی ہو گئی! ٹھاکر نے آتے ہی اس کا لمبا سا گھونگھٹ اُلٹ دیا اور ہاتھ پکڑ کر کھاٹ پر بٹھا لیا۔!

مجھ سے بھی ڈرتی ہو مرلا؟ انھوں نے کہا!

"چاچا......" وہ کچھ زیادہ نہ کہہ سکی! اس کا گلا بھنچ گیا۔ زور زور سے سینہ اُچھلنے لگا۔

ٹھاکر نے اپنی مضبوط باہوں سے بھینچتے ہوئے کہا!

"تم کتنی سندر ہو مرلا"!

مُرلیا نے بہت جی کڑا کر کے اپنے چہرہ پر مسکراہٹ بُلا ہی لی۔ گویا اب وہ راضی تھی!

ٹھاکر نے ذرا اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کئی مرتبہ اسکے ہاتھ دبائے اور اسے کھینچکر اپنے برابر لٹا لیا!

"ٹھاکر میری لاج اب تمھارے ہاتھ ہے...... اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو میں کہیں کی نہ رہونگی! اس نے ہمت کر کے اتنا کہہ ڈالا!

"نہیں.... نہیں مرلا! تم اطمینان رکھو! ہماری بھی تو عزت ہے تم تو پنچوں کو ایک آدھ کھانا اور دس بیس روپیہ جرمانہ دیکر پھر برادری میں مل سکتی ہو۔ مگر میں تو کہیں کا نہ رہوں گا اگر کسی نے جان لیا! ٹھاکر نے جوابدیا!

"ہاں یہی کہتے ہیں اور بس ــــ!"

تو پھر آؤ.........نا....!

بڈھے نے اظہار مطلب کر ہی دیا۔

مگر اتنی جلدی کاہے کی ٹھاکر.... پھر کسی دن! وہ بولی۔

"اور آج بھی تو موقع ہے" ٹھاکر نے کہا!

نہیں تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ آج چھوڑ دو! اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکنے لگی! ٹھاکر اس کا مطلب سمجھ گئے!

"اچھا یہ بات ہے تو پھر کس دن؟

"بس پرسوں ایکادشی کے دن"

"ہاں تو میری چوپال میں دس گیارہ بجے رات!"

مُرلیا نے وعدہ کر لیا۔ ٹھاکر تھوڑی دیر بیٹھے رہے اور پھر اُٹھکر چلے گئے۔

کاتک کی ایکادشی "ڈٹھونون" کے تہوار کی وجہ سے بہت مشہور دن ہوتا ہے۔ موسمی اور فصلی تہواروں میں اس دن سنگھاڑے اور ایکھ کا نیا کیا جاتا ہے اور کئی دیوتا کی پوجا چڑھائی جاتی ہے! آج کی "ایکادشی" بڑی ہنگامہ خیز بن گئی تھی۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے گھر بھر میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے "انتظار" کے دیوتا خود آگئے ہیں! گھنشیام سنگھ ہیں کہ جبڑے کی کیلیں تک نکلوا دینے پر تلے ہیں! رودا ہے کہ دم بدم نئی نئی ساری پہنکر بدل رہی ہے! سرسوں کے تیل سے اس کا سر تر بتر ہو رہا ہے! ٹھاکر نے سویرے اُٹھتے ہی کہدیا کہ آج "گنگا پور" میں کتھا ہے وہ کچھ دن رہے سے چلے جائینگے! رودا نے بیتم چمار کے آتے ہی کہا:۔

"آج ایکادشی ہے نا...... بیتم؟"

"ہاں آج تو ایکادشی ہے"! بیتم نے ایسے جواب دیا جیسے وہ آج کا وعدہ بھول گیا تھا!

"کچھ یاد بھی ہے تم کو"! رودا بولی!

یاد کیوں نہ ہوتا...... بیتم نے جوابدیا!

رودا مسکرانے لگی! بیتم چلا گیا!

ادھر ٹھاکر بھی دن بھر میں کئی مرتبہ بیتم کے گھر ہو آئے تھے!

"مرلا! آج ایکادشی کا تہوار ہے...... تا مرلا۔ نہاؤ گی نہیں"!

اس نے بھی ٹھاکر کو یقین دلا دیا کہ وعدہ اسے یاد ہے!

ٹھاکر نے جیسے تیسے دن کاٹا۔ شام سے کچھ پہلے ہی کپڑے بدلکر نکل گئے۔

شائد میں سویرے آسکوں رودا!

چراغ جلنے سے کچھ پہلے ہی ٹھاکر اپنی چوپال کی اُس کوٹھری میں پہنچ گئے جہاں انھوں نے آج مُرلیا کو بلایا تھا! آہستہ سے کواڑ کھولکر اندھیرے میں پڑی ہوئی کھاٹ پر چپکے سے لیٹ رہے تاکہ پلنگ کے چرچرانے کی آواز نہ آئے۔ بار بار ان کی آنکھیں جھپک کر کھل جاتیں۔ ذرا ذرا دیر بعد ایسا معلوم ہوتا جیسے خوبصورت مرلیا دبے پاؤں وعدہ وفا کرنے کے لئے چلی آرہی ہے! دروازہ کے قریب پہونچ گئی! انگنائی میں کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہو رہی ہے ان کے کان بج رہے تھے، جیسے کسی نے دروازے کے پٹ کھولدئے!......

لیکن جب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تو خالی کوٹھری میں اندھیرے کے سوا کوئی نظر نہ آتا۔ انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ سارے گاؤں میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دُور پر ایک آدھ کتے کے بھونکنے کی آواز ضرور آجاتی! یکایک کسی کے دھیرے دھیرے آنے کی آہٹ سے وہ چونک پڑے! اندھیری کوٹھری میں ان کی تیز تیز سانسیں اسطرح آواز دے رہی تھیں جیسے سنسان جنگل میں جھینگر بول رہا ہو!

چوں..... وُں سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی! اندھیرے میں ایک خاموش سایہ..... دھیرے دھیرے..... قدم بڑھاتا ہوا تیز سانسوں کی طرف بڑھتا ہوا چلا گیا..... اور.... اور..... ایک کھلی ہوئی آغوش میں اس کا دبکا ہوا جسم..... سما گیا ــــ!

بازارِ حُسن!

ازادیب لبیب حضرت خواجہ محمد شفیع صاحب رئیس دہلی

محترم خواجہ محمد شفیع صاحب رئیس دہلی ایک نامور باپ کے نامور فرزند ہیں۔ شعر و ادب سے فطری ذوق رکھتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی و فارسی ادب میں کامل دستگاہ ہے۔ دِلّی کی ٹکسالی اُردو ان کی مادری زبان ہے اسلئے جس عنوان پر قلم اُٹھاتے ہیں، تصویر کھینچ دیتے ہیں "بازارِ حُسن" ہی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ انداز نگارش کیسا اچھوتا ہے۔ لطفِ زبان نے الفاظ میں جان ڈالدی ہے پھر دلکشی کیوں نہ بلائیں لے۔

اس مضمون کے ابتدائی حِصّے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، صرف یہی وہ ٹکڑا ہے جو اب تک غیر مطبوع تھا، گویا یوں سمجھئے ؎

جدا جدا وہ بٹے یاد کرنے والوں میں! الگ الگ جو ورق تھے مرے فسانے کے

دوست نواز خواجہ نے آخر یہ ٹکڑا بھی "مشہور" کی جھولی میں ڈالدیا۔

ایڈیٹر

کالج کا زمانہ۔ اندھی عمر۔ بے فکری۔ ماں باپ کے پیسے۔ ایک رات پھاٹک جبش خاں میں جلسہ تھا۔ مہ پارہ کا ناچ۔ ہم سب بھی مدعو۔ محفل میں سید کی آنکھ مہ پارہ سے لڑ گئی۔ تھا یہ بھی تیکھا جوان، ہزاروں لاکھوں میں ایک۔ ادھر مہ پارہ کا بھی جواب نہ تھا۔ ٹھوڑی تارا ماتھے چاند۔ بھری جوانی، رس بھری آنکھیں، اک تیر تھا کہ دونوں کے دل میں اُتر گیا۔

دل سے دل کو راہ ہوتی ہے ؎ دونوں جانب سے چاہ ہوتی ہے

سید بھی اپنی جگہ آٹھوں گھاٹ کیست تماشبین تھا۔ لیکن رنڈی کی بات رنڈی ہی کے ساتھ ہے۔ سیّاں بہت بچ بچ کر لڑے پر آخر پینگ بڑھ ہی گئی۔ کچھ احسان میاں کے احسان کچھ جوانی کی ترنگ۔ یہ عمر ہوتی ہے دیوانی۔ سونے پر سہاگا موتیوں میں دھاگا۔ احسان میاں دن رات نت نئے پیغام لائیں اچھوتے سندیسے سُنائیں ـــــ آج آپ نہیں گئے تو اس نے ٹیم ہی نہیں لگایا۔ میں دن کو جا پہنچا تھا چنے کی دال پر سوئی کی نوک سے کچھ لکھ رہی تھی مجھے دیکھتے ہی چھپالی۔ جب میں نے اپنے سر کی قسم دی تو رازداری کا وعدہ لینے کے بعد دکھائی۔ کیا بتاؤں کیا لکھا تھا۔ اب سید بیتاب ہیں۔ بار بار قسمیں دے دے کر پوچھا جا رہا ہے۔ احسان ہیں کہ ٹالے جاتے ہیں۔ آخر مولوی (چاء کی دوکان والے کا لقب) کی چاء پلانے کے وعدہ پر لب کھولے اور بولے ظالم کیا بتاؤں تیرا ہی نام لکھا تھا۔

غرضکہ سید کے سینہ میں جو چنگاری تھی وہ کچھ تو عمر نے بھڑکائی اور کچھ احسان میاں جیسے ہوا خواہوں نے شعلہ بنائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید وہاں روز روز جانے لگا اور گھر سے مختلف بہانوں سے ... رقمیں اڑانے لگا

کالج ٹورنمنٹس شروع ہوئے۔ سید بھی کانٹے کا کھلاڑی تھا۔ دس دن دبا کر پریکٹس کی۔ روشن آرا کلب سے مار کر بلایا۔ راتوں کا جاگنا ترک۔ سانس ٹھیک ہو گیا، ہاتھ گینڈے پر آ گیا ـــــ احسان میاں نے گراونڈ پر پیام پہنچایا کہ یاد ہو رہی تھی۔ سید کچھ ڈھل مل یقین سا ہوا۔ ہم سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ اب ٹورنمنٹس بعد بات ہو گی۔ اسوقت تو میچ میں جانیں لڑی ہوئی ہیں۔

آج سنگلز کا فائنل ہے۔ سب کی آنکھیں سید کی طرف ہیں۔ تین بجے سے گراؤنڈز پر بھیڑ لگ گئی۔ صبح سید کے تیل مالش ہوئی دوپہر کو نہایت اہتمام سے انھیں سُلایا گیا۔ کمرے کے باہر ہم پہرہ دیتے رہے۔ کمرہ کے پاس آواز نہ ہونے پائے، پاؤں کی چاپ نہ ہو۔ چار بجے نہلا دھلا نئے دولہا کی طرح جھرمٹ میں لے گراؤنڈز کی طرف چلے۔ احسان میاں بھی سائے کی طرح ساتھ ساتھ تھے۔ صبح یہ کہیں سے تعویذ بھی لائے تھے۔ اصرار تھا کہ سید بازو پر باندھے، پہلے تو اس نے انکار کیا لیکن پھر کان میں انھوں نے کچھ منتر پھونکا اور اس نے مسکرا کر بندھوالیا۔

ٹھیک سوا چار بجے رفری دو گز اونچی کرسی پر متمکن ہوا۔ اسکور بک میں نام درج کیئے گئے۔ کھلاڑیوں نے دو چار نوکس کیں، بلّا اچھالا گیا۔ ٹوسک ہم جیتے۔ سید نے سروس لی۔ رفری قلم در دست تن کر ہو بیٹھا۔ کھلاڑی لکیروں پر جا کھڑے ہوئے۔ فضا میں سنّاٹا چھا گیا۔ رفری نے کہا 'یس' گیند سن کر کے نکل گئی۔ جوڑ چھُٹ گئی۔ ربڑ کی گولی کے لکیروں سے ادھر جانے ... آنکھیں پھٹی ہوئی۔ گردنیں گیند کے

ساتھ اس طرح مُڑ رہی تھیں جیسے وہ مقناطیس ہو اور یہ سوئی ۔۔۔ گیند بھی
صرف آلۂ کار ہے۔ کالج کا نام بر سر پیکار ہے ۔۔۔ پہلا سٹ سید نے
بآسانی جیت لیا۔ سب خوش ہیں۔ اب پالا مارا 'ول بگن ہاف ڈن' کا فقرہ
سب کی زبان پر ہے۔

دوسرا سٹ شروع ہوا۔ مخالف نے 'بلیسنگ' سے کام لیا۔ سید کی سروس
میں سے سٹنگ کم ہونے لگا۔ سانس چڑھتا ہوا معلوم ہوا۔ ہاتھ بار بار کمر پر
جائے۔ پہلے دو گیمز تک تو ہم کہتے رہے ہنڈیکیپ دے رہا ہے۔ جب تیسرا
گیم بھی ہاتھ سے نکل گیا تو چہروں پر پریشانی ظاہر ہوئی اور ہم نے سید کو کورٹ
بدلتے وقت آہستہ آہستہ 'بک اپ' کہنا شروع کیا۔ ایک آدھ کے مُنہ سے یہ
بھی نکل گیا۔ سید تجھے کیا ہو رہا ہے ؟

پرنسپل بھی ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ چہرہ سے باوجود چھپانے کے
پریشانی ظاہر تھی اور اس نے بھی سید سے کہا۔ طریقے سے کھیلے جاؤ سید
پروا مت کرو۔ چوتھا اور پانچواں گیم سید نے کھینچا لیکن سٹ ہاتھ سے نکل گیا۔

احسان میاں تھرموس میں گرم دودھ لائے تھے وہ جلدی سے پلایا
چھوٹی سی شیشی میں سے ایک معجون نکالی اور پان میں رکھ کر کھلائی اور کہا۔
سید یہ تم کو اُبھارے رکھے گی۔ کمر ٹھوکی اور کہا جاؤ بیٹا یہ سٹ جیتنا ہے۔
نہیں تو چندا ماموں روٹھ جائینگے۔ ہم رازداں مسکرائے۔ سید نے کچھ جواب
نہ دیا لیکن چہرہ کہہ رہا تھا کہ کچھ دل میں ٹھانی ہے۔

احسان میاں ہم سے یہ کہہ کر کہ ابھی آیا۔ موہن کو ساتھ لیکر سرک گئے۔

دوسرا سٹ شروع ہوا۔

سید نے پہلا گیم اپنی سروس کا لیا۔ دوسرے میں مخالف نے اپنی جان
لڑادی۔ لیکن سید نے دو چار سٹروکس ایسے مارے کہ چھکے چھوٹ گئے۔
تیسرا گیم سید کی سروس کا نکل گیا۔ پھر چوتھے میں کٹ کٹ کر لڑا تلوار کے سو جوہر
دکھائے گیند لکیر سی بناتی نکل گئی۔ مخالف بوکھلا گیا اگلے دو گیم بھی مل گئے
سٹ اپنا ہوا۔

اتنے میں احسان میاں اور رام موہن بھی آگئے۔ سید کو شاباش دی
اور پان میں پھر وہی کالی کالی دوا۔ ساتھ کے ساتھ کان میں کچھ کہا بھی اور سید
کی نگاہ علی پور روڈ کی طرف اٹھی میں نے احسان میاں سے پوچھا کیا بات ہے؟ بولے
اب تماشا دیکھو چیتی پہ لال لڑے گا۔ خود بدولت موٹر میں سڑک پر کھڑی ہیں۔ ہم
نے نظر بچا کر دیکھا تو رُخ روشن کی جھلک نظر آئی۔

اس سٹ کا حال نہ پوچھو سید بجلی بنا تھا۔ رگوں میں سیماب
بھرا تھا۔ چھلاوہ تھا جو نظروں کو خیرہ کئے دے رہا تھا۔ ابھی نٹ۔ پر وولی۔
مار کر گیا ہے تو ابھی بیس لائن سے غضب کی ڈرائیو کی تو فوراً گلیری لائن سے

پلیس کیا۔ گیند ہوا کی طرح نکل جاتی، ایک سایہ سا گزرتا نظر آتا۔ مخالف جو نروس ہو گیا
سید چھا گیا۔ پوائنٹ پر پوائنٹ جیت رہا تھا۔ گیم پر گیم، مخالف سامنے ٹک نہ سکا
دیکھتے دیکھتے میچ جیت لیا۔

سید کو سب نے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ گراؤنڈز کے دو چار چکر دینے کے
بعد کالج کا رُخ کیا۔

تھوڑے فاصلہ پر ایک موٹر پوقدمہ چلتی ساتھ ساتھ آرہی تھی، گو
یہ خود مرکزِ نگاہ بنا تھا تاہم نظر بچا بچا کر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ ہم میں سے ایک بو...

ہجومِ عام میں رخسارِ یار کے بوسے
مری نظر نے نگاہیں بچا بچا کے لئے !

احسان میاں ذرا کی ذرا نظروں سے غائب ہوئے اب جو آئے تو ایک
ہار گوٹے کا اور ایک کنٹھا پھولوں کا ہاتھ میں تھا۔ کسی نے کہا یار یہ کہاں سے برآمد
کیا۔ بولے سائیں کی جھولی میں کس شے کی کمی۔ ابھی کہو تو آسمان کا ستارہ نکال لاؤں
چشم زدن میں کوئی مہ پارہ نکالدوں۔ سید اس نقطہ پر مسکرا دیا۔

یہ شیطانی لشکر کشمیری دروازہ سے ہوتا ہوا مولوی کے رسٹورینٹ پر
ٹوٹ پڑا۔ اور اب ایک طوفانِ طعام بپا تھا جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔
پلیٹس پر پلیٹس آرہی تھیں اور خالی ہو ہو کر جا رہی تھیں۔ انسان آج بھی روز
اوّل ہی کا انسان ہے ہر خوشی کے موقع پر کھاتا ہے اور غل مچاتا ہے۔

ہماری چنڈال چوکڑی ایک میز پر بیٹھی تھی کر پرشاد بولا یارو پیسٹری
بالکل ڈرائی (خشک) ہے اور نقطہ ڈرائی پر دراز درد دیا۔ موہن بولا تو گھونٹ...
اُتارنا چاہتا ہے۔ تردامنی کے خواہاں میں تجھے آج غرق کردوں گا۔ احسان...
بولے۔ غرقاب بیشو۔ غرقاب بکن۔ امشب تو مرا سیراب بکن۔

اتنے میں شبیر ہماری میز پر آ گیا۔ گو، یہ ہمارے 'انر سرکل' اندرو...
حلقہ میں نہ تھا پر تھا قدرے رازداں۔ بولا یارو جو پورا 'چکن' جوزہ کھلو...
ایک بات بتاؤں۔ یہ کالج بھر میں بڑ بیٹو، کھانے کا شوقین مشہور تھا۔ اور...
عجب صورت حرام، کھاتا تھا بکری کی طرح سوکھتا تھا لکڑی کی طرح۔ دن...
چرے اور پھر چپاتی سا پیٹ کمر سے لگا ہوا۔ موہن بولا بتا رے مرغی تیر...
شبیر نے کہا۔ منگا کے سامنے رکھدے پھر زبان کھلے گی۔ مولوی صاحب ریسٹ...
کے مالک کے کان ادھر لگے ہوئے تھے۔ بولے گرم کراؤں۔ جواب ملا۔ بلیشک
شبیر نے لقمہ دیا۔ بڑی سے بڑی۔ آج موٹی مُرغی پھنسی ہے۔

شبیر کی جہاں خوش خوراکی مشہور تھی وہاں دو گالیاں بھی انکی پیش...
تھیں۔ اور ہم میں سے کوئی ان کا بُرا نہیں مانتا تھا۔ ایک تو 'سالا' ان کا
کلام تھا، دوسرے بہن کی گالی ان کے نوک زبان۔ پہلے ایک دو مرتبہ سا...
اسے سیدھا کیا اور ان کو معافی مانگنی پڑی۔ لیکن ایک روز انھیں عام لائسنس ...

وہ یہ ہوا کہ ایک دن شبیر کی جیب میں خلافِ معمول بہت سے روپے پڑے تھے یاروں نے کہا۔ آج تو رئیس بنا ہوا ہے۔ تو حضور نے احباب کی اطلاع کے لئے فرمایا کہ یہ روپیہ میرے نہیں ہیں ابا کے ہیں۔ اور اس مفہوم کے ادا کرنے کو جو فقرہ دہن مبارک سے برآمد ہوا۔ اس میں گھٹیا اور مختصر گالی اپنے نام کے ساتھ تھی اور اعزازِ والد کے مدنظر بڑھیا ان کے نام سے قبل چسپاں کی گئی۔

اس حادثہ کے بعد یہ معاف تھے

بہر کیف گرم گرم مرغی آئی اور شبیر نے کہا۔ یارو کچھ خبر بھی ہے۔ مہ پارہ کی موٹر گورنمنٹ اسکول کے سامنے کھڑی ہے۔ سید بولا دیکھو اس غریب کو ہم بھول ہی گئے۔ سید یہ تیری برائی نہیں مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ موہن نے کہا تنہا خور۔ آپ ہی آپ دو بچے جا رہے ہو۔ مولوی صاحب ایک ٹرے میں بڑھیا سے بڑھیا مال لگوائیے۔ کہنے کی دیر تھی کہ خوانِ نعمت سجا سجایا موجود۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ بوئے انہیں پہنچائے گا کیونکر۔ جو کہیں غلط موٹر میں دے آیا تو مشکل شبیر بولا۔ ہم دور سے بتا دینگے۔ احسان نے کہا جناب تو معاف ہی رکھیں۔ حضور ہاں بھی سب ہضم فرما جائینگے اور وہ غریب یونہی رہ جائیگی۔

اس عقدۂ مشکل کا یہ حل تجویز ہوا کہ سب ملکر چلیں اور موٹر ہی میں اُڑائیں۔ شبیر بولا جاؤ چڈا پھر دیکھو کیا مزہ آتا ہے۔ موہن نے کہا مزہ کیا آئیگا جواب ملا، بس ہم نے کہدیا۔ یار خاں تو بیتر سے کام کریں گے اور تم جا کر بھی دیکھو کل پتہ چلے گا۔ موہن نے سرکہ جبیں ہو کر کہا کمبخت کچھ منہ سے تو پھوٹ۔ بولا یار تم نے ہم کو کڑک مرغی کھلائی۔ احسان نے کہا مطلب۔ بولا کمبخت میں سے ایک انڈا نہ نکلا ہم چرکیں تو کیسے۔ مولوی کے چہرہ پر تبسم آیا۔ موہن بولا۔ بھئی مولوی دو انڈوں کا اوملٹ۔ اب شبیر نے کہا۔ دیکھو بے تمھارے پاس تو بدھی ہے نہیں۔ یہاں سے سید کو لیکر تم سب چلو گے تو یہ قافلہ ساتھ ہوگا۔ ابھی یہ اسے چھوڑنے والے ہیں نہیں اور خاں اپنے چپکے سے کام بنا آئینگے اور پھر ایک اور بات بھی ہے اتنا کہ پھر گونگی ہڑپ کر بیٹھا۔ موہن نے کہا ابے بولتا کیوں نہیں اور کیا بات ہے۔

اس مرتبہ مولوی صاحب نے اتنا تبسم فرمایا کہ دانت بھی نظر آگئے۔ اب تکلف برطرف۔ شبیر نے خود ہی کہدیا کہ دو عدد فرائنڈ داخل کردہ بیارہ بد۔ اور فرمانے لگے یارو وہاں پروفیسر اطہر علی بھی سڑک پر کھڑے اپنی بینائی درست فرما رہے ہیں۔ جب میں ادھر سے گذرا تو بیلارام کی شو ونڈو دیکھنے لگے اور پھر ادھر ٹکٹکی باندھی۔

یہ حضرت پروفیسر ہیں۔ دل میں حسرتیں بھری ہیں۔ نکالنے کے مواقع نہیں حسن پرستی خمیر میں ہے ریاکاری ضمیر میں۔ باتوں کے میٹھے۔ یوں نیش عقرب ہیں عیش کرتے ہوئے دیکھ کر ترستے ہیں۔ تردامنی کی ہمت نہیں، زاہد خشک بنے پھرتے ہیں۔ عصمت بی بی از بے چادری۔ وہے اندھے اُجالے یہ جو کتے بھی نہیں۔ ہم اکثر فقرہ کستے رہتے ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں جلے پھپھولے پھوڑ رہا ہے۔ ہم اجازت دیں تو ساتھ ہو لیں۔ پر ہم بال و پر ملاتے نہیں، بالا ہی بالا اُڑا دیتے ہیں۔ ہے یہ بھی پتنگ، چھچھوری قسم کا انسان، پیٹ کا ہلکا، بھانڈا پھوڑ۔ ہم نے سوچا کہ اگر کہیں اس کمبخت نے دیکھ لیا تو چھاج میں ڈال چھلنی میں اُڑا دے گا۔ سارے کالج میں پھونکدے گا۔ پرنسپل تک بات پہنچا دے تو بعید نہیں۔ گو ہم پرنسپل سے کچھ زیادہ ڈرتے نہ تھے لیکن خواہ مخواہ خرخشہ مول لینے کو دل نہ چاہا اور یہی قرار پایا کہ شبیر بوئے کے ساتھ جائے اور ان کی تواضع بدرجۂ اتم انجام دے۔ سید نے جاتے جاتے پھر جتا دیا کہ دیکھ اس غریب کے حصہ پر نیت نہ دوڑائیو۔ تجھے اور جو کچھ کھانا ہو یہاں آکر کھا لیجو۔

اب رات ہونے لگی۔ پنچھی چھٹ گئے۔ شبیر میاں بھی واپس آئے اور یہ پیام لائے کہ موٹر میں بلا رہی ہیں۔ ہم نے پوچھا وہ ٹیاں پروفیسر وہاں کھڑا ہے۔ جواب ملا خبر نہیں۔ ہم نے کہا تو پھر جناب کیسے پہنچ گئے۔ ارشاد ہوا پہنچے تو دور سے بوئے کو موٹر بتادی اور خود ٹہلتے ٹہلتے پروفیسر صاحب کے پاس جا پہنچے اور پوچھنے لگے، مولوی صاحب کس کا انتظار ہے۔؟ بولے کسی کا نہیں ذرا ساڑیاں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا میں تو سمجھا آپ کسی کی راہ میں کھڑے ہیں ابھی ابھی ادھر سے گذرا تھا۔ جب بھی جناب یہیں ٹہل رہے تھے۔ بولے ہاں یہ ساڑی بہت خوش رنگ ہے۔ غرضکہ وہ کچھ لئے سے گئے اور اسوقت وہاں سے ٹل گئے۔ اب پھر آن جمے ہوں تو مجھے خبر نہیں باقی ہیں وہ پٹو قسم۔

کامیابی کے نشہ نے سید کو اندھا کر رکھا تھا۔ ہم سب بھی نیم مخمور۔ کہاں کے پروفیسر، اس وقت ہم کو پرنسپل کی بھی پروانہ تھی۔ دیو معصیت تو خوف خدا بھلا دیتا ہے ——— مہ پارہ نے احسان کیا تھا۔ آدھے لفظ پر آن پہونچی۔ اب کھڑی راہ دیکھ رہی ہے کب تک اسے انتظار کرائیں۔ مولوی صاحب اپنا سر کھائیں۔ ہمارے سر میں سودا ہی اور ہے خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندوں کی کیا چوری ——— مستانہ وار یہ چنڈال چوکڑی احسان کی دیوی بی مہ پارہ کی طرف روانہ ہوئی۔ سبنے اپنی اپنی ٹوپیاں صحیح زاویہ سے جمائیں۔ سید نے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر جما اوپر سے گولف کیپ اٹی گرز یب سر کرلی۔ موٹر دور ہی کتنی تھی منٹوں میں جا پہنچے۔ مہ پارہ چشم براہ تھی۔ سید کو اک نگہ خاص سے دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بلائیں لیتی نظر آئی۔

ہم سب بیٹھ گئے موٹر روانہ ہوئی۔ پرشاد بولا یارو آلات حرب تو لے لو آج وسکی کے ساتھ دو بوتلیں شیمپین کی بھی خریدی گئیں۔ کوٹھے پر پہنچ بوتلیں کھول ہو بیٹھے۔ دَور چلنے لگا۔ نشہ گٹھنے لگا، سازندوں نے ساز چھیڑے۔ مہ پارہ نے اشارہ پاکر یہ غزل شروع کی۔

ساقی بنور بادہ برافروز جامِ ما + مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

پہلے مصرعہ پر احسان نے کہا۔ بتاکر ہوگی۔ پرشاد بولا پلاکر ہوگی۔ سب نے گلاس خالی کئے۔ مہ پارہ نے نور بادہ سے جام بھرے۔ سیاہ کاری کا آغاز ہوا ـــــ احسان میاں کی فرمائش پر طوائف گھنگرو باندھ ناچنے کھڑی ہوئی۔ جب مستانہ وار جھومتی ہماری طرف بڑھتی۔ میکدہ لغزیدہ پا نظر آتا۔ جب پچھلے قدموں واپس جاتی تو بھی بعد کا احساس نہ ہوتا۔ فضا پر کچھ ایسی چھائی تھی ہماری نگاہوں میں اسدرجہ سمائی تھی کہ امتیاز قرب و بعد مٹ گیا۔ دلوں میں رقصاں نظر آتی۔ آنکھوں میں پتلی سی پھر جاتی ـــــ جسم ناگن سا بل کھائے۔ گورے گورے مکھڑے پہ باہوں کا گھیرا کرکے جب وہ آئے۔ ہم متواروں کو چاند ہالہ میں نظر آئے۔

ہم سکتہ کے عالم میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں چہرہ پر جمی تھیں۔ دل قدموں میں لوٹا جائے۔ اور وہ بتِ طناز۔ مصروف رقص۔ صرف ادا۔ محوِ ناز تھی۔ سارنگی کا سینہ گزوں کی زد سے تار تار تھا۔ زمین ٹھکرائی جا رہی تھی۔ طبلہ پٹ رہا تھا اور ابن آدم اسے عیش کہہ رہا تھا۔

زینہ پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ کچھ اور تماشبین آپہنچے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کباب میں ہڈی۔ ہم منقبض ہوئے وے کیا کرتے۔ مجبوری ولاچاری۔ رنڈی کا کوٹھا۔ کبوتر باز کی چھتری۔ فقیر کا تکیہ۔ ہوٹل کا کمرہ۔ جو چاہیگا آئیگا صلائے عام ہے یارانِ زرفشاں کے لئے۔

نووارد آتے ہی پھیل پھال کر ہو بیٹھے۔ یہاں تو خیر سے جو بھی آتا ہے اکڑو خاں ہی آتا ہے۔ ایک صاحب کہا کرتے تھے۔ میاں رنڈی کے کوٹھے پر جیدار ہی چڑھ سکتا ہے۔ یہ کوئی مسجد تھوڑی ہے جہاں پر مردہ مال کا گذر ہو سکے پہلے ہی شعر پر ان میں سے ایک نے پانچ کا نوٹ دکھایا۔ مہ پارہ ذرا کمسا کر اٹھی اور سلام کرکے لیلیا۔ ان صاحب نے نوٹ دیتے ہوئے ہاتھ پکڑ لیا اور دو تین منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں ایک دو مرتبہ مہ پارہ کی نگاہیں سعید سے دوچار ہوئیں اور کچھ گلو خلاصی کی درخواست کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ احسان نے سعید کے کان میں کہا۔ خول ہی خول ہے دو چوٹوں میں پیٹھ دکھا جائینگے، تو آپ کے دس کا سر کا۔

کچھ رنڈی کا احسان سر پہ تھا، کچھ جوانی کا بھوت اور کچھ بوتل والی کا نشہ۔ سعید نے پے درپے دس دس کے دو تین نوٹ ادھر سے ادھر کر دئے۔ تھوڑی دیر تو حریف مقابلہ پر ڈٹے رہے، ہم کو ٹیڑی ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ کی چھڑی سامنے رکھ ایک دو دفعہ پھنکاری بھی۔ پر ہم بھی کسی طرح ہیٹے نہ تھے۔ موچھوں پر تاؤ دے اکڑ کر ہو بیٹھے اور پھر احسان میاں نے تو یہ غضب کیا کہ جوتہ کھولنے لگے اور پھر سعید نے اپنے ڈنڑوں کی تیاری دکھائی۔ غرضکہ مدمقابل تاڑ گیا کہ یہ دب کر گذر بسر کرنے والوں میں ہیں نہیں ـــــ

اب انھوں نے اشاروں ہی اشاروں ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا کہ چل کر رقم اور لے آؤ۔ آخرکار یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ ابھی آتے ہیں پھر نمٹ لینگے۔ روئے سخن ہماری طرف نہ تھا۔ آپس ہی میں طوطا مینا کر رہے تھے اسلئے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

اب ہم سب کی یہ رائے ہوئی۔ کہ دروازہ بند کروا دیا جائے۔ مہ پارہ ذرا خاموش ہوئی۔ احسان نے کہا اماں جان کا ڈر ہے۔ اس نے کچھ اس طرح آنکھیں نیچی کیں جو کہہ رہی تھیں کیا کروں مجبور ہوں ـــ احسان بولے، آپ فکر نہ فرمائیں، مجرہ کے پیسہ لیجئے اور دروازہ بند کیجئے۔ دس دس کے پانچ نوٹ اماں جان کی بھینٹ چڑھائے گئے۔ ان کا مجرا پچاس کا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی رقم تو ہم اب تک دے چکے تھے یہ اور پچاس کس بات کے۔ صاحب وہ رقم رنڈی کی ہو چکی تھی، یہ عروس نو ہر لمحہ نیا معاملہ کرتی ہے۔

کوٹھے پر اب ہمارا قبضہ تھا اور رات بھر گانا ہوتا رہا۔

جذباتِ کامِل

دولت کونین ہی درکار تھی میرے لئے
تو نے بخشی بھی تو غم کی زندگی میرے لئے

زیست تو بیکار ثابت ہوگئی میرے لئے
موت ہی کو اب بنا دے زندگی میرے لئے

دوست تھے سب جیتے جی کے اب مرا کوئی نہیں
قبر روتی کہ ہر تنہا بے کسی میرے لئے

آہ میں کیا ہوں بس اک مرکز ہوں غم کا یاس کا
عشق میں حاصل کہاں دلبستگی میرے لئے

دل خوشی کی بات پر بھی خوش نہیں ہوتا کبھی
وقف شاید ہوگئی آشفتگی میرے لئے

اپنی حالت اپنی کیفیت سے خود واقف نہیں
عشق نے دی ہر پیرا از خود رفتگی میرے لئے

شکوۂ جور و ستم سے اور کیا حاصل ہوا
وہ ادھر خائف ادھر شرمندگی میرے لئے

عمر گذری اضطراب زندگانی میں مری
اے خدا تسکین دے اب دائمی میرے لئے

وقف ہو کر رہ گئی کامل کسی کے عشق میں
بیکسی میرے لئے افسردگی میرے لئے

کلامِ آرزو

حضرت آرزو لکھنوی زبان اساتذہ کی یادگار ہیں۔ ان کا کلام ایک فریادِ مستقل ہے۔ ہر شعر شور انگیز اور بامزہ ہوتا ہے۔ ذیل کا تازہ کلام (جو موصوف نے ہماری استدعا پر ارسال فرمایا ہے) مذکورہ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ درج کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر

نزع کی ہچکی شکست ساز ہے
نالہ ٹوٹے تار کی آواز ہے

کیا کہے وہ جو سراپا راز ہے
چُپ مری فریادِ بے آواز ہے

وا ہی کچھ اس طرح چشمِ انتظار
جیسے آغوشِ تمنّا باز ہے

ہنس اس حالت پہ ذلت کی ہنسی
خستگی پر جس کی مجھکو ناز ہے

ہے جنونِ پردہ در بھی پردہ دار
رازِ دل کھُل جانے پر بھی راز ہے

یہ کرم بھی کچھ ستم سے کم نہیں!
جان کا خواہاں ہے جو انداز ہے

رُخ نہ نشیمن کا نہ قفس کی فکر میں
دل کے اندھے شوق کی پرواز ہے

ہنستے ہی آنسو بھر آتا آنکھ میں
کس بُرے انجام کا آغاز ہے

نیند اُڑ جاتی تھی جس نالے کے ساتھ
اب وہ اک ڈوبی ہوئی آواز ہے

آرزو مر مر کے جینا ہے یونہی
جانستاں یہ غم اگر دمساز ہے

KAMIL

جناب مولانا حکیم ابوالفاضل رازؔ چاندپوری دُنیائے شعر و ادب کی ایک مشہور ہستی ہیں۔ مولانا سیمابؔ اکبرآبادی سے آپ کو شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ مذاقِ سخن نہایت پاکیزہ ہے۔ چنانچہ "نکتۂ لطیف" کے عنوان سے جو آپ نے تازہ کلام مرحمت فرمایا ہے وہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔ نظم کے تمام اشعار پُرکیف اور وجد آفریں ہیں۔ ایڈیٹر

نکتۂ لطیف

از جناب مولانا ابوالفاضل صاحب رازؔ چاندپوری



وقفِ خزاں ہے حُسنِ گلستانِ آرزو — قلبِ اُمید جورِ فلک سے ہے داغدار

ناواقفِ رموزِ محبت ہیں مجلسیں! — بیگانۂ اصولِ شرافت ہیں غمگسار

نشترِ خلوص ایک فریبِ لطیف ہے — ناآشنائے مہر ہیں یارانِ جاں نثار

بدکیش و کم نظر ہیں حریفانِ خود فروش — حُسنِ سخن سے ظلمتِ معنی ہے آشکار

زاہد فریب کار ہے، واعظ ہے خودنما — ناگفتنی ہے صوفیِ صافی کا حالِ زار

مطرب ہے مست بادۂ نغماتِ خودسری — شاعر ہے کم نگاہ و خوآرا و خامکار

محوِ سکوت ساقیِ رعنائے بزم ہے — وقفِ خمارِ دوش ہے ہر ایک بادہ خوار

بس اے فریب خوردۂ دُنیائے رنگ و بو — تا چند یہ حکایتِ غمہائے روزگار

لاریب کم نظر ہے زمانہ، ضرور ہے — بیشک فریب کار ہے دنیا، فریب کار

لیکن مرے عزیز! تجھے اس سے کیا غرض — کوئی وفا نواز ہو یا ہو جفا شعار

عُمرِ دو روزہ در غمِ عالم مکن خراب
خاموش باش و حُسنِ عمل را نگاہدار

KAMIL.



پاکستان کے قافیہ میں تصرّف!

علامہ پنڈت برجموہن صاحب کیفی دتاتریہ دہلوی اُن باکمال بزرگوں میں سے ایک ہیں جنہیں دلّی والے [فخر] کر سکتے ہیں آپنے زبان اُردو کی وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں کہ مستقبل کا مورخ انھیں نظرانداز [نہ]یں کرسکتا۔ ہمیں فخر ہے کہ علامہ موصوف "مشہور" کو محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ اُسی [محب]ت کا اقتضاء ہے کہ آپنے ذیل کا تازہ طنزیہ کلام مرحمت فرمایا ہے۔ طنزیہ یا مزاحیہ رنگ میں کیفی صاحب کا [رنگ] جناب اکبر الہ آبادی سے ملتا جلتا ہے۔ جن حضرات نے آپ کا دیوان "واردات" ملاحظہ فرمایا ہے [ان]ہیں کا ایک حصّہ "بات نامہ" کے عنوان سے اسی قسم کے اشعار سے پُر ہے۔ موجودہ اشعار کے قافیے جدّتِ طبع کے [دل]چسپ نمونے ہیں اور امید کہ وہ غایت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائینگے۔

ایڈیٹر

[ا]یک کے سر میں گر ہے پاکستان
[ہند]ومنستاں کی دُھن کسی کو ہے
[ہ]م ہریجن کو کیا کہ گاندھی نے
[ا]س زمیں میں بنے تو یوں بن جائے
کہ وہ سرمایہ دار کے گھر میں
[ع]الم شعر میں بھی ہے یہ شور
[سر]سنتی جی کی بھی قلمرو میں
عورتیں کیوں پھسڈی رہ جائیں
گندمستاں کی دُھن کسی کو نہیں
الغرض شور ہے حقِستاں کا
[ت]و تیرے ہیں تو نہ بن جائے
[ہ]یں تو جاؤں کہ یہ ستاں والے
[کھ]ٹکھٹاتا در اُدھر تو غنیم
[م]اجرا کیا ہے!

دل میں ہے دوسرے کے دھرمستان
سر چڑھا ہے کسی کے سنگھستان
اک بنا رکھا ہے اچھوتستان
قلی۔ مزدور کے لئے استان
گھس کے کہدے یہ ہی مزورستان
ہم بھی گھڑ ڈالیں اک لطیفستان
کہتے ہیں بن گیا کسانستان
وہ بنانے کو ہیں زنانستان
کب سے ٹھنڈا پڑا ہے نانستان (چولھا)
اور بھولا ہوا ہے فرضستان
کہیں ہندوستاں اُجاڑستان
سب ہیں وارفتۂ غلامستان
یہاں برپا ہے گھر میں رزمستاں
بن گیا کیوں یہ مُلک خبطستاں؟

یہاں کیا کام ہے ترا کیفی!
آبنائیں ہم اپنا عشقستان!!

یادِ اقبال مرحوم

نومبر ۴۲ء کے آخری ہفتہ کی یاد کبھی فراموش نہیں ہوسکتی جو راقم الحروف نے لاہور کی ادبی فضا میں گذارا تھا اور ساتھ ہی اپنے محترم دوست منشی فاضل جناب رفیق غازی صاحب کی مہمان نوازی بھی رہ رہ کر یاد آتی رہے گی جن کی پُرخلوص محبت نے یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں دِلّی سے باہر ہوں۔

دورانِ قیام میں ایک روز غازی صاحب کے ہمراہ شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تربتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اور فاتحہ خوانی کے بعد خیال آیا کہ علامہ سے پوچھوں تو سہی کہ اُردو ادب پر جو ایک بے کیفی سے طاری ہے یہ کیونکر دُور ہو۔ دفعتہً محسوس ہوا کہ علامہ مسکرا رہے ہیں اور فرماتے ہیں اس کا جواب وہی ہے جو مجھے عالمِ تخیل میں عُرفی شیرازی نے دیا تھا۔ چنانچہ حافظہ پر زور دیتے ہی علامہ مرحوم کے وہی اشعار یاد آ گئے جو درج ذیل ہیں انھیں بار بار پڑھیئے اور سر دُھنئے۔

ایم حسین اسسٹنٹ ایڈیٹر

محل ایسا کیا تعمیر عُرفی کے تخیل نے ۔۔۔ تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی ۔۔۔ میسّر جس سے آنکھوں کو ہوا بتک اشکِ عنابی

مرے دل نے یہ اکدن اسکی تربت سے شکایت کی ۔۔۔ نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی

تغیّر آگیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں! ۔۔۔ کہ رخصت ہوگئی دُنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغانِ نیمشب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے ۔۔۔ نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بیخوابی

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت رُبا کیونکر ۔۔۔ گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو ۔۔۔ نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

حُدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی

اقبال

یادِ اقبال مرحوم

نومبر ۴۲ء کے آخری ہفتہ کی یاد کبھی فراموش نہیں ہو سکتی جو راقم الحروف نے لاہور کی ادبی فضا میں گذارا تھا اور
ساتھ ہی اپنے محترم دوست منشی فاضل جناب رفیق غازی صاحب کی مہمان نوازی بھی رہ رہ کر یاد آتی رہے گی جن کی پُرخلوص محبت نے
یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں دِلّی سے باہر ہوں۔

دورانِ قیام میں ایک روز غازی صاحب کے ہمراہ شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تربتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔
اور فاتحہ خوانی کے بعد خیال آیا کہ علامہ سے پوچھوں تو سہی کہ اُردو ادب پر جو ایک بے کیفی سے طاری ہے یہ کیونکر دُور ہو۔ دفعتہً محسوس ہوا کہ علامہ
مسکرا رہے ہیں اور فرماتے ہیں اس کا جواب وہی ہے جو مجھے عالمِ تخیل میں عُرفی شیرازی نے دیا تھا۔ چنانچہ حافظہ پر زور دیتے ہی علامہ مرحوم
کے وہی اشعار یاد آگئے جو درج ذیل ہیں انھیں بار بار پڑھیئے اور سر دُھنئے۔

ایم حسین اسسٹنٹ ایڈیٹر

محل ایسا کیا تعمیر عُرفی کے تخیل نے ॥ تصدّق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی ॥ میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی

مرے دل نے یہ اک دن اسکی تربت سے شکایت کی ॥ نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
تغیّر آگیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں! ॥ کہ رخصت ہوگئی دُنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیمشب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے ॥ نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بیخوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت رُبا کیونکر ॥ گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو ॥ نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز ترمیخواں چو محمل را گراں بینی

اقبال

خطوکتابت

کُشتِ حیات

آتشک کی پیٹنٹ اور مجرّب دوا ہے ہزارہا مریضوں
پر تجربہ کیا جا چکا ہے۔ پچانوے فیصدی آتشک کے
کیس "کشتِ حیات" کی وجہ سے اچھے ہو گئے اس دوا
کے استعمال سے خون کی حدّت اعتدال پر آجاتی ہے
اور فسادِ خون زائل ہو جاتا ہے۔ زخم خشک ہو کر بھوسی
کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔ اگر آتشک تیسرے درجہ تک پہنچ
گئی ہو اور حکیم۔ ڈاکٹر۔ وید اُسے ناقابل علاج قرار دے چکے
ہوں تب بھی آپ مایوس نہ ہوں اور کشتِ حیات کا استعمال
کرائیں خدا نے چاہا تو مریض رو بصحت ہوگا۔ "کشتِ حیات"
ایک زبردست حکیم کا خاندانی نسخہ ہے جنکا نام نامی حکیم حاجی
سراج الدین خاں ہے جو حکیم احسان اللہ خاں طبیب شاہی کی
یادگار ہیں اور آج ہندوستان میں ان کا طوطی بول رہا ہے۔
قیمت چالیس گولی عہ ترکیب استعمال
کا پرچہ ہمراہ ہوگا۔



ممسک خاص



ملک کے نوجوانوں میں
سُرعتِ انزال کا مرض
عام طور پر پھیل گیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مباشرت
کی طبعی لذّت سے محروم ہیں بلکہ رفیقۂ حیات سے شرم
کے باعث آنکھیں چار نہیں کر سکتے۔ یہ مرض استقرارِ حمل
نہیں ہونے دیتا اور سلسلہ تولید رُک جاتا ہے بس اس عالمگیر
مصیبت کو دُور کرنے کیلئے ایک ایسی کامیاب دوا کی ضرورت
تھی جو کُلی طور پر اس مرض کا استیصال کر دے چنانچہ انتہائی
کدوکاوش کے بعد "ممسک خاص" کی شکل میں یہ دوا پیش
کیجاتی ہے۔ اب آپ بے کھٹکے وظیفۂ زوجیت ادا کر سکتے
ہیں اور اولاد کی نعمت سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔
ترکیب استعمال۔ ایک گولی سے دو گولی تک دُودھ کے
ہمراہ مباشرت سے دو گھنٹہ قبل
استعمال کریں۔ قیمت فی درجن
ایک روپیہ (عہ)



مشہور دواخانہ "فراشخانہ" دہلی

اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت



اس بیچارے کو دیکھئے سر پکڑے ہوئے اپنی قسمت کو رو رہا ہے۔ جریان نے اس کی قوت چھین لی ہے۔ پیشاب کے ساتھ دھات گرتی ہے۔ روز رات کو کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ چہرہ زرد ہے۔ کمر میں درد ہے۔ دل اُداس ہے۔ کسی کام پر جی نہیں لگتا۔ ہاضمہ بھی خراب ہے۔ قبض رہتا ہے۔ بھوک نہیں لگتی۔ زندگی سے بیزار ہے۔ مرنے پر تیار ہے۔ یہ سب خرابیاں جریان کی پیدا کردہ ہیں اور ان کا صرف ایک ہی تیر بہدف علاج ہے:۔

سفوفِ یابس

"سفوفِ یابس" حیرت انگیز طور پر رقیق منی کو گاڑھا کر دیتا ہے اور سیلان کو اس طرح روک دیتا ہے جس طرح تیز رفتار ٹرین کو بریک۔ امساک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ احتلام رفع ہو جاتا ہے۔ نظامِ جسمانی میں کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ جس طرح بہار خزاں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہے اور پتہ پتہ شاداب ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی کا مُرجھایا ہوا پھول شگفتہ ہو جاتا ہے۔ آج ہی سفوفِ یابس منگا کر تجربہ کیجئے۔

قیمت فی بکس ہبنیں ۲ خوراک ایک روپیہ چودہ آنہ (عہ/ ۱ر)
ترکیب استعمال خوراک کے ہر پیکٹ پر تحریر ہے۔

مشہور دواخانہ فرشخانہ دہلی

بولے مجھے مس روز! .... کاؤس جی یقیناً آپ مجھ سے زیادہ روز کے مستحق ہیں، مگر میں آپ سے بھیک مانگتا ہوں۔

کاؤس جی غور سے ڈاکٹر کے مُنہ کو دیکھنے لگے جو اسوقت حد سے زیادہ پریشان نظر آرہے تھے، پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب میں کچھ کچھ آپ کا مطلب سمجھ گیا، آپ میری بہن مس شیریں کے متعلق کچھ کہہ رہے ہیں،

نہیں مسٹر کاؤس شیریں کو میں بالکل نہیں جانتا۔ میں مس روز کے معاملہ میں .... جن سے غالباً .....

ڈاکٹر صاحب، روز اور شیریں ایک ہی ذات کے دو نام ہیں مس روز ہی میری چھوٹی بہن ہے،

جمشید جی پاگلوں کی طرح بھیانک صورت بنا کر کاؤس کو دیکھنے لگے، جیسے وہ کوئی گہرا خواب دیکھ رہے ہوں۔ جس سے دفعۃً انھیں بیدار کر دیا ہو اور جاگتے ہی وہ اپنے حافظہ پر زور دیکر آہستہ آہستہ اپنے ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

مسٹر کاؤس —— وہ بہت زیادہ موٹی اور بھدی آواز میں بولے روز سے میں ابھی ابھی آپ کی کوٹھی پر مل چکا ہوں یہی روز آپکی بہن ہیں؟

جی ہاں یہی روز اور یہی شیریں میری بہن ہے۔ مس شیریں پہلے مس روز سے موسوم تھی اور آپ اسی نام سے اسے جانتے ہیں، شیریں میرے انگلینڈ جانے کے بعد خفا ہو کر گھر سے چلی گئی تھی، اور عرصہ تک مختلف مقامات پر سکونت پذیر رہی، اسی عرصہ میں ہمارے والدین کا انتقال ہو گیا، میں لندن میں رہ پڑا اور شیریں یہاں رہی۔ وہاں سے واپس آکر میں نے شیریں کی تلاش ہی کو اپنا مقصد حیات بنا لیا، میں ہندوستان کے تمام شہروں میں اسے ڈھونڈتا پھرا، اسی سلسلہ میں آپکے یہاں گیا میں نے سُنا تھا کہ چند پارسی لڑکیاں وہاں حال ہی میں نوکر ہوئی ہیں۔ اتفاق سے میں خود وہاں زخمی ہو کر آپ کے زیر علاج ہوا۔ اور یہی اتفاق میری کامیابی کا سبب بن گیا، میں نے شیریں کو تو ڈھونڈ لیا اور ایک دن چپکے سے وہاں سے چلا آیا، پھر اپنے چچا کو بھیجکر شیریں کو بُلا لیا، پہلے وہ خود اچھی طرح نہ جانتی تھی میں کون ہوں، بھولے ہوئے خواب کی طرح اسے بعض باتیں یاد تھیں یہ محض قدرت کی رہنمائی تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے حد درجہ مانوس ہو گئی تھی، گذشتہ ہفتہ میں اُسے تمام واقعات بتا دیے گئے ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب آپ میرے دوست اور محسن ہیں میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپنے میرے اور شیریں کے ساتھ جو احسانات کئے ہیں انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

ڈاکٹر اب بھی حیرت اور استعجاب کے ساتھ کاؤس جی کے مُنہ کو تک رہے تھے

رحمت کا مستحق مرا رنگین قصور تھا

نشانِ تغزل

از محمد خورشید حسین صاحب نازش [illegible] دہلوی ساکن جبلپور

ہر جبر کو [illegible] کا شعور تھا
میری خوشی میں شائبۂ غم ضرور تھا!

[illegible] خیال کی رفعت سے دور تھا
میری خوشی میں [illegible] غرور تھا

[illegible] ہستی میں طور تھا
دل سے بلند تر ترا اوجِ غرور تھا

[illegible]
پابندیوں میں ایک مقام غرور تھا

[illegible]
آئینہ خیال [illegible] شعور تھا!

[illegible]
[illegible] مقصد ضرور تھا

[illegible]
[illegible] نور تھا

[illegible]
[illegible] دور تھا

[illegible]
جبتک کہ میرا [illegible] ضرور تھا

[illegible]
[illegible] چور تھا

[illegible]
رحمت کا مستحق مرا رنگین قصور تھا

[illegible] اس صحیفہ پہ اسکو عبور تھا!

۴ جیسے کوئی دیہاتی پوری توجہ اور حیرانی کے ساتھ پہلی مرتبہ سینما کا کوئی فلم دیکھ رہا ہو، —— کاؤس جی زخمی ہو کر جمشید جی کے زیر علاج ہوئے تھے اور انکی بے التفاتی کے باوجود صحت یاب ہو گئے تھے، اب جمشید جی اپنے "زخم دل" کا علاج کاؤس جی کے سپرد کر چکے ہیں، اور نہایت بیتابی کے ساتھ اندمال جراحت کا انتظار کر رہے ہیں۔

ان کی حالت برابر خراب ہوتی گئی، اپنے فن پر بھی وہ پوری توجہ صرف نہ کر سکے۔

جمشید کو پورا یقین تھا کہ روز کاؤس کے پاس گئی ہوگی اور یقیناً دونوں نے پہلے سے طے کر لیا ہوگا کہ شہر چھوڑنے کی صورت کیا ہوگی ورنہ یکے بعد دیگرے ایک خاص ترتیب اور نظام کے ساتھ جانے کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں

جمشید نے بڑی کوشش سے کاؤس جی کا پتہ معلوم کیا اور وہ سیدھے کاؤس جی کے پاس پہنچے جو آجکل پونا میں مقیم تھے۔

ڈاکٹر جمشید کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ مس روز کاؤس جی کی کوٹھی پر موجود تھی کاؤس جی اسوقت مکان پر موجود نہ تھے، جمشید نے روز کو اطلاع دی وہ فوراً باہر آئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیسے مزاج تو اچھا ہے؟

مزاج اچھا نہ ہوتا تو میں ہسپتال میں نہ ہوتی!

میرا تجربہ یہ ہے کہ آدمی کا مزاج خراب ہوتا ہے تو وہ ہسپتال چھوڑ دیتا ہے، مجھی کو دیکھئے اور پھر اب تو ہسپتال ہی آپکے گھر آگیا۔

یعنی آپ؟

جی ہاں میں!

غالباً آپ یہ بھول گئے کہ تندرستی کے وقت ڈاکٹر کا وہی درجہ ہوتا ہے جو امن کے زمانہ میں تلوار کا!

مس روز میں ڈاکٹر بنکر یہاں نہیں آیا، مریض بنکر آیا ہوں میری بیماری کا علاج تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔

میں نے تیمارداری سیکھی ہے علاج کرنا میں نہیں جانتی آپ مہربانی کرکے کہیں اور جائیے۔!

جہاں آپ بھیجنا چاہیں میں چلا جاؤں؟

آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہونگے کہ دماغی بیماریوں کے مریضوں کو کہاں جانا چاہیے۔

میں کچھ نہیں جانتا روز مجھے اچھا کر دو!

ڈاکٹر صاحب میں کہہ چکی کہیں اور جائیے۔

اچھا کاؤس جی کہاں ہیں؟

کہیں باہر گئے ہیں ایک گھنٹہ کے اندر آجائینگے۔

ان کی شادی تو ابھی نہیں ہوئی؟

— اب ہونے والی ہے۔

مس روز، میں یزداں کا واسطہ دیکر التجا کرتا ہوں مجھ پر رحم کرو، کاؤس جی کا اتنا حق تم پر نہیں ہے جتنا میرا ہے۔

یہ بات غلط ہے ڈاکٹر صاحب، مجھ پر کاؤس جی کا حق بہت زیادہ ہے روز نے ہنسکر کہا۔

اچھا کاؤس جی کے صدقہ ہی میں میرے ساتھ انصاف کرو، دیکھو کاؤس جی میرے علاج سے تندرست ہوئے ہیں، میری فیس بھی باقی ہے اور تم نے ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب، یہ بات کہتے وقت آپ کو ذرا اپنا دل بھی ٹٹول لینا چاہیئے تھا۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپنے کاؤس جی کی بیماری میں حد درجہ تغافل اور بے اعتنائی سے کام لیا، کیا آپ کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہ اچھے نہ ہوں، اگر یہ صحیح ہے تو آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ ایسے خطرناک ڈاکٹر کو فیس دینا چاہیئے یا سزا؟

— مس روز، سزا تو مجھے بہت مل چکی!

میں ہرگز یہ تسلیم نہیں کرونگی کہ آپ نے اپنے جرم کی سزا بھگت لی۔

آپ کو معلوم ہے کاؤس جی کی جان کی کیا قیمت ہے؟

ان کی جان بہت زیادہ قیمتی ہے روز، ڈاکٹر نے عجیب انداز سے روز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی لئے میری فیس بھی بہت زیادہ ہونی چاہیئے! اور اگر آپ عدالت انصاف میں سزا کے مستحق ٹھیریں تو اسی نسبت سے سزا بھی بہت زیادہ ملنی چاہیئے۔

ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور اس کی بیکسی و مجبوری رحم کی التجائیں کرنے لگی

۵

کاؤس جی نے جمشید کو دیکھتے ہی پہچان لیا، وہ بڑے تپاک سے پیش آئے اور ڈاکٹر جمشید کی بڑی آؤ بھگت کی، کاؤس جی ان کے بہت ممنون تھے انھوں نے کاؤس جی کے علاج میں بڑی ہمدردی اور کوشش کی تھی آج انھیں یہ موقعہ حاصل ہوگیا تھا کہ جمشید جی کے ان احسانات کا عملی اعتراف کر سکیں۔

جمشید جی حد سے زیادہ پریشان اور مضطرب تھے ان میں ضبط کی قوت بالکل نہ رہی تھی، ان کی خواہش تھی کہ جسقدر جلد ممکن ہو کاؤس جی سے اپنا مدعا بیان کر دیں۔ چنانچہ کاؤس جی ذرا خاموش ہوئے تو جمشید جی جلدی سے بول اٹھے، مسٹر کاؤس میں ایک بڑے ضروری کام سے آیا ہوں مجھے امید ہے آپ میری مدد کرنے میں ذرا بھی دریغ نہ کرینگے!

ڈاکٹر صاحب میں آپ کی امداد کرکے جتنا خوش ہو سکتا ہوں اتنا کسی اور چیز سے خوش نہیں ہو سکتا، کاش واقعی طور پر میں آپ کی مدد کر سکتا فرمائیے کیا کام ہے؟

کاؤس جی! — انھوں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا اور خاموش ہوگئے،

کہیے، ڈاکٹر صاحب بے تکلف کہیے، روپے کی ضرورت ہے آپ کو؟

نہیں کاؤس جی [illegible] طلب نگاہوں سے کاؤس جی کو دیکھکر

معروف رہیں۔

پھر تم اس آگ پر پانی کیوں نہیں ڈال دیتیں ؟

یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے۔

اگر تمہارے اختیار میں ہو تو ؟

پھر میں یہ سوچوں گی کہ پہلے اپنے گھر کی آگ بجھاؤں یا آپکے گھر کی۔

تمہارا گھر تو ان شعلوں سے محفوظ ہے۔

فرض کیجئے آپکا قیاس غلط ہو تو کیا مجھے اپنے ساتھ ہمدردی کرنی چاہئے یا آپکے ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ خطرہ کی صورت میں آپ مجھے بچانا پسند کرینگے یا خود اپنا بندوبست کرینگے ؟

مس روز، معاف فرمائیے بات یہ ہے کہ آدمی بہت خود غرض ہوتا ہے۔

اور اگر وہ آدمی، ڈاکٹر بھی ہو؟

روز، انسان پہلے آدمی اور پھر ڈاکٹر ہو سکتا ہے!

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے ساتھ ہمدردی کرینگے اگر خدانخواستہ آپ کو اور مجھے ساتھ ساتھ دو کالے ناگ ڈس لیں تو پہلے آپ اپنے ہاتھ میں انجکشن لگائینگے پھر میری طرف متوجہ ہونگے بشرطیکہ میں اسوقت تک زندہ رہ سکی۔

روز! تمثیلات کے فن میں تمھیں مرزا صاحب کا رتبہ حاصل ہے مگر عملی دُنیا سے ان مثالوں کو کیا تعلق، یہ معاملہ تمہاری نظیر سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، تم تو صرف یہ بتاؤ کہ زندگی کے معرکہ میں میرا ساتھ دوگی یا کاؤس کا؟

ممکن ہوا تو دونوں کا ورنہ ایک کا بھی نہیں!

دونوں کا! یہ کیونکر ممکن ہے مس روز؟

کیوں ممکن کیوں نہیں، امریکہ روس کا بھی ساتھ دے رہا ہے اور برطانیہ کا بھی، بلکہ آسٹریلیا کا آپ اور اضافہ کر سکتے ہیں۔

روز یہ تو بالکل ناممکن ہے۔ ہمارے معاملہ کو غالباً تم نے سمجھا ہی نہیں

روز مختصر طور پر مجھے بتا دو، کاؤس جی کو اور مجھے دہکتی ہوئی آگ کے قریب کھڑا کرکے ایک شخص تم سے کہے کہ دونوں میں سے ایک کو اس آگ میں دھکیل دو تو اس موقعہ پر تم کسے دھکیلنے کی کوشش کروگی؟

آپ دونوں کو بچا کر اس تیسرے آدمی کو دھکیل دونگی،

ارے تو یہ اس کا کیا ذکر ہے یہاں؟

کیوں ذکر کیوں نہیں بنائے فساد تو وہی ہے!

روز! مریضوں سے مذاق نہیں کرنا چاہئے۔

۔ کیا میں جنون کا مریض ہوں؟

معاف فرمائیے آپ کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

روز میں اپنا معاملہ بالکل صاف کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں تمھیں اپنا لوں۔ میری رائے میں میرا یہ مقصد کاؤس کی موجودگی اور دخل درمعقولات کی بنا پر پورا ہونے میں نہیں آتا۔

کاؤس نہ ہوں تو بھی آپ میری منشار کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

موجودہ صورت میں تو سوال کاؤس جی کی موجودگی کا ہے۔

ڈاکٹر جمشید! آپ نے مجھے ایک جائداد سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے جس طرح آپ مجھے اپنانے کی تمنا رکھتے ہیں اور اسے پورا کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ اسی طرح میں بھی کسی کو اپنانے کی آرزو اور اسے پورا کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔

بالکل ٹھیک ہے مس روز، میں یہی کہہ رہا ہوں پھر اب بتائیے کاؤس یا جمشید؟ ـــ کون ہے جسے آپ اپنانا چاہتی ہیں۔

جمشید! کیا اس کا فیصلہ آپ خود نہیں کر سکتے؟

میں آپکے مُنہ سے آپ کا فیصلہ سُننا چاہتا ہوں۔

حالانکہ یہ فیصلہ میرے مُنہ سے نہیں میرے دل سے متعلق ہے۔

کہیں سے سہی بتائیے تو۔

دل کی باتیں بتائی نہیں جایا کرتیں، ڈاکٹر جمشید آنکھیں ہوں تو دیکھ لیجئے!

ـــــ ۴ ـــــ

جمشید کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی وہ ناکامی کے صدمہ سے یا صحیح معنی میں ناکامی کے مہیب تصور سے حواس باختہ سے ہوگئے تھے۔ اسی درمیان میں کاؤس جی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر شہر سے چلے گئے، پھر مس روز نے ملازمت چھوڑ دی، ان تمام باتوں نے جمشید کے دماغ پر بہت خراب اثر کیا، وہ ہر وقت کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔

مس روز ملازمت چھوڑ کر وہاں نہ رہ سکی اور جلد ہی کہیں چلی گئی۔

چلتے وقت اس نے یہ دو حرفی خط ڈاکٹر جمشید کو لکھ دیا۔

پیارے ڈاکٹر!

میں جا رہی ہوں، مگر آپکے احسانات کا بوجھ محسوس کر رہی ہوں، خدا کرے آپ ہمیشہ خوش رہیں۔

آپکی

روز

نہ چھوڑنا۔

روز جوان تھی اور جوانی کی قدرتی رعنائیاں اسکے سراپا سے نمایاں تھیں۔ وہ گلاب کا ایسا درخت تھی جس میں پتوں سے زیادہ پھول ہوں اور کونپلوں سے زیادہ کلیاں۔

کاؤس میں جمالیاتی حُسن موجود تو ضرور تھا، مگر اس کی موجودگی کا پتہ کبھی نہ چل سکا، وہ جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ سن وسال کے اعتبار سے جوان اور عقل ودانش کے لحاظ سے بوڑھے، انھوں نے روز کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت آنکھوں سے محبت کا میٹھا میٹھا رس ٹپکتے ہوئے دیکھا اور اس کے شگفتہ چہرہ پر معصومیت کی ایسی جھلک نظر آئی جو چمن سے دُور کھلنے والی کلیوں میں تو دیکھی جاسکتی ہے مگر چمن کے اندر جہاں گلچینوں کی نگاہِ انتخاب کھلنے سے پہلے ہی "حُسن فطرت" کی توہین کرنے لگتی ہے، یہ خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ کاؤس جی کا دل، روز کیطرف کھنچا اور آہستہ آہستہ کاؤس جی اور مس روز کے درمیان ایک ایسا روحانی علاقہ قائم ہوتا رہا جو دونوں کی قوتِ ارادی کے اثر ونفوذ با ہر تھا۔ اگرچہ اسے محبت کے علاوہ کسی اور جذبہ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس محبت میں "صنفیات" کی قسم کی کوئی چیز شامل نہ تھی۔ جس حد تک کاؤس جی کی ذات کا تعلق ہے اس صورت کو ان کے فطرے جمود سے منسوب کیا جاسکتا تھا۔ بشرطیکہ مس روز کی کیفیت اس سے جداگانہ ہوتی۔ روز کاؤس جی کو پسند کرتی تھی، بہت زیادہ پسند، پھر بھی یہ ایسی پسندیدگی نہ تھی جو اس کے اور ڈاکٹر جمشید کے درمیان کارفرما تھی۔

جمشید مقامی ہسپتال کے کامیاب اور نامور ڈاکٹر تھے، جو روز سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ روز کی موجودہ ملازمت انھیں کی توجہ کا نتیجہ تھی، روز احسان کے اس بوجھ کو محسوس کرتی تھی۔ اس نے جمشید جی کے جذبات کی پذیرائی میں بھی فراخدلی سے کام لیا تھا۔ مگر بہت احتیاط کے ساتھ۔ جمشید جی ابتک یہ نہ سمجھ سکے تھے کہ روز ان کی نگاہوں کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ جب کسی موقعہ پر جمشید جی نے اس سے کوئی ایسا تذکرہ کیا اس نے صاف کہدیا کہ میں آپ کی خواہش کو پورا کرنے سے معذور ہوں۔ محبت کوئی ایسی جنس نہیں جسے احسان کا بدلہ قرار دیا جاسکے۔ احسان ایک لطیف اور روحانی جذبہ کا اثر ہے۔ اور محبت مستقل طور پر ایک جذبہ ہے، جو پیدا نہیں کیا جاسکتا، نہ بجھایا جاسکتا ہے۔

روز جب تک ایسی فضا میں رہی جہاں جمشید جی کے سوا اسکے حُسن و جمال کا کوئی تماشائی نہ تھا اسوقت تک ان کے دل ودماغ میں کامل سکون رہا اور جب آفتاب کی کرنیں دُور دور تک پھیل کر روشنی پیدا کرنے لگیں تو جمشید جی کا دل رشک کی آگ سے جلنے لگا۔ خصوصًا اسوقت جب کاؤس جی اور روز کے تعارف کا انہیں علم ہوا۔ اس تعارف کو انھوں نے اپنی بربادی کے مترادف خیال کیا اور انھیں ہر وقت یہ شبہات تکلیف دینے لگے کہ کاؤس جی روز کو ان سے چھین لینگے، اور وہ عرصۂ حیات میں تنہا رہ جائینگے۔

ایک دن کاؤس جی کار میں بیٹھے ہوئے کہیں جا رہے تھے، ڈاکٹر اور روز بھی ہوا خوری کو ساتھ ساتھ نکلے، کاؤس جی نے ہارن دیا، روز اتنی بوکھلائی۔ کہ پہلے ایک طرف بچکر پھر سڑک کی جانب آگئی۔ کاؤس جی نے روز کو بچانے کی پوری کوشش کی، انھوں نے دیکھا، روز بالکل سامنے ہی آگئی تو نہایت جرأت کا ثبوت دیا اور موٹر کو دوسری طرف موڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موٹر پُل سے ٹکرا گئی، اور کاؤس جی کے سر میں کافی چوٹ آئی۔ جمشید جی نے کاؤس جی کو فوراً ہسپتال میں داخل کرکے آپریشن کیا۔

جمشید ڈاکٹر تھے اور ان کی شہرت وناموری اس امر کی قوی دلیل تھی کہ وہ ہمدرد اور اپنے فن کے بہترین ماہر اور واقف کار ہیں۔ مگر کاؤس جی کا معاملہ ہی کچھ عجیب نوعیت کا تھا۔ جمشید جی کو یقین تھا کہ روز کاؤس جی کی طرف زیادہ ملتفت ہے۔ اس نے اکثر جمشید سے کاؤس جی کے حُسنِ اخلاق کی تعریف کی تھی جمشید کے نزدیک کاؤس جی کی حیثیت ایک خطرناک حریف کی سی تھی۔

کاؤس جی کے زخم جسقدر مندمل ہو رہے تھے جمشید کے دل میں اتنے ہی گہرے ناصور پیدا ہوتے جا رہے تھے، جمشید نے دیدہ ودانستہ کاؤس جی کے علاج کو خراب تو نہ کیا مگر ان کو کاؤس جی سے اس عرصہ میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہ رہی۔ اگر روز اتنی کوشش نہ کرتی اور جمشید کو بار بار مجبور کرکے کاؤس جی کی معقول نگرانی نہ کراتی تو یقینًا وہ اتنی جلدی اچھے نہ ہوتے۔ جمشید کو خوب معلوم تھا کہ ان کی تندرستی میں اس کی محنت اور کوشش سے زیادہ روز کے خلوص کو دخل ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کاؤس جی کی صحت ان کی بیماری کے برابر ہے مگر روز کے خلاف وہ کچھ نہ کر سکتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ کاؤس جی بالکل تندرست ہوگئے اور ایک مہینہ کے اندر ہی اپنے گھر چلے گئے۔

۳

کاؤس اور روز میں کافی تعلقات ہوگئے تھے۔ روز نے ان کی تیمارداری اتنی دلسوزی کے ساتھ کی تھی کہ اس کے لئے کاؤس جی کے دل میں کافی جگہ نکل آئی تھی۔ وہ ڈاکٹر اور نرس دونوں کے احسان مند تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ دونوں نہ ہوتے تو اس حادثہ سے زندہ بچکر نکل جانا ممکن نہ تھا۔

کاؤس جی کے صحت یاب ہوتے ہی ڈاکٹر جمشید نے محسوس کیا کہ میری زندگی خطرے میں ہے اور جلد ہی کوئی وقت ایسا آسکتا ہے جب زندگی اور روز دونوں میں سے کسی ایک کو خیر باد کہنا پڑیگا۔ خطرے کے احساس سے جمشید کے دل ودماغ میں ایک آگ سی لگ گئی اور وہ زیادہ ضبط نہ کرسکے انھوں نے ایک دن روز سے کہا میں [illegible] دل کو زیادہ عرصہ تک محبت کی آگ میں جلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا! یقینًا میں بھی پسند نہیں کرتی۔ کہ آپ کباب سازی کے اس مکروہ مشغلہ میں

سردی

از ضیاء الملک ملا رموزی صاحب

محترم ملا رموزی صاحب نے "سردی" کا جو انوکھا مگر دلچسپ نظریہ پیش فرمایا ہے حقیقت میں وہ اختراع دماغی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ شاید ایسے ہی دماغ یورپ والے خرید لیتے ہیں۔ اس مضمون کو تفریحی نظر سے نہ دیکھئے بلکہ غور فرمائیے کہ اس میں ایک درس عمل بھی ہے یعنی فرض کی راہ میں اگر کوئی روک حائل ہو جائے تو ہمت سے کام لے کر اسے دور کر دینا چاہیئے جس طرح سردی میں کسان اور دھوبی پروا نہیں کرتے بلکہ استقلال کے ساتھ اپنا فرض ادا کئے جاتے ہیں۔ ایڈیٹر

ساری دنیا آج تک اس خیال سے مست ہے کہ زمین و آسمان سے جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوتا ہے مگر اس تحقیق و مشاہدہ کا سہرا مجھ چار بیویوں والے دولھا کے سر ہے کہ یہ عقیدہ کافی حد تک غلط ہے۔ البتہ چار بجے رات کو اُٹھ کر ٹھنڈے پانی سے نہا کر باغات اور کھیتوں میں طلوع آفتاب سے قبل تک نسیم سحری کے کیمیادی فوائد حاصل کرنے کے لئے یہ دُبلا پتلا ملا رموزی جو گھومتا رہتا ہے تو اس تجربہ کے کڑاکے کے جاڑے ہیں اس نے جو کچھ تحقیق کیا وہ یہ ہے کہ

متعدد پیداواریں ایسی بھی ہیں جن کے لئے انسان کا جان سے مارا جانا، انسان کا دفن ہو کر کھاد بن جانا ضروری ہے تب وہ پیداواریں جوان ہوتی ہیں پکتی ہیں اور فروخت ہوتی ہیں، چنانچہ ایسی پیداواریں جو انسان کو ہلاک کر کے تیار ہوتی ہیں یہ ہیں، گوبھی، پالک، مولی، میتھی، شلجم، سبز دھنیا، بیگن، گاجر، ٹماٹر، سیم، مٹر، سویا، مونگ پھلی اور امرود، وغیرہ

اب یہ وہ پیداواریں ہیں جو عین اُس شدید ترین جاڑے میں جوان ہوتی ہیں جب ہندوستان میں ہزاروں انسان جاڑے کی شدت سے دوہرے نمونیا، فالج، گٹھیا، لقوے اور گردن توڑ بخار یا پھر تنگدستی کے ہاتھوں درختوں کے نیچے ٹھٹھر کر اور اکڑ کر جان دیدیتے ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ اگر جاڑا انسان کے لئے پیدا کیا جاتا تو وہ اتنا معتدل ہوتا کہ انسان برداشت کر لیتا لیکن میرا اطمینان ہے کہ اگر جاڑا اتنے زنائے کا نہ ہو تو گوبھی، مولی، شلجم، مٹر، بیگن اور سیم کو وہ جوانی وہ شباب اور وہ توانائی حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو شدید پالے سے حاصل ہوتی ہے لہٰذا میرا یہ نظریہ صحیح ہے کہ ساری کائنات انسان کے لئے نہیں بلکہ نظام فلکی وارضی کی کچھ لطافتیں "انسان توڑ" اور "ترکاری جوڑ" بھی ہیں مگر افسوس کہ میں اپنی اس نادر تحقیق اور عقل افروز نظریہ کو ہندوستان میں پیش کر رہا ہوں، کاش میں یورپ میں یہ بات کہتا۔

اب یہاں تک تو تھا معاملہ جاڑے کی کیمیادی تحقیق کا سو میں نے ثابت کر دیا کہ اس موسم کا مقصد انسان سے زیادہ نباتات کو پرورش کرنا ہے۔ لہٰذا اب جو بیچارہ انسان اس عذاب میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس نے اس سے محفوظ رہنے کے جو حصول و اسباب فراہم کئے ہیں ان کی بانگی ملاحظہ ہو،

۱- چنانچہ اس موسم میں دولت مندوں کے مکانوں میں دولت کے بل پر ایسے آفتاب یا ایسے قمقمے یا ایسے آلات استعمال کئے جاتے ہیں جو تمام کمرے یا مکان میں گرم شعاعیں خارج کرتے ہیں اور اس سے سردی اس علاؤ میں دم توڑ دیتی ہے اور دولت مند صبح تک پاؤں پھیلائے خرّاٹوں سے ملازمین کا دم گھونٹتے رہتے ہیں۔

۲- دولت مندوں کے مکانات دولت کی کثرت کی وجہ سے اسٹالن گراڈ کے جرمن مورچوں اور سنگین دمدموں کی طرح ہواؤں کے گزر سے محفوظ ہوتے ہیں اس لئے سردی ان کے مکانوں کے باہر ہی کھڑی بھنایا کرتی ہے اور ان لوگوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ البتہ ان کے محلات، کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والے ملازمین کو ان کے برابر کے حقوق حاصل نہیں ہوتے اس لئے ان میں کی ماماؤں میں کی سکینہ بی اور ان میں کے خانساماؤں میں کے شیخ عیدا نمونیا اور شدید زکام میں ڈھول بنے پھرتے ہیں یا مرتے ہیں۔

۳- دولت مندوں کے پاس محض دولت کی وجہ سے سردی سے محفوظ رہنے کے درجہ اول کے یورپی نقالی کے کپڑے ضرورت سے زیادہ اور قیمت سے زیادہ ہوتے ہیں اس لئے سردی ان کو نہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتی ہے نہ عینک چڑھا کر،

۴- دولت مندوں میں محض روپیہ کی کثرت سے پوری طب یونانی کے حلوے موجود رہتے ہیں اور تمام چوپایوں کے مار الحم سے ان پر سردی کا اثر ہونے کے عوض اُلٹا موتی جھرے کا بخار سوار رہتا ہے اور ایسی ہی دولتی طاقت سے حاصل کی ہوئی چیزوں کے بل پر اس طبقے میں صبح کو ٹھنڈے پانی سے نہانے اور ایک تن زیب کے کرتے پر پورے جاڑے کا موسم گزار دینے کو فخر سمجھا جاتا ہے۔ گویا مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں دو سوا دو ماہ کے جاڑے سے حفاظت کے نام پر دولتمندوں کا کئی لاکھ روپیہ

یورپی کپڑے کی خرید، اور بعض ڈاکٹری گرم کھانے پینے کی چیزوں کی خرید کے نام سے
یورپ پہنچ جاتا ہے اور ہندوستان کے پارچہ ساز اور ہندوستانی حکما بیٹھے ان کی
یورپ پرستی کو رو دیا کرتے ہیں۔

متوسط طبقہ میں محض قلت دولت کے باعث نیم یورپی اور نیم ہندوستانی
زندگی ہونے کی وجہ سے نصف رقم دیسی حفاظتی اشیاء اور نصف یورپی حفاظتی اشیاء
پر خرچ ہوتی ہے گویا متوسط طبقہ بھی کئی لاکھ روپیہ جاڑے میں یورپ بھیج دیتا ہے۔
اب رہا طبقہ ادنیٰ تو اس میں کے بعض بدھوا ور گھسیٹا بھی اس حد تک کے
یورپ پرست واقع ہوئے ہیں کہ ان کے سامنے یورپ کے اچھے اچھے فیشن زدہ
شرماتے ہیں، اس لئے اس طرح کے خام دماغ تو قلیوں اور تانگے والوں میں بھی چیسٹر
ڈاٹے ہوئے نظر آجائیں گے لہذا اصل غریب اور اصل ہندوستانی کی سردی والی
زندگی ان میں تلاش نہ کیجئے بلکہ وہ ذیل کی صورتوں میں نظر آئیگی۔ چنانچہ سردی کے متعلق

بعض کا خیال ہے کہ سردی کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رہنے کا
سب سے بہتر اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ چاہے چہرہ اور صورت لنگور کی سی بن جائے لیکن سر پر
روئی کا ٹوپ اس طرح جمایا جائے کہ اُس کے بند عین داڑھی کے زیر سایہ بندھے ہوں
اور گردن گھمانا مشکل ہو جائے۔ اس طرح کے "سردی بچاؤ ٹوپ" کھانسی اور دمہ
کی عمر کے لوگوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں، یا محض مرغ اور تیتر لڑانے والوں میں،

بعض زور دیتے ہیں کہ نہیں نہیں سردی کا بہترین توڑ یہ ہے کہ عام اس
سے کہ صورت بھٹیاروں سے مشابہ ہو جائے لیکن جاڑے جاڑے ایک وزنی
عمامہ سر پر اس طرح کس لیا جائے کہ اس کی دُم بجائے لٹکنے کے گلے میں لپٹی رہے
اور یہ وہ طبقہ ہے جس کے عقیدے میں سردی کے داخل خارج ہونے کا راستہ سر کی
گھائی سے گزرتا ہے۔

بعض کا یقین ہے کہ ساری طب اور ڈاکٹری غلط بس جو کچھ بھی ہے
وہ گلا ہے، لہذا سردی کے تمام موسم میں گردن سیدھی رہتے رہتے چاہے کباب کی
سیخ بن جائے یا جیل خانے کی سلاخ لیکن خدا جو کچھ دے اُس سے گلے کو کس
لو، لہذا سردی کے اس "گلہ بند بچاؤ" سے وہ بچے بجید مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں
جن کے گلے موٹے گلوبند سے باندھ کر پھر ان کو ڈھیلا کرنا بھلا دیا جاتا ہے۔ اور وہ
ٹیڑھی گردن والے کو ترنے دن کے گیارہ بجے تک گھر سے باہر اکڑے اور اینٹھے
پھرتے ہیں، گردن کو سردی سے بچانے کی اس دھن میں میں نے بعض پنشن کی عمر
کے قریب پہنچے ہوئے انگریزی محرروں کو دیکھا ہے کہ وہ انگریزی سوٹ پر عمامہ
ڈاٹ کر اس کی دُمچی سے گلے کو کس لیتے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ غلط بس جو کچھ ہے وہ یہ کہ سردی کے
تمام موسم میں ایک ڈلائی یا ایک کمبل یا ایک دھسا ہر آن و ہر لحظہ شانوں پر لٹکا رہے
عام اس سے کہ سردی میں اُتار چڑھاؤ ہو یا نہ ہو، یہ لوگ انسان کی اُس قدیم نسل سے
ہیں جو بارش کے پورے چار ماہ چھتری ساتھ رکھتے ہیں خواہ بارش ہو رہی ہو یا مطلع صاف ہو

بعض کا اعتقاد ہے کہ سردی کے بچاؤ کے تمام طریقے ناقص ہیں اور گرجن
کی علامت، البتہ صحیح ترکیب یہ ہے کہ روئی کے دغلے کے ساتھ روئی کا پاجامہ بھی پہنا
جائے جو لباس میں گرم پتلون کا مورث اعلیٰ مانا جاسکتا ہے۔

بعض کا "سردیانہ نظریہ" یہ ہے کہ سردی اگر سر سینے پیٹ کمر اور ٹانگوں
کے ذریعہ نقصان پہنچا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ پاؤں کے پنجوں سے داخل نہ
ہو لہذا سردی کی حفاظت کے لئے اگر موٹا موزہ پہنا جائے تو وہ پاجامہ کے اوپر گھٹنوں
کے نیچے تک اس طرح چڑھا رہے کہ اس کے چندی کے بند جوتوں پر پڑے رہیں اور
آدمی گھومتا رہے۔ لیکن ان تمام طبقات میں مُلا موزی جس طبقے سے متفق ہے اُس
طبقہ کا عقیدہ یہ ہے۔ سردی جسم کے کسی حصہ میں داخل ہو ہی نہیں سکتی بجز ناک کے لہذا
صورت چاہے نکٹوں ہی سے مشابہ کیوں نہ ہو جائے مگر ناک کے دونوں نتھنوں پر
نصف چادر اس طرح لپٹی رہے اور اس حد تک لپٹی رہے کہ لوگوں کو پہچان کے
لئے ناک والے سے دریافت کرنا پڑے کہ آپ کا اسم شریف، تب کہیں آپ پہچانے
جائیں ورنہ بے پہچان ہی سہی لیکن ناک ہر حال میں بند ہی رہے۔

بعض غریب مگر مست اور بے علم نوجوانوں کا یہ دستور بھی سردی کو دور ہی
رکھتا ہے کہ صرف ایک کرتے اور معمولی سے بنیائن پر تمام سردی کو بغلوں میں ہاتھ دیے
گاہے تھر تھراتے گاہے گنگناتے دور کرتے رہتے اور جو اس بیچ میں سردی کا کوئی
زوردار چانٹا پڑ ہی گیا تو بے وجہ زور زور سے یوں گانے لگے کہ سے ساون کے
نظارے ہیں، مستانہ اشارے ہیں، للہ لا، میں اُن تانگے والوں کو بھی بجید ادب
کی نظر سے دیکھتا ہوں جو ریلوے اسٹیشنوں پر پچھلی شب کی ریلوں کے مسافروں
کے لئے گھوڑے کے حصہ کا گھاس سردی کے بھاڑ میں جھونکتے رہتے ہیں اور عین
طلوع آفتاب کے وقت سینے کے بال موٹے کُرتے اور مرزائی سے نکالے ہوئے بزبانی
ہوا کے عین سینے پر ہوا کی طرح تانگہ اُڑاتے ہوئے سردی کو بھگانے کے لئے یہ جرمن
ٹیکنیک مصرع استعمال کرتے رہتے ہیں کہ سے چل چل رے نوجوان - آگے بڑھا قدم
میں اُن "گھریلو اولیا اللہ" کا بھی بجید احترام کرتا ہوں جو بڑھاپے کے ذخیرہ سے
تمام رات کھانسی پیدا کر کے گھر کو چہل پہل کا مقام ثابت کرتے رہتے ہیں اور صبح
آفتاب سے پہلے کھلے میدانوں، باغوں، جنگلوں اور ویرانوں میں تفریح کے نام سے
گھومتے نظر آتے ہیں اور بعض تو اس وقت ٹھنڈے پانی سے نہاتے بھی ہیں۔

دیہاتی لوگوں کو میں نے عینک لگا کر دیکھا، ہاتھ سے مس کر کے دیکھا،
سونگھا، گھورا، غرض معائنہ کے تمام طریقے ختم کر دیئے مجھے تو صاف صاف
نظر آتا ہے کہ ان لوگوں پر کہیں سیاہ اور کہیں بھورے ٹٹیالے رنگ کا کوئی ایسا
امریکی مصالحہ چڑھا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کے دن رات ننگ دھڑنگ
رہنے پر بھی ان پر نہ سورج اثر کرتا نہ چاند لہذا ان کے ہاں سردی وردی سے

بچاؤ کے لئے جو کچھ ہو جائے گویا سردی پر اُنھی کا احسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے جو کروڑوں بیاہیوں میں اربوں ٹن اون اور روئی خرچ ہونے کے عوض کھادی کی چند چادریں اور جلانے کی کچھ لکڑیاں خرچ ہو کر رہ جاتی ہیں اور تمام دنیا کا نمونیہ اور گردن توڑ بخار ان کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا، حتیٰ کہ مجھے تو شدید پالے اور جاڑے میں بھی محض ایک کھدری چادر کے بل پر دیہاتی کے چہرہ پر جو غرور و اطمینان نظر آتا ہے وہ اطمینان سردی کے زمانے میں شاید دوزخ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے یہ شدید کہرے اور پالے کے زمانے میں عین صبح کی اذان کے وقت صرف ایک چادر کو اوڑھ کر دیہات کے میدانوں کے طوفانی برف کے سینہ کو چیر کر شہر میں گاڑی کو جس اطمینان سے لے آتا ہے اور زکام کی چھینک تک سے واقف نہیں ہوتا ہے تو اس کی اس بے پناہ طاقت کا مزا پوچھئے ان سائنس زدہ لوگوں سے جو ایک ایک ہزار روپیہ کے گرم سوٹ پہن کر بھی آئے دن نمونیہ اور گردن توڑ بخار کی زد میں رہا کرتے ہیں۔

اور دھوبی کی قوم کا تذکرہ تو گویا سردی کا خاصا مذاق اُڑانا ہے۔ کیونکہ خدا کو مُنہ دکھانا ہے اس لئے جھوٹ نہ بولوں گا کہ میں بقلم خود جو روزانہ صبح ہوا خوری کے لئے بیرون شہر جاتا ہوں تو راستہ میں ایک ندی میں دھوبی کو پانی کے اندر اُس وقت کپڑے دھوتا دیکھتا ہوں جس وقت پانی سے سردی کی بھاپوں کا دھواں اصل پانی کو نہیں دیکھنے دیتا، مگر، دھوبی ہوتا ہے کہ نصف کمر تک پانی میں کھڑا حق سرہ کے نعرے بلند کرتا رہتا ہے اور اس پر بھی جب مرتا ہے تو معمولی بخار یا ہیضے اور طاعون سے لیکن وہ نہ سردی کے حلوے انڈے کھاتا نہ چیسٹر اور گلوبند کو جانتا۔

بہر حال یہاں تک تو سردی کے وہ نمونے تھے جو بظاہر سب کو نظر آتے ہیں، البتہ اب مجھے اپنی سردی کے حالات عرض کر کے اس سلسلہ سے کچھ مشورے درکار ہیں جو اگر مل جائیں تو زہے نصیب، چنانچہ میں کامل غور اور برسوں جاڑے مر کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سردی میں زیادہ مشکل اُنھی کو ہے جو حد سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ یعنی سردی کو وہی لوگ زیادہ محسوس کرتے ہیں جن میں حس کی قوت جوان اور زیادہ ہوتی ہے لیکن آپ کہیں گے کہ پھر بوڑھے آدمی کیوں دنیا کے لحاف بنے رہتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ بڑھاپے ہی میں عقل و حس کو جوانی ملتی ہے اسی لئے نوجوانوں کو لونڈا، چھچھورا اور ناتجربہ کار کہتے ہیں اور بوڑھے کو عاقل و پختہ کار اور بزرگ لہٰذا حس کی اس بیداری کے حساب سے اُن نوجوانوں کو بھی زیادہ سردی محسوس ہو سکتی ہے جو گو نوجوان ہوں مگر اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ ذکی و ذہین ہوتے ہیں۔ اور یقیناً یہی سبب ہے جو مُلّا رموزی ہر جاڑے کے موسم میں لحاف پر لحاف اوڑھ کر بھی خود کو مُردہ سمجھتا ہے اور دنیا میں کسی کام کا نہیں رہتا، مگر قضا و قدر کی اس شانِ آتش چھیڑ خانی کو ملاحظہ فرمایئے کہ ساری قوم کا نیازمند مُلّا رموزی سال بھر بنہایت فراغت کے ساتھ اپنے گھر بیٹھا رہتا ہے لیکن قوم کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، لیکن جہاں سردی کے موسم میں شباب آیا کہ دور دراز کے قومی جلسوں میں تقریر کرنے کے بلاوے شروع ہوئے۔ اب جو لوگ تیسرے درجہ میں تین چار لحاف کا بستر مع پانی کے لوٹے کے سفر کرتے ہیں اُن کے دل سے پوچھئے کہ کیسی گزرتی ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ شام ہوئی نہیں گویا مجھے موت نے مُنہ دکھایا۔ چنانچہ مغرب کی نماز کے بعد ہی سے آپ دیکھیں گے کہ کھانا کھلانے والے علاقہ کی عورتوں کے بیچ میں کسی چولھے کا سہارا لئے ہوئے حضرت مُلّا رموزی صاحب آگ تاپ رہے ہوں گے کیونکہ بوڑھا نہ ہونے کی وجہ سے ابھی میں لحاف کے اندر دب کر لیٹ نہیں سکتا ہوں اور اگر لحاف اوڑھ کر بیٹھ جاؤں تو چاروں بیویوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جاؤں، پھر اس پر طرفہ مصیبت بال بچے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ سردی کے موسم میں بال بچے ہی اصل نمونیا اور گردن توڑ بخار ہیں اور وہ اس لئے کہ میں تو خیر بڑے دبدبے سے چولھے کے پاس گرم و خشک بنا بیٹھا رہتا ہوں کہ ناگاہ ایک بچے صاحب نے پانی کا نل کھولا اور منہ دھونا جو شروع کیا تو میری جان پر آبنی اور میں بے ساختہ اس گرمی سے نکلا اور ان کے کان پکڑ کر تین چار چانٹوں کے ہمراہ ان کو کسی کمرہ میں نظر بند کر کے پھر چولھے کے پاس قدرے گرم ہوا ہی تھا کہ دوسرے بچے صاحب بے پاجامہ کے پوری رفتار سے دوڑے اور گھر کے باہر، اب میں لاکھ دھیان بٹاتا ہوں کہ کسی طرح یہ بچہ میرے دماغ میں نہ آئے مگر سردی کی شدت کا ڈر دور نہیں ہوتا، اور میں بچے کی تلاش میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو مجھے مارے شدید جاڑے کے محلے کے گلی کوچوں میں اسٹالن گراڈ کی برفباری کا وہ لُطف حاصل ہو جاتا ہے جس کے بعد میں "نکاح توڑ" اور "اولاد چھوڑ" تحریک کا علم بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ارے بھئی یہ بھی کوئی اولاد پن ہے کہ ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی اور چچا چچی تو صبح سویرے مارے پالے کے ابھی لحافوں ہی میں خودکشی بنے پڑے رہتے ہیں مگر اللہ کی یہ دو دو تین تین بالشت کی بے حس مخلوق پلنگوں اور لحافوں سے کود کود کر گھر کے باہر جس ننگ دھڑنگ پن کے ساتھ محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ الاؤ تاپتی ہوئی اور کانپتی ہوئی ملتی ہے اس پر اگر ذاتی ماں باپ ان کے چانٹے رسید کریں تو محلے کے بزرگ اُلٹا ماں باپ ہی کو بیوقوف بناتے ہیں اور ایسا کوئی قاعدہ نہیں ہے جس کی رو سے جاڑے جاڑے ماں باپ اولاد سے الگ رہیں لہٰذا میں تو یقین کئے ہوئے ہوں کہ سردی نام ہے اصل میں اولاد کی کثرت کا اور بس، اب اگر مذکورہ بالا امور سے سوا کوئی اور صاحب سردی کے مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے تو بڑا کرم ہوگا۔ اور اس وقت ذیل کے نکات کو بھی حل کر دیا جائے تو سردی کا معاملہ علمی حیثیت سے کامل ہو جائے گا۔

۱۔ مثلاً سردی مرد کو زیادہ اور عورت کو کم کیوں محسوس ہوتی ہے؟

۲۔ ثبوت یہ ہے کہ مرد کے پاس سردی سے بچاؤ کے کپڑے زیادہ ہوتے ہیں اور عورتوں کے پاس کم۔

۳۔ مرد سردی کے وقت اگر بغل میں ہاتھ دبا کر باہر نکلے تو بیوقوف مانا

دریا کا منظر!

از جناب محمود اسرائیلی صاحب

آئینہ دوشیزہ قدرت ہے یہ دریا — یا نقرۂ سیّال کا بہتا ہوا خزانہ

تنویر جہاں تاب !! — اک چادرِ سیماب !! — یا پارۂ مہتاب !!

گل ہنستے ہیں بے ساختہ دریا کے کنارے — کس ناز سے کرتے ہیں یہ سمت اشارے

ہنی کو جھکا کر !!! — پتوں کو اُٹھا کر ! — عارض کو دکھا کر !

رومال ہلانے لگیں پانی پہ ہوائیں — اور لینے لگیں چہرۂ دریا کی بلائیں

موجوں سے کھلے لب ! — جنبش میں ہوئیں جب — اور گانے لگیں سب

کچھ ان کی زبانوں پہ ہیں مبہم سے فسانے — داؤد کے دلکش وہ حسن و جمال بخش ترانے !

گانے کوئی جیسے — پیغام کسی کے — اور رومی کی نے سے

زربفت کی پوشاک پہ ہر گل کے یہ ہم — سورج نے بچھایا ہے اپنی کرن پر

کس درجہ چمک سے — ہر پتی دھنک سے — رگ رگ میں جھلک سے

عکس آب میں پھولوں کا ہے اور جھوم رہے ہیں — جھک جھک کے یہ ساحل کے قدم چوم رہے ہیں

دیکھا ہے تو آب ! — اک منظر نایاب — اک گلشن شاداب

پانی میں جو کچھ بوٹے کرشمے کانپ رہے ہیں — وہ سینۂ دریا کا عمق ناپ رہے ہیں

وہ جوش ہے وہ شادابی — گرداب ہیں رقصاں — قدرت کے مناظر ہیں سکوں بخش و طرب خیز

مرغاب ہے حیراں — پاس فزا و الم انگیز — تو صورت مدہوش !

نظارہ جہاں — وہ شہر سے روپوش !

وقت ہیں خاموش !

جاسکتا ہے یا نہیں ؟

۴۔ سردی کے زمانے میں جتنے زیادہ کپڑے پہنو اُتنی ہی دیر تک سردی کیوں محسوس ہوتی ہے ؟

۵۔ شدید سردی کے سفر میں چلتی ریل میں ٹکٹ کلکٹر ٹکٹ دیکھنا چاہے اور ٹکٹ مسافر کے بستر کے سب سے نیچے والے حصے میں دبا ہوا ہو تو اس وقت ٹکٹ دکھایا جائے یا انکار کر دیا جائے ؟

۶۔ جو موذن صبح کی نماز عین برفباری میں بھی دیں ان کو جن سمجھ سکتے ہیں یا نہیں ؟

۷۔ جو لوگ سردی کے موسم میں طلوع آفتاب سے قبل دریا، ندی، تالاب، اور کنوئیں پر نہاتے پائے جائیں اُن کو انسان کے عوض جنگی ٹینک کہہ سکتے ہیں یا نہیں ؟

۸۔ سردی میں صبح کے وقت بعض لوگوں کی ناک سے سفید شوربہ بہتا ہوا اگر نظر آجائے تو ان کو یہ اطلاع دی جاسکتی ہے یا نہیں کہ جناب کی ناک پرنالہ بن چکی ہے۔

۹۔ سردی کے شباب میں صبح کی اذان سے قبل جو مرد اپنی سوتی ہوئی بیویوں کو اُٹھا کر چائے تیار کراتے ہیں ان شوہروں پر مہر کی رقم میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

۱۰۔ جو فیشن زدہ عورتیں شدید پالے میں بھی ہلکی ہلکی ساڑیوں میں گیارہ بجے شب تک سینما کے تماشہ میں بیٹھی رہیں ان سے ٹکٹ کے چہار گونہ دام لئے جاسکتے ہیں یا نہیں ؟

۱۱۔ جو مرغی والے محض جاڑوں میں انڈے کی قیمت بڑھا دیتے ہیں عاقبت میں ان کی بخشش کی امید کی جائے یا نہیں ؟

شہرِ دِلّی کے دریُوزہ گر فقیر

خاص برائے سالنامہ "مشہور"
(غیر مطبوعہ)

(حضرت حکیم خواجہ سیّد ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی مرحوم)

دورِ آخر کے اُن مشاہیر ادب کی فہرست میں جنہوں نے زبانِ اُردو کی خدمت گذاری میں حصہ لیا ہے حضرت خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی مرحوم کا اسم گرامی نمایاں نظر آتا ہے۔ مرحوم کی طرزِ نگارش نہایت سادہ اور عام فہم ہوتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملے گویا عطر زندگی ہوتے تھے۔ دِلّی کی شُستہ اور پاکیزہ زبان کے ساتھ جب خیالات بھی اچھوتے اور پاکیزہ ہوں تو سبحان اللہ اس نثر یا نظم کی تعریف نہیں کیجا سکتی۔ چنانچہ حضرت فراق مرحوم کا یہ غیر مطبوعہ مضمون ان ہی اوصاف سے متصف ہے۔ ہم محترمہ شجاع صاحبہ بنت فراق مرحوم کے بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے تکلیف فرما کر قارئین "مشہور" کو ایک پاکیزہ نثر سے روشناس کرایا۔ ایڈیٹر

(⁂)

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

دنیا میں ایک مثل "ہتھیلی پر سرسوں جمانے" کی چلی آتی تھی مگر مسلمانوں نے اسے سچ کر دکھایا۔ ایک صدی کے اندر سارے جہان میں اسلام پھیلا دیا۔ اسلامی سلطنتیں قائم کر دیں۔ اسلامی آئین و قوانین جاری کر دئے، شرعی اور دینی مدرسے کھولدئے ایک عالم کو اپنا کر لیا۔ ہزاروں لاکھوں غیر قوم اور غیر مذہب والے بڑے چاؤ کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور اس مقدس خدائی ارشاد کی تصدیق ہوگئی يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا اس ترقی کا راز صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنے اصولِ مذہب کے سخت پابند تھے ان کا تمدن، ان کی معاشرت اور اُن کے سارے کام قرآن اور حدیث کے موافق ہوا کرتے تھے اور لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ان کا عقیدہ تھا۔ اور فی زمانہ مُسلمان جو نکھتروں ڈوب گئے اور بداقبالی اور ذلت ان سے قول ہار گئے اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن اور حدیث کو فراموش کر دیا اور اب ان کی بھلائی بُرائی ان کے ہُنر، عیب اور اُن کے ثواب عذاب ہو گئے ہیں۔

نفقہ، صدقہ، زکوٰۃ اور خیرات کا تذکرہ اول تو قرآن پاک میں جا بجا کیا گیا۔ ماں، باپ۔ اقربا، یتیم، مسکین، فقیر، مسافر، عامل، مؤلفۃ القلوب، قرضدار، تاوان بھرنے والے اور قیدی وغیرہ وغیرہ کے نام لیکر اُن کے حق بتائے گئے پھر احادیث میں ان کی تشریح کی گئی، پھر حضرات فقہا نے ان مصارف کو مُوشگافی کے ساتھ ارقام فرمایا

پھر جناب صوفیا نے سلوک کی کتابوں میں یہ مسائل لکھدئیے تاکہ مُسلمان اپنی گاڑھی کمائی کو سوچ سمجھکر صرف کریں اور اپنے حاجتمند اور مستحق بھائیوں کو فائدہ پہنچائیں۔ مگر افسوس ہے اہلِ اسلام نے اس موقعہ پر بڑی بے پروائی سے کام لیا اور خیرات و زکوٰۃ کو بے قاعدہ اور بے محل دے دیکر قوم کا ستیاناس کر دیا اور اس ناموزوں نیکی نے قوم کے حق میں وہ کام کیا جو ہیرے کی کنی انسان کے دل اور جگر کے ساتھ اور تیز خنجر گلے کے ساتھ کرتا ہے۔ صدقہ و خیرات کے جو لوگ اہل اور مستحق تھے وہ بھوکے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور سسک سسک کر مر گئے اور موٹے تازے لفنگے فقیری کی آڑ میں مُفت کی رقمیں مار مار کر دولتمند بن گئے۔

میں کسی اور مُلک یا شہر کا نام نہیں لیتا۔ صرف دِلّی کی نسبت اپنا تجربہ ظاہر کرتا ہوں کہ اس کی بے قاعدہ خیرات نے یہاں کے مسلمانوں کو برباد کر دیا۔ بھیک کا چلتا نسخہ دیکھ کر ہٹے کٹّے جوان، بوڑھے، عورت، مرد، شریف، رذیل گداگری کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور حرام کے نُقمے کھا کھا کر ایسے مدھوڑ (نکمّے) اور سُست ہو گئے کہ پکی پکائی بھی پھوڑنی ان کو دشوار ہو گئی۔ دِلّی میں کچھ دن پہلے ایک باسلیقہ ماما روپیہ مہینہ اور کھانے پر ہنسی خوشی ملجایا کرتی تھی جو صبح شام کھانا پکاتی بازار سے سودا سلف لاتی تھی، گھر میں جھاڑو بہارو دیتی تھی، سلفچی اوگالدان مانجھتی تھی اور ماما کے برتن نہ ڈالتی تھی۔ اور اب یہ حال ہے کہ ماما گھس لگانے کو نہیں ملتی۔ چار روپیہ مہینہ اور دونوں وقت کھانا دیا جاتا ہے اور ماما کے نخرے ٹھکانے نہیں۔ تنک کر کہتی ہیں "ایسی کیا پڑی ہے جو مہینہ بھر اپنا خون پانی ایک کریں چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آجائے

جب کہیں چادر دپٹیاں دیکھنے میں آئیں۔ خدا جامع مسجد کی سیڑھیاں سلامت رکھے جن پر بیٹھ کر ہم دھیلی پاؤلی روز کما لیتے ہیں"

ایک بڑی بی بیس برس سے صبح ہی ہمارے محلہ میں تشریف لاتی ہیں۔ بڑی ساری تھیلی ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے ہر گھر سے ایک ایک چٹکی آٹا لیتی ہیں اور تھیلی میں ڈالتی جاتی ہیں۔ نو دس بجے تک پانچ سیر آٹا اکٹھا کر لیتی ہیں اور بازار جا کر بیچ ڈالتی ہیں اور جو کوئی انجان ان کو ٹوکتا ہے کہ اکیلے دم کے کارن روز سیروں آٹا جمع کرتی ہو ایسی بھی کیا طمع۔ تو کہتی ہیں "بیٹا! میں کھیر تل میں مسجد بنوا رہی ہوں۔ بھیک کا سارا پیسہ اس میں لگا دیتی ہوں" الغرض دلّی کے بالیاقت بھیک منگے بھیک مانگتے ہیں اور وہ وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ امانت لکھنوی اور نظیر اکبر آبادی کی رُوح قبر میں تڑپ جاتی ہے۔ آموں کا موسم ہوگا تو فقیر صاحب فرمائینگے " بابا ایک سخی نے سرولی کے آم کھلوائے اب تو ہمیں دو آنہ کا دودھ پلوا دے" برسات میں جب ملیریا بخار شہر میں پھیل جائیگا تو برقعہ پوش بڑی بی فرمائینگی " اس بندی کو دس دس دن سے بخار آتا ہے۔ منضج کے لئے تو اللہ کے ایک پیارے نے اٹھنی دیدی تھی مگر کھچڑی کا بندوبست نہیں ہوا اسلئے جلاب میں دیر ہوئی چلی جاتی ہے آپ مدد کریں تو میں تندرست ہو جاؤں اور آپ کی جان و مال کو دُعا دوں"

جمعرات تو گویا اس گروہ کی عید ہے، صبح ہوتے ہی ان کے جھتر کے جھتر اور لشکر کے لشکر دروازوں پر آموجود ہوتے ہیں۔ کوئی مسجد کے لئے بدھنیاں کوئی چٹائی، کوئی مٹکا، کوئی چراغ کے لئے تیل، کوئی سقاوہ کے لئے ایندھن مانگتا ہے۔ بعض فقیر ایسے ہیں کہ وہ مہینہ کی صرف پہلی کو آتے ہیں اور پیسہ پیسہ وصول کر کے دس بیس روپیہ ایک دن میں فراہم کر کے اپنے گھر جا بیٹھتے ہیں۔ بعض فقیر آدھی رات کو محض اس غرض سے آکر سوال کرتے ہیں کہ لوگ ان کو سچا حاجتمند جانیں اور جو کچھ بن پڑے وہ دیدیں۔ بعض فقیر صبح کی نماز سے پہلے آکر صدا کہتے ہیں۔ بعض فقیر سواری کے ساتھ دوڑتے ہیں اور اسقدر مشاق ہو جاتے ہیں کہ چار پانچ فرلانگ بگی کے ساتھ بھاگے چلے جاتے ہیں دینے کی جی میں نہیں ہوتی مگر اسے ہانپتا کانپتا دیکھ کر خوفِ خدا آجاتا ہے اور دینا پڑتا ہے۔ بعض گدا سارنگی لیکر آتے ہیں اور گا بجا کر نقد و جنس لے جاتے ہیں۔

دلّی کے گداگر فرقوں میں سے ایک قوم کا نام خُمرہ ہے۔ خمروں کا بڑا جتھا ہے شہر سے باہر صدر، تیلی واڑہ، سبزی منڈی اور پُرانی عیدگاہ میں آبادی کے کنارو پر رہتے ہیں۔ انھوں نے دریوزہ گری کے لئے دلّی کو متعدد ڈویژن اور علاقے بنا کر آپس میں بانٹ لیا ہے۔ اپنے اپنے علاقے اور ڈویژن کے سوا دوسرے خمرہ کی سرحد میں کوئی خمرہ یا خمری جا کر بھیک نہیں مانگ سکتی ہے۔ جب بیٹی کا بیاہ ہوتا ہے تو خوشحال خمرہ اپنے علاقوں میں سے ایک علاقہ اپنی بیٹی کے جہیز میں دیتا ہے۔ خُمریاں روزانہ بھیک مانگنے کے علاوہ محرم کے عشرہ میں چار چار پانچ پانچ اکٹھی ہو کر شہر میں آتی ہیں اور نوحہ اور مرثیہ پڑھ پڑھ کر بہت کچھ لے جاتی ہیں۔ عُرسوں اور میلوں میں پرا باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور جو آدمی پیدل یا سوار اچھا لباس پہنے ہوئے گذرتا ہے اسکے ساتھ دُور تک دُعائیں دیتی چلی جاتی ہیں اور ایک پُر تاثیر لہجہ میں اسکی تعریف کرتی ہیں۔ سُننے والا ان کی اس زمزمہ سنجی سے آخر پسیج جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ جیب میں سے نکالکر ان کو دے جاتا ہے۔ دریوزہ گری کے سوائے یہ قوم نواڑ بُنتی ہے۔ ڈگڈگیاں اور جھنجھنے بناتی ہے اور ٹُڑی بیچتی ہے یہ قوم کبوتر بھی پالتی ہے جو قد آدم گہرے کھتوں میں رہتے ہیں علی الصباح یہ کبوتر کھولدئے جاتے ہیں۔ اور یہ فقیر منش کبوتر اناج کی منڈی اور دوکانوں کے قریب جا کر جو اور گیہوں کے گرے پڑے دانوں سے اپنا پیٹ بھر کر گھر آتے ہیں اور بچوں کو بھرانے کے لئے کھتوں میں اُتر جاتے ہیں۔ مگر بے رحم خمرہ ایک ایک کبوتر کو پکڑ کر قے کرواتا ہے اور اسکے پوٹے میں سے ایک ایک دانہ اُگلوا لیتا ہے اور کبوتر کو اُڑا دیتا ہے۔ کبوتر پھر دانہ کھاکر آتے ہیں اور یہ پھر اُن کے پیٹ میں سے نکال لیتا ہے اور اسی طرح دس دس بیس بیس پھیروں میں چار پانچ سیر اناج گھر بیٹھے خمرہ کما لیتا ہے۔ شام کو جو کبوتر دانہ کھا کر آتے ہیں تو پھر ان کو نہیں چھیڑا جاتا۔ تاکہ وہ کھا پی کر چاق رہیں اور کل کی کمائی میں دیر نہ ہو۔

یہاں میں نے دلّی کے مسلمان دریوزہ گروں کے صرف چند اصول گدائی بیان کئے ہیں۔ ورنہ ماشاءاللہ یہاں بھیک مانگنے کے ڈھنگ نِت نئے نکلتے ہیں اور اس بھیک نے دلّی کے بڑے بڑے اونچے گھرانوں کو نیچا دکھا رکھا ہے۔ ہزاروں مسلمان شریف اور شریف زادے دستکاری اور پیشہ وری چھوڑ چھوڑ کر گداگری کرتے ہیں اور ان کی ہمّت سلب ہوگئی ہے جبکہ اپنی جھولی میں پراٹھے روغنی روٹی، چپاتی، نان پاؤ اور بسکٹ دیکھتے ہیں تو انکی باچھیں کھل جاتی ہیں اور خوش ہو کر یہ شعر گنگناتے ہیں ؎

شرابِ ناب ہے، ہر رنگ کی اپنے پیالے میں ٭ وہ طرہ کونسا گل میں ہے کیا ہی شاخ لالے میں ہے

کاش حضرات اہل سخا خیرات دیتے وقت شرعی قاعدہ کیساتھ اہل نااہل اور مستحق غیر مستحق دیکھ لیا کریں تو قوم برباد نہ ہو۔ اجر بھی خاطر خواہ ملے۔ انگریزوں کو دیکھئے کہ رہیں امریکہ میں اور مشن کے لئے روپیہ ہندوستان بھیجیں۔ رہیں ہندوستان میں اور مشن کیلئے روپیہ بھیجیں لندن خدا مجھے اور میری قوم کو تدبّر نصیب کرے"

فراق دہلوی (مرحوم)



شالیمار پکچرز کی فلم "ایک رات
پرتھوی راج



ایشیاٹک پکچرز کی فلم یاد میں ستیش اور وینا



ایشیاٹک پکچرز کی فلم "یاد" میں ستیش اور وینا



شالیمار پکچرز کی فلم ایک رات میں نینا



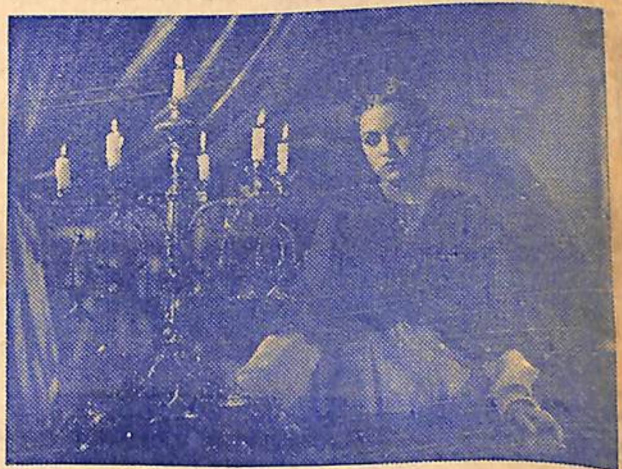
آشوک کمار فلم نجمہ میں



مسٹر گنجال ڈائرکٹر برات



مسٹر ایم اے مغنی
جو بطور پروڈیوسر وینس پکچرز میں



فلم نجمہ کا ایک سین

جاوا کے مگرمچھ کے عامل!

(از جناب سید کاظم میرزا صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل، دہلی)

(※)

جزیرہ "جاوا" یوں بھی جاپانی اقتدار میں چلے جانے سے مرکز نگاہ بنا ہوا تھا لیکن اب سید صاحب کے اس دلچسپ اور معلوماتی مضمون سے اسمیں ایک نئی کشش اور جاذبیت پیدا ہو جائے گی۔ اُمید کہ قارئین دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائینگے۔ ایڈیٹر

دُنیا عجائبات کا ایک بے پایاں سمندر ہے۔ جس کے مختلف حصوں میں عجیب وغریب باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن سے دوسرے ممالک والے ابتک ناآشنا ہیں اور جب یہ باتیں ان کے علم میں آتی ہیں تو ان کو سخت تعجب ہوتا ہے۔ اور موجودہ علم وسائنس کے زمانہ میں لوگوں کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ باوجود علم وسائنس کی موجودہ انتہائی ترقی کے باوجود یورپ اور امریکہ کے متمدن افراد بہت سے وہ علم اور عمل نہیں جانتے، جو افریقہ اور دیگر ممالک کے وہ افراد جن کو گوری اقوام اپنے علم وسائنس کے واحد ٹھیکہ داری کے زعم میں جاہل۔ بے علم اور کندہ ناتراش سمجھتی ہیں، جانتے ہیں۔

اس سلسلہ میں، میں جزیرۂ "جاوا" کے جو کہ بحر الکاہل میں واقع ہے ان عجیب وغریب عاملوں کے حالات پیش کرتا ہوں جو اپنے عمل کے ذریعہ اُن آدم خور مگرمچھوں کو جو "جاوا" کے دریاؤں اور جھیلوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور جو آئے دن وہاں آدمیوں کو مارتے رہتے ہیں۔ دریاؤں سے برآمد کرتے ہیں۔ اور جو اُن کے پیچھے پیچھے ایک پالتو جانور کی طرح چلے آتے ہیں اور جن کو آخرکار لوگ انتقام لینے کے لئے مار دیتے ہیں۔

یہ حالات ایک یوروپین افسر نے جس نے یہ عمل خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا "وائیڈ ورلڈ میگزین" کی ماہ نومبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں چھپوائے تھے۔ ناظرین کی واقفیت کے لئے ماخوذ کر کے پیش کرتا ہوں۔

جاوا میں یہ عامل وہاں کی زبان میں "اورنگ نپتار" یعنی "عقلمند آدمی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ان کے پیچھے مگرمچھ پالتو کُتے کی طرح چلے آتے ہیں، لیکن اگر عمل کے دوران میں عامل کے علاوہ کوئی دوسرا شخص قریب آکر مگرمچھ کو اس حالت میں ہاتھ لگادے تو عمل کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اور مگرمچھ قریب کے آدمیوں کو نقصان پہنچا دیتا ہے۔

افسر مذکور بیان کرتا ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک بڑے ڈھول کے ذریعہ چند گاؤں کے ایک مکھیا یعنی نمبردار نے گاؤں کے آدمیوں کو یہ اطلاع پہنچائی کہ اس روز دوپہر کے وقت دریا میں نہاتے ہوئے ایک آدمی کو ایک مگرمچھ پکڑ کر لے گیا۔ چنانچہ سب نے ملکر دریا کے مختلف حصوں میں اس آدمی کی لاش کی تلاش کی، اور آخر وہ ایک جگہ دلدل میں پھنسی ہوئی مل گئی۔ لیکن اس کا ایک ہاتھ غائب تھا، وہاں کے لوگ جانتے ہیں کہ مگرمچھ کی عادت ہے کہ جب وہ کسی آدمی یا جانور کو پکڑ کر لیجاتا ہے تو وہ اسے فوراً ہی نہیں کھاتا، بلکہ وہ اسے اسوقت کھاتا ہے جبکہ اس میں گلاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس علم کی وجہ سے وہاں عام طور پر مگرمچھ کے مارے ہوئے افراد کی لاشوں کو فوراً تلاش کر کے نکال لیا جاتا ہے۔

جاوا کے اصلی باشندوں کا یقین ہے کہ مرد کو ہمیشہ مادہ مگرمچھ شکار کرتی ہے۔ اور عورت کو نر مگرمچھ پکڑ کر لے جاتا ہے۔ جب کسی آدمی یا عورت کو کوئی مگرمچھ پکڑ کر لے جاتا ہے تو فوراً اس کے رشتہ دار قریب کے کسی عامل یعنی "عقلمند آدمی" کو بُلا کر اس سے مگرمچھ کو پکڑنے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ اس سے متوفی کے خون کا انتقام لیا جاسکے۔ اس مگرمچھ پر اپنے عمل کے ذریعہ اثر ڈالنے کیلئے، عامل متوفی کے مرد یا عورت ہونے کے مطابق لباس پہنتا ہے۔ عورت مَری ہو تو زنانہ لباس اور مرد مرا ہو تو مردانہ لباس پہنتا ہے، اور لباس ہی کے مطابق زبان بھی استعمال کرتا ہے۔ اور اسی طرح اپنے حرکات وسکنات بھی کرتا ہے۔ چنانچہ دَورانِ عمل میں یہاں تک احتیاط کیجاتی ہے کہ اگر وہ زنانہ لباس میں ملبوس ہوتا ہے تو اس کے گرد وپیش صرف عورتیں ہی رہ سکتی ہیں اور مرد دُور رہتے ہیں اور اگر وہ مرد کے لباس میں ہوتا ہے تو عورت کا سایہ بھی قریب نہیں آسکتا، یہاں تک کہ خود اسکی اپنی لڑکی یا بیوی کو بھی قریب آنے کی اجازت نہیں ہوتی اور اسکے خورد ونوش کا

انتظام بھی کلی طور پر مَردوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس دوران میں اسکی ساری توجہ صرف عمل کے ذریعہ مگرمچھ پر اثر ڈالنے کی طرف ہوتی ہے۔

جب عامل کو بُلایا جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس بات کی تلاش کرتا ہے کہ جس مگرمچھ نے متوفی کو مارا ہے وہ دریا، جھیل، یا ندی کے کونسے حصہ میں اپنی جائے اقامت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس وقوعہ میں جس کا اس مضمون میں ذکر ہے پورے دس روز کی جستجو اور دریا میں اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد عامل یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوا کہ مگرمچھ جس نے متوفی کو مارا ہے، اس کی جائے رہائش کہاں ہے۔ جب یہ ضروری چیز طے ہوگئی تو اس عامل نے اس مادہ مگرمچھ پر عمل کا اثر ڈالنے کے لئے اُن جگہوں پر جہاں کہ یہ اُمید کیجاتی تھی کہ مادہ مگرمچھ کی آمد و رفت ہے روزانہ جانا شروع کیا اور اپنے عشق و محبت کی داستان نہایت رنگین الفاظ میں اس غرض سے دہرانا شروع کی تاکہ مادہ مگرمچھ اس سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اسپر پورا پورا اعتماد بھی کرنے لگے اسکے عشق کا افسانہ روزانہ تقریبًا ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا "اے دُنیا کی خوبصورت ترین ہستی جس کے حُسن و جمال کے مقابلہ میں چاند و سورج ماند ہیں۔ اور جس کی نزاکت اور رعنائی کے مقابلہ میں گلاب کا رنگین پھول بھی بے حقیقت نظر آتا ہے۔ تیری مدہ بھری رسیلی اور نشیلی آنکھوں کا یہ سودائی تیری فرقت راتیں گن گن کر صرف اس اُمید پر کروٹیں بدلتے ہوئے کاٹتا ہے کہ کب صبح ہو اور وہ پھر تیرے دروازے پر اس آسرے پر آن بیٹھے کہ شاید وہ تیرے روئے زیبا کی دریا کی لہروں کی آ۔ڑی نقاب میں سے صرف ایک ہی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوجائے۔ اگر تو میری ہوجانے کا وعدہ کرے اور مجھ پر اعتماد کرے تو میں سات سمندروں کے جواہرات اور موتی۔ دُنیا کی بہترین نعمات، و اعلیٰ ترین ملبوسات۔ اور خوش ذائقہ پھل۔ مٹھائیاں اور کھانے اور میوہ جات تیری خدمت میں پیش کردوں گا سورج اور چاند کی روشن کرنیں اور آسمانوں میں جڑے ہوئے چمکتے ستارے بھی تیرے قدموں پر نچھاور کردوں گا۔ اور تیرا ہر روز۔ روزِ عید۔ اور تیری ہر شب۔ شب برات بنادونگا اے ملکۂ حسن و خوبی اب زیادہ عرصہ تک اپنے اس مجبور اور بیتاب عاشق کو اپنی فرقت کی آگ میں نہ جلا۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے تغافل اور بے اعتنائی کی وجہ سے تیرا یہ عاشقِ رنجور تیرے دیدار کی حسرت دل کی دل ہی میں لئے ہوئے اور دم توڑ توڑ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دُنیا سے کوچ کرجائے، اور تو تمام دُنیا میں اس ظلم وستم کی وجہ سے بدنام ہو جائے۔"

ناظرین کو تعجب ہو رہا ہوگا۔ کہ کون ایسا شخص ہوگا جو مگرمچھ جیسے بدصورت اور بد قطع جانور کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی ایسے عشق و محبت کے الفاظ استعمال کرسکتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ "مگرمچھ کے عامل" ایسے ہی تمام الفاظ اپنے عمل کے دوران میں روزانہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

یہ عشق و محبت کی حکایت کا سلسلہ اُنتالیس روز تک روزانہ صبح سے شام تک جاری رہا۔ انتالیسویں دن عامل نے لوگوں کو مطلع کیا کہ کل کے روز متوفی کے چالیسویں کی فاتحہ کا دن ہے اور اس میں سب لوگ جمع ہونگے۔ اسلئے کل وہ اس "مادہ مگرمچھ" کو جس نے متوفی کو مارا تھا اپنے عمل کے زور سے دریا سے باہر نکالے گا۔ یورپین افسر موصوف کا بیان ہے کہ اس کو بھی یہ نظارہ دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ پہلے اس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اس حماقت ... کے مظاہرہ میں حصہ لینا اس کے لئے باعث شرم ہوگا، لیکن پھر کچھ سوچکر اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اس توہّم پرستی کے مظاہرہ کا ضرور مشاہدہ کرے گا تاکہ بعد میں عامل کی ناکامیابی کا مذاق وہاں کے لوگوں کے سامنے اُڑا سکے۔

افسر موصوف کا بیان ہے کہ وقت مقررہ پر وہ دریا کے کنارے پر پہنچ گیا یہ مقام اس جگہ سے جہاں متوفی کو مگرمچھ پکڑ کر لے گیا تھا کافی فاصلہ پر تھا۔ عامل "عقلمند آدمی" جوکہ مادہ مگرمچھ کے عاشقِ صادق کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ وہاں ایک رسّی لئے ہوئے جسکے سرے پر مچھلی پکڑنے کے ایک مضبوط کانٹے میں ایک بطخ پھنسی ہوئی تھی آیا۔ اور جبکہ افسر موصوف اور دیگر تماشائی دور سے کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ عامل نے اپنا عمل شروع کیا۔ وہ دریا کے بالکل کنارہ پر کھڑا ہوا تھا اور اس نے محبت بھرے الفاظ میں اپنے عشق کی داستان شروع کردی۔ اس نے کہنا شروع کیا "اے میری دلنواز محبوبہ آخر میں کب تک تیرے فراق کے رنج والم میں گھلتا رہوں۔ ابتو تو میری آغوش میں آجا۔ کیونکہ اب مجھ میں تیرے فراق کے صدمے اٹھانے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے۔ میں تجھ سے پورے جوش کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ تو مجھ سے شادی کرلے اور میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تیری کوئی ایسی تمنّا نہ ہوگی جسکو میں پورا کرنا اپنا فرض نہ سمجھوں گا۔ تو بھی مجھ سے اسی طرح محبت کر جس طرح میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ بس انتظار کی حد ہو گئی اب تو تو میرے پاس آجا۔"

چنانچہ پورے جذبہ کے ساتھ اسی طرح اپنے عشق و محبت کا اظہار کرتا رہا۔ اور یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ آخرکار افسر موصوف کی طبیعت اکتا گئی اور اس کی نظر دوسری سمت بھٹکنے لگی، دفعۃً لوگوں کے چہروں سے تعجب کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے افسر موصوف کی توجہ پھر پورے انہماک سے عامل کی طرف ہوگئی اور جب اس نے نظر جما کر اس طرف دیکھنا شروع کیا جدھر لوگوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ تو اس نے دیکھا کہ پانی کی لہروں میں سے مگرمچھ سطح پر اُبھر رہا تھا۔ اور اس کا رُخ عامل کی طرف تھا۔

یہ عجیب نظارہ دیکھ کر ہر شخص اس خوف سے دم بخود تھا کہ کہیں ذرا سی آواز یا بے قاعدہ حرکت، عامل یا مگرمچھ کی یکسوئی میں مخل نہ ہو جائے۔ مگرمچھ آہستہ آہستہ پانی کی سطح پر نظر آنے لگا۔ اور وہ اپنی جگہ پر ساکت تھا۔ اور اسکی تھوتھنی اور دُم کا سرا پانی سے باہر صاف نظر آرہا تھا۔ عامل اب بھی اپنے عشق و محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے کانٹے کو جس میں بطخ پھنسی ہوئی تھی، ہاتھ میں ایک خاص انداز سے تولا اور کہنے لگا "تجھے میرے وعدہ پر اعتماد کرنا چاہیئے جسکے ثبوت میں، میں ایک ادنیٰ سا تحفہ تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں جس سے تجھے اندازہ ہو جائیگا کہ جب تو میری ہو جائے گی تو میں تیرے لئے کیا کیا نعمات مہیا کروں گا۔ میری التجا ہے کہ تو میرے اس ناچیز اور حقیر تحفہ کو قبول کر کے مجھے عزت بخشے گی" یہ کہکر اس نے رسی کے ذریعہ اس کانٹے میں پھنسی ہوئی بطخ کو مادہ مگرمچھ کے قریب پھینکدیا اور دوسرا کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ مادہ مگرمچھ نے آگے بڑھکر اُس کانٹے میں پھنسی ہوئی بطخ کو مُنہ میں پکڑ کر نگل لیا۔ اسکے فوراً بعد ہی عامل نے رسی کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔ جس کیوجہ سے کانٹا مضبوطی کے ساتھ اسکے حلق میں پھنس گیا۔ جھٹکا لگنے پر مادہ مگرمچھ نے وہیں پانی میں ڈبکی لگائی۔ لیکن اس نے بھاگنے یا رسی کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اسکے بعد عامل نے پھر اظہارِ عشق شروع کر دیا۔ اور کہنا شروع کیا کہ "اب تجھکو میرے پاس آنے میں کیا حجاب ہے؟" چند منٹ کے بعد وہ پھر کنارے کے پاس پانی کی سطح پر نمودار ہوئی اور اسکے بعد وہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔

دریا کا وہ حصہ جہاں عامل کھڑا ہوا تھا ڈھلوان تھا اور سطح زمین سے تقریباً تیس فٹ نیچے تھا۔ مگر مادہ مگرمچھ عامل کے پیچھے پیچھے اس ڈھلوان راستہ پر چڑھتی ہوئی چلی آئی۔ رسی بالکل ڈھیلی حالت میں تھی۔ اور مادہ مگرمچھ عامل کے پیچھے پیچھے بالکل پالتو کتے کی طرح چلی آرہی تھی اور وہ اس طرح آدھے میل تک چلی آئی۔ اس کی رفتار میں کسی قسم کی رُکاوٹ یا تذبذب نہیں تھا۔ آگے آگے عامل تھا اور اسکے پیچھے مادہ مگرمچھ۔ اور کافی فاصلہ چھوڑ کر ایک ہجم غفیر خاموشی کے ساتھ چلا آرہا تھا اور اس طرح یہ عجیب و غریب جلوس عامل کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ جہاں عامل نے اس رسی کو ایک درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا اور پھر اس رسی کو اسکے تمام جسم پر اور خاص طور پر اس کی تھوتھنی اور دُم پر مضبوطی سے کس کر باندھ دیا کہ وہ بالکل بے بس ہو گئی اور مقابلہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسکے بعد ایک دیسی افسر نے دُور سے اپنا ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اس کی دُم کو چھُو دیا۔ ہاتھ کا لگنا تھا کہ ایسا معلوم ہوا گویا مادہ مگرمچھ ہوش میں آگئی اور اگر وہ اسوقت آزاد ہوتی تو شاید کئی آدمیوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑ جاتے۔ اسکے غصّے اور پیچ و تاب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لیکن رسی کی سخت بندش کی وجہ سے وہ ایک انچ بھی نہیں ہل سکی۔

مادہ مگرمچھ کو باندھنے کے بعد عامل کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اور اب اس کے لئے اس میں کوئی متوجہ کرنے والی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ البتہ اسکے گرد اب متوفی کے رشتہ دار جمع ہو گئے تھے۔ جو اسکو اپنے عزیز کو جان سے مارنے کی بابت بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ متوفی کی بیوہ نے پہلے اس کو کچھ دیر خاموشی کے ساتھ دیکھا اور آگے بڑھکر اپنی زبان میں اس کو خوب بُرا بھلا کہا۔ عام طور پر وہ لوگ مگرمچھ کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ جہاں چند روز میں بھوک اور پیاس کی تکلیف سے خود مر جاتا ہے۔

یہ مادہ مگرمچھ جس کا ذکر کیا گیا ہے تقریباً تیرہ (۱۳) فٹ لمبی تھی اور اس کو ایک ریلوے افسر نے اس کی کھال حاصل کرنے کے لئے خرید لیا تھا اور دوسرے روز اُس نے اس کو گولی سے مار دیا تھا۔

آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ "جاوا" میں مگرمچھوں کی وجہ سے بہت سے انسانوں کی موت واقع ہوتی رہتی ہے لیکن اس سے وہاں کے باشندوں پر کسی قسم کا خوف و ہراس طاری نہیں ہوتا۔ چنانچہ مذکورہ یورپین افسر کا بیان ہے کہ اس نے اسی روز ایک بُڈھے آدمی کو دریا میں ایسی جگہ نہاتے ہوئے دیکھا جہاں سے کچھ دُور پر دو لڑکیاں رنگین لباس میں گہرے پانی میں نہا رہی تھیں جو گویا مگرمچھ کو اگر وہاں کوئی ہو تو اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ لیکن وہاں کے باشندے ذرہ برابر بھی خوف کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اپنی قسمت کے لکھے پر اسقدر شاکر اور عامل کی قوت میں اسقدر اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ خطرہ کی جگہ نہانے سے قطعی خوف نہیں کھاتے۔ چنانچہ یورپین افسر بیان کرتا ہے کہ عمل ختم ہونے کے بعد جب اس نے متوفی کی بیوہ سے کہا کہ تم لوگ خود دریاؤں میں بے احتیاطی سے نہا کر مگرمچھوں کو دعوت دیتے ہو کہ وہ تم کو پکڑ کر لیجائیں تو اُس نے جواب دیا کہ میرے خاوند کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ اس کی موت اِس مگرمچھ کے ہاتھ سے واقع ہو۔ اور ہمارا پکّا اعتقاد ہے کہ تقدیر کا لکھا کبھی مٹ نہیں سکتا اور وہ ضرور ہوگا اسلئے اگر وہ دریا میں نہانے کے لئے نہ بھی جاتا تو مگرمچھ اس کو زمین پر سے پکڑ کر لیجاتا۔ جب کسی انسان کی تقدیر میں اس کی موت کسی دوسرے طریقہ سے واقع ہونی لکھی ہوتی ہے تو اس کو کوئی مگرمچھ چھو تک نہیں، حالانکہ وہ دن رات دریا میں ایسی جگہ ہی کیوں نہ رہے جہاں مگرمچھ کثرت سے موجود رہتے ہوں۔

میاں بیوی کا دلچسپ مکالمہ

جناب اشرف صبوحی دہلوی دُنیائے ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اسلئے یہ فٹ نوٹ بطور تعارف نہیں۔ بلکہ نفس مضمون پر ایک تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پُر لطف بحث میں میاں بیوی نے اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور دلائل و براہین کے ذریعہ اپنے اپنے دعوی کو پُرزور بنایا ہے۔ اب یہ کہ بازی کس نے جیتی ؟ اور میدان کس کے ہاتھ رہا ؟ اسکا فیصلہ ناظرین کا ذوقِ سلیم خود کر سکتا ہے۔ مگر اتنا ہم عرض کئے بغیر نہ رہینگے کہ عورت و مرد کی قوتوں میں اختلافِ عظیم ہے اسلئے مقابلہ تو وہاں کیا جا سکتا ہے جہاں متخاصمین کی قوت یکساں ہو۔ پتھر کی سختی کا مقابلہ پھول کی نرمی سے کیجئے تو لوگ احمق سمجھینگے۔ پس عورتوں میں جو صفات ودیعت کئے گئے ہیں مرد اُن سے محروم ہیں۔ اور جو اوصاف مردوں کو قدرت نے عطا کئے ہیں عورتیں اُن سے یکسر خالی ہیں۔ بایں ہمہ یہ دو مختلف قوتیں ایک دوسرے کی محتاج ہیں اسلئے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ؎ کچھ عشق میں مجنوں ہی سوا ہے نہ ہے فرہاد ؛ لیلی ہی نہ چھوٹی ہے نہ شیریں ہی بڑی ہے ٭ زیر بحث مضمون کی جان اس کی زبان ہے اور وہ اشرف صبوحی صاحب کے گھر کی ایک کنیز ہے۔

ایڈیٹر

(٭)

خیالات کی پاکی و ناپاکی تو اللہ جانے مگر تھے دونوں بڑے باتون۔ جب دیکھو زبانیں لڑ رہی ہیں۔ پڑھے لکھوں کو کون قائل کرے۔ برابر کی چوٹ برابر کے دعوے۔ دونوں بی۔ اے۔ ایک شہر کے رہنے والے۔ ایک اُستاد کے شاگرد۔ ہر وقت چشمک چوٹ رہتی۔ بیوی نے گھر کے دھندوں سے فرصت پائی۔ بن سنور کر بیٹھیں میاں دفتر سے آئے مُنہ ہاتھ دھویا۔ کھانے پینے کا جھگڑا ختم ہوا اور دماغ کی کتابیں کھُلیں۔ بچے جم ہی جم تھے کہ ان سے دل بہلاتے۔ دوسرا کوئی شغل نہ تھا جو وقت گذرتا۔ کالج کی محبت رنگ لائی تھی دونوں کے والدین ناراض۔ ادھر کچھ شکوہ ادھر کچھ گلہ۔ کنبہ رشتہ میں دونوں بدنام۔ اسلئے اکیلے رہتے اور خوش رہتے۔ چہلیں کرتے اور خوب دل کھول کر۔

بیوی۔ (مُسکرا کر) آج میں نے اخبار میں مردوں کی رُسوائیوں سے بھرے ہوئے کئی کالم پڑھے۔

میاں۔ اور میں عورتوں کی بدنامیوں سے بازار کے بازار بھرے ہوئے دیکھتا چلا آتا ہوں۔

بیوی۔ مگر وہ مستورات نہ ہونگی۔

میاں۔ وہ مرد بھی جنٹلمین نہ ہونگے۔

بیوی کیا سوٹ پہننے والے۔ ہیٹ لگانے والے اور جن کے نام کے ساتھ مسٹر لگا ہوا ہو وہ جنٹل مین نہیں کہلاتے ؟

میاں۔ اونچی ایڑی کا جوتا پہننے والی برقعہ پوش، چپل باز، ساڑھی بند جو خواتین اور دیویاں کہلاتی ہیں کیا مستورات نہیں ؟

بیوی۔ میں تو ایسے جنٹل مینوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔

میاں۔ اور میرا بس چلے تو ایسی خاتونوں اور دیویوں کو زندہ دیواروں میں چنوا دوں۔

بیوی۔ یہ بہروپئے مرد معاشرت کے داغ ہیں۔

میاں۔ اور یہ نمائشی مستورات سماج کی زینت ہیں ؟

بیوی۔ بالکل تہذیب کا خول! تعلیم کے خواب کی الٹی تعبیر!!

میاں فیشن کی ہوا میں اُڑتی ہوئی تیتریاں! آزادی کے دیوتاؤں کا پرشاد!!

بیوی۔ دیکھو تم بہت بڑھتے جاتے ہو۔

میاں۔ اور آپ کب پیچھے ہٹ رہی ہیں۔

بیوی لیکن آپ کو عورت پر مُنہ آنے کا حق نہیں۔

میاں۔ اور آپ مرد کی تحقیر کا حق رکھتی ہیں ؟

بیوی جی!

میاں چہ خوش!

بیوی دُنیا میں گناہ کی تخم ریزی کا سبب کون ہے ؟ شیطان یا کوئی اور ؟

میاں اچھا پھر ؟

بیوی — شیطان کو مرد کہو گے یا عورت ؟

میاں — اس سے آپ کا مقصد ؟

بیوی۔ — پہلے یہ بتاؤ کہ تم شیطان کو کس صنف سے سمجھتے ہو ؟

میاں — میں کیا دُنیا جانتی ہے کہ شیطان لعین مرد ہے۔

بیوی — یعنی تمھاری قوم کا ؟

میاں — قوم کیسی ؟ ہم آدم زاد۔ وہ جنّات میں سے۔

بیوی — مگر صنف میں تو عورت نہیں ؟

میاں — بے شک صنفاً مرد ہی ہے۔

بیوی — پھر گناہوں کی ابتدا اسی نے ڈالی یا کسی اور نے۔ امّاں حوا کو بہکانے والا وہی مردود تھا یا کوئی دوسرا ؟

میاں۔ — لاحول ولاقوۃ۔ کہاں دوڑ گئیں۔

بیوی — لاحول مجھے پڑھنی چاہیئے یا آپ کو ؟ شیطان کے زمرے میں آپ ٹھہرتے ہیں یا نہیں ؟

میاں۔ — مانا کہ دادی حوا سے چکنی چپڑی باتیں شیطان نے کیں لیکن باوا آدم کو جنت سے کس نے نکلوایا ؟ اگر وہ بیوی کی باتوں میں نہ آجاتے تو آج ہمیں یہ مصیبتیں کاہے کو جھیلنی پڑتیں۔

بیوی — کیا خوب آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آدم کو گناہ کی ترغیب دینے والی بی حوا تھیں۔ یعنی اوّل ہی سے ہم معصوم عورتیں موردِ الزام ہیں۔

میاں — اور کیا ؟ لہٰذا مرد کو گنہگار بنانے والی عورت ہے۔ وہ شیطان کے بہکائے میں آکر خدا جانے کیا کیا حرکتیں کرنے لگتی ہے۔

بیوی۔ — ہاں ہاں کہو۔ کہتے کہتے کیوں رُک گئے۔ سچ ہے عورتیں ہی غریب موردِ الزام ہیں۔ جہنم انھیں کے لئے بنا ہے۔ شیطان بھی انہی کے پیٹ سے نکلا ہوگا ؟

میاں۔ — (ہنسکر) بات تو جھوٹ نہیں۔ شیطان کو جننے والی عورت ہی ہو سکتی ہے

بیوی۔ — اور شیطان کو عورت کے پیٹ میں ڈالنے والا کون ہوا ؟ عورت اگر مرد کی چاپلوسی کا شکار نہ ہوتی تو کیا شیطان پیدا ہوتا۔ جس طرح شیطان کسی ماں کا بیٹا ہے اسی طرح کوئی اس کا باپ بھی ہونا چاہیئے۔

میاں۔ — اچھا ایک بات بتاؤ۔ بیج کے پھولنے پھلنے میں زمین کے اثرات کو تم مانتی ہو یا نہیں ؟

بیوی — کیا معنی ؟ زمین آم کی گٹھلی سے کیکر کا درخت پیدا کر دیتی ہے ؟ خربوزے کی بیل میں حنظل لگا دیتی ہے ؟

میاں۔ — یہ تو خیر کبھی نہیں ہوا۔ مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ زمین اپنی تاثیر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ بیج کیسا ہی اچھا ہو۔ زمین اچھی نہیں تو پھول پھل اچھ
آتے کبھی دیکھے ہیں ؟ کوئی نہ کوئی عیب ضرور آجائے گا۔

بیوی۔ — زمین کا کیا قصور ؟

میاں۔ — بیج کی خطا ہے ؟

بیوی۔ — بیج کی نہ سہی بیج ڈالنے والے کی سہی۔ زمین شور سنبل بر نیاید۔ جب معلوم ہے کہ شوریلی زمین میں آگ کے درخت ہی اُگا کرتے ہیں تو چنبیلی موتیا کے پھولوں کی آرزو کرنی یعنی چہ ؟

میاں — لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ پھل پھول کے خوشبو، بدبو، خوشرنگ بدرنگ، خوش مزہ، بدمزہ ہونے میں زمین کو بڑا دخل ہے۔

بیوی — اچھا بیج کے ناقص ہونے اور زمین کے غلط انتخاب کی ذمہ داریاں کس پر ہیں۔ ؟

میاں — اینچ پینچ سے کیا فائدہ۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ مرد شیطان ہے اور عورت فرشتہ۔

بیوی — کیا آپ کو اس سے انکار ہے ؟ اماں حوا کہاں سے آئی تھیں ؟

میاں — باوا آدم کی بائیں پسلی سے !

بیوی — ان کا تو پتلا نہیں بنایا گیا تھا ؟

میاں — کیا خبر ہے، انھیں بنا کر آدم کے پہلو میں چھپا دیا ہو۔

بیوی۔ — خبر نہیں تو سمجھ لیجئے کہ حوا حضرت آدم کے معاشرتی پہلو میں فرشتۂ رحمت کی طرح نازل کی گئیں۔

میاں — (ہنس کر) اور اسلئے عورتوں کا وجود خاکی نہیں نوری ہے۔ وہ معصوم ہیں۔ !

بیوی — جناب ! آپ کو اس سے انکار ہے ! !

میاں — توبہ توبہ ! مرد کی کیا مجال کہ عورت کے نوری ہونے سے انکار کرے۔

بیوی — (انگڑائی لیتے ہوئے) نوری ! ایک نوری کیا ؟ عورت کا درجہ کائنات میں بہت بلند ہے۔

میاں — بلند سے بھی بلند۔ مرد کی پھڑکتی ہوئی پسلی ! لیکن . . . . . .

بیوی — لیکن کیا ؟

میاں — کچھ نہیں۔ دنیا کی آبادی عورت ہی ہے۔

بیوی — دُنیا خود عورت ہے۔ عالم رنگ و بو میں جسقدر سرسبزی، شادابی لطافت، رنگینیاں اور دلکشی ہے وہ صرف عورت ہونے کے صدقہ میں ہے۔ آسمان جسے مرد کہتے ہیں دیکھ لو کتنا بے فیض ہے۔ گردش کے سوا اس میں کچھ نہیں۔ جو اس کے پھندے میں پھنسا چکر کھائے بغیر نہ رہا۔

میاں — کیا بات پیدا کی ہے۔

بیوی۔ غلط کہہ رہی ہوں ؟

میاں۔ آپ کبھی غلط کہتی ہیں۔ !

بیوی آپ قدر نہ کریں۔ آپ ہماری مقبولیت نہ مانیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا کا سنگار عورتیں ہیں۔

میاں۔ میں کب نہیں مانتا۔ نہ مانوں تو رہوں کہاں ؟

بیوی۔ جی ہاں ! غیر خدا کی جب پوجا شروع ہوئی تو جذبۂ پرستاری کے پورا کرنے کو دیویاں پیدا کی گئیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ زندگی کی تمنائیں عورت کے سوا پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ قدرت کے سارے کاروبار اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

میاں۔ کیا شک ہے ؟ لیکن آخر اس بدنصیب مرد کا بھی کوئی درجہ ہے ؟

بیوی عورت کے مقابلہ میں ؟

میاں۔ اسوقت تو انھیں دونوں کا مقابلہ ہے۔

بیوی۔ مرد کے نقطۂ نگاہ سے یا عورت کے ؟

میاں۔ کیا دونوں کی نگاہ کے زاویے الگ الگ ہیں ؟

بیوی۔ بالکل ! بلکہ ہر مرد اور ہر عورت اپنی رائے جدا رکھتی ہے۔

میاں اللہ اللہ (مُسکرا کر) اسقدر نیرنگیاں !

بیوی۔ مگر عام نظریہ، یہ ہے کہ عورت کو روح اور مرد کو جسم سمجھنا چاہیئے۔

میاں یعنی عورت نہ ہوتی تو مرد ایک مُردہ جسم تھا۔

بیوی حوّا کے بغیر آدم کی کیا حیثیت تھی ؟ کہنے کو جاندار لیکن درحقیقت بے جان۔ عالم کے تماشہ گاہ میں ہُو تو بول رہے تھے۔ بی حوّا بیگم نے پہلو نشین ہو کر دُنیا کی آبادی کا ڈول ڈالا۔

میاں (ہنس کر) اور جنت سے نکلوا کر دربدر کی ٹھوکریں کھلوائیں۔

بیوی یہ نہیں کہتے کہ اللہ میاں کے تھیٹر کا افتتاح عورت ہی کے اسٹیج پر آنے سے ہوا ہے۔ اکیلے میاں آدم سے نہ جنت کی پوری رونق تھی نہ مقصود الٰہی پورا ہوتا تھا۔

میاں۔ صرف حضرت آدم سے واقعی اتنا بڑا ڈرامہ کس طرح چلتا۔

بیوی حوّا کی پیدائش سے پہلے آدم کیسقدر اُداس تھے۔ ان کی زندگی کوئی کروٹ نہیں بدل سکتی تھی۔ بے تاروں کا رباب تھا۔

میاں عورت جادوگر تو ضرور ہے اسی کی کرشمہ سازیوں نے دنیا کا طلسم بنایا۔

بیوی توہین کرتے ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ عورت سراپا شعریت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو مَردوں میں شور شش کے سوا کیا رکھا تھا۔ اس کی تمام غوغا پسند ادائیں مترنم راگ میں بدل گئیں۔

میاں عورت کی بدولت ؟

بیوی۔ اور کس کی ؟

میاں۔ میں تو جانتا ہوں مَردوں کو اس نے تلخ نوائیاں سکھائیں۔ نغموں کو نالے بنا دیا۔ تم کو حق ہے اپنی صنف کی طرف سے جیسی چاہے وکالت کرو۔ لیکن کیا مرد میں اپنی کوئی شان نہ تھی ؟

بیوی ہو گی کہیں ڈھکی چھپی۔ بظاہر تو اس نے کُشت، زانی اور کشت و خون ہی کیا۔ امن و راحت کے معاملہ میں صفر ہی رہا۔

میاں۔ کِشت رانی تو کس کا کھیت لہلہانے کے لئے۔ کشت و خون کئے تو کس کی خاطر ؟

بیوی۔ عورت کی خاطر ؟ عورتوں نے کہا تھا کہ بھائی کو بھائی مار ڈالے۔ قبیلے کے قبیلے آپس میں کٹ مریں۔ انسانی خون کی ندیاں بہ جائیں ؟ یہ مَردوں کی اپنی حماقتیں تھیں۔ ان کا اپنا جذبۂ نفس پرستی تھا۔ باغوں میں پھول کھلتے ہیں اسلئے کہ سب ان کی بہار سے متمتع ہوں۔ کسی ایک کو کیا حق ہے کہ ان پر مالکانہ حق رکھے۔ یہی دعوی باطل اور مَردوں کی بیجا ہما ہمی فسادات کا باعث ہوئے۔

میاں لاحول ولا قوۃ ! تو آپکے خیال میں مرد احمق ٹھیرے انھوں نے جانیں بھی دیں رائیگاں۔ عورت پر کوئی احسان نہیں ؟

بیوی۔ احسان کیا ؟

میاں۔ عورت مرد کے جذبات کا مرکز تھی۔ اس کی حفاظت مرد نے اپنا فرض سمجھا۔

بیوی۔ فرض تھا تو احسان کیسا ؟

میاں عورت کو تو احسان ماننا چاہیئے۔

بیوی۔ تو کیا عورت نے قربانیاں نہیں چڑھائیں ؟ اس کے کارنامے بھی آپنے سُنے ہیں ؟ مرد اگر اپنی جان کو جان نہ سمجھے تو عورتوں نے اپنا سُہاگ اُجاڑنے میں کونسی کسر کی۔ لڑائیوں میں لڑنے والے کون تھے ؟ انہی عورتوں کے لخت جگر یا اور کوئی۔ ماؤں نے کس طرح۔

میاں۔ بیچ ہے مَردوں کو اولاد سے کیا واسطہ ؟ باپ بیچارہ کس کھیت کی مولی

بیوی۔ (قہقہہ لگا کر) اور کیا ؟

میاں۔ عورتوں کی اسی خود فریبی نے دُنیا کو تباہ کیا ہے۔

بیوی عورتوں کی خود فریبی یا مَردوں کے غلط تفاخر اور اظہار تفوق نے ؟

میاں۔ مُرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزہ نہ آیا۔ بھُس میں چنگی ڈال جمالو دُور کھڑیں۔ عورتوں نے دُنیا میں آگ لگائی۔ مرد ہمیشہ اپنے خون سے بُجھاتے رہے پھر وہ بیگناہ اور یہ گنہگار۔ اسکے سوا کیا کہوں کہ ' جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا '

بیوی۔ اب لگے اپنا پُرانا ہتھیار استعمال کرنے۔ اس میں بھی ہار جاؤ گے!

میاں۔ ایک میں کیا ہاروں گا۔ عورتوں سے آجتک کونسا مرد جیتا ہے؟

بیوی نیت کے پھل ہیں، عورتوں کے ساتھ جوا کھیلو گے تو یہی ہوگا۔

میاں۔ یعنی عورت کو وقف کی جائداد سمجھ لیا جائے۔ اس کی حفاظت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

بیوی۔ مردوں نے عورت کے لئے عورت کی حفاظت کس دن کی؟

میاں۔ مغرب مشرق شمال جنوب میں تاریخ کے صفحات پر سینکڑوں خونریز جنگیں ہوئی ہیں جن کا سبب محض عورت کی حفاظت تھی۔

بیوی۔ یہ صرف مردوں کا فریب ہے۔ عورت کے حسن، عورت کی جوانی کو لوٹنے کے لئے لڑے۔ اور عیش پرستی کا نام غیرت رکھدیا۔ مردوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر خودکشیاں تو سنی ہونگی لیکن کبھی یہ بھی سُنا ہے کہ کسی عورت نے مرد کو قتل کردیا۔ برخلاف اسکے آپ جیسے بہادر مردوں نے خدا معلوم کتنی بیچاری عورتیں موت کے گھاٹ اُتار دی ہیں۔

میاں خوامخواہ عورت کا کوئی قصور نہیں؟ مردوں کو عورتوں سے دشمنی ہوگی یا ان کے دماغ خراب ہونگے۔

بیوی آپ ہی غور کریجئے۔ میں آپ ہی سے پوچھتی ہوں، آخر مرد کو عورت کی توہین کا کیا حق حاصل ہے۔؟

میاں۔ مرد عورت کے محافظ ہیں۔ ایک محافظ کو حق ہے کہ وہ جنس محفوظ کی نگرانی رکھے۔ اسے چوروں اُچکوں سے بچائے۔

بیوی۔ اور اگر وہ جنس آزاد ہو۔ خود مختار ہو اور اس کے محافظوں کا دعویٰ غلط ٹھیرے؟ بندہ نواز! عورت آپ کو یہ حق نہیں دیتی کہ آپ اس کے مالکانہ قابض رہیں۔ اسکے جذبات کے ساتھ اپنے من مانے کھیل کھیلیں اور جب آپ کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کرے تو اسکے گلے پر چھُری پھیر دیں۔

میاں۔ لیکن عورت کو اسقدر آزادی کس خدا نے دی ہے کہ وہ اپنے ساتھ مردوں کو بھی ذلیل کرے۔ اور مردوں کے حقوق پامال کرتی رہے۔ ایک کی امانت دوسرے کو دے۔

بیوی۔ کیسے حقوق اور کیسی امانت؟ یہ سب قانون معاشرت کی فضولیات ہیں۔ زبردستی کی باتیں۔ خودغرضی کے ڈھونگ۔ مرد عورت کی نزاکت کو برابر ٹھیس لگائیں اور جب وہ جھرجھری لے تو اس کا رونا روئیں۔ عورت مردوں کو کیا ذلیل کرتی ہے؟ سُبحان اللہ۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ جس دن عورت نے خدانخواستہ مردوں کے مقابلہ میں کمر باندھ لی۔ میں اور کیا کہوں، بس یہ سمجھ لو کہ بہت بُرا ہوگا ہزاروں چونے کے گھر مٹی ہو جائینگے۔

میاں۔ خدا کی پناہ!

بیوی۔ خدا سے پناہ کیوں مانگتے ہو۔ اپنے کرتوت نہیں دیکھتے۔

میاں۔ آخر ہم نے عورتوں کا بگاڑا کیا ہے؟

بیوی۔ اور ہم پر جبر کرو۔ ہماری خواہشات کو دباؤ۔

میاں۔ نیکی برباد گناہ لازم۔ غلط راہوں سے بچانے اور غلط کاریوں سے روکنے کا نام جبر ہے تو واقعی مرد بُرا اور بہت بُرا۔

بیوی۔ کیا مرد غلط کار اور گمراہ نہیں؟

میاں۔ ہیں! لیکن ان کی بات اور ہے۔

بیوی۔ کیا فرمایا؟ مرد کی خطائیں خطائیں نہیں۔؟

میاں۔ خطا بہرحال خطا ہے۔ البتہ......

بیوی۔ البتہ کیا؟

میاں۔ عورت کی زندگی جن نزاکتوں کا مجموعہ ہے اسپر آپنے خیال نہیں کیا

بیوی۔ یعنی جو چیز عورت کے حق میں زہر ہے مرد اسے شہد کی طرح نوش فرمایا کرے۔

میاں۔ مرد عورت کی نسبت زیادہ قوی ہے اسلئے وہ اتنی جلدی اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہو سکتا جتنا عورتیں۔

بیوی عورت کو متاثر کرنے والے جذبات کا مرکز ان کا اپنا ماحول ہے یا مردوں کا؟

میاں لیکن مردوں میں عورتیں اپنی رعنائیوں کا مظاہرہ کیوں کریں۔

بیوی۔ دیکھئے پھر آپنے بغلیں جھانکنی شروع کیں۔

میاں۔ اچھا بابا، میں ہارا تم جیتیں۔ حکم ہو تو اعلان کردوں کہ ہر مرد آج سے عورتوں کو آزاد کردے۔ انھیں بغل کی جگہ سر پر بٹھائے اور ان کے سامنے مُنہ سے بھاپ نہ نکالے۔ ان نازک اندا موں کو مرد سمجھ لے اور آپ عورت بن جائے۔

بیوی۔ نہ بنیں گے تو بننا پڑے گا۔ کیونکہ عورتیں کافی سے زیادہ مردوں کے ہاتھوں تنگ آچکی ہیں۔

میاں۔ مگر یاد رکھو عورتوں کے لئے مردوں کی ریس اچھی نہیں۔

بیوی۔ عورتیں کس بات میں نہیں ہیں؟

میاں۔ آزادروی کے علاوہ ایک عورت مردوں کی کیا برابری کرسکتی ہے۔

بیوی۔ اپنے مُنہ سے میاں مٹھو بنتے رہو۔ ورنہ عورت اب پُرانی عورت نہیں رہی۔ وہ ہر میدان میں مردوں کے ساتھ شانے سے شانہ بھڑا کر چلنے کو تیار ہے۔

میاں۔ اس صورت میں عورت کی عصمت اور نزاکت کا سوال تو جاتا ہی رہیگا۔

بیوی۔ کیوں؟

میاں اور دُنیا کی آبادی بھی کم ہونی شروع ہو جائیگی۔

بیوی۔ آخر وجہ؟

میاں ایک کام کرلیں۔ مَردوں کا یا عورتوں کا۔

بیوی۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ مرد عورت انسان ہونے کے لحاظ سے یکساں نہیں یا اللہ میاں نے ان دونوں کو آپس میں غلام اور آقا پیدا کیا ہے؟

میاں۔ غلام اور آقا ہونے کا سوال نہیں۔ دنیوی عظمت و رفعت کی تعمیر میں دونوں بلاشبہ برابر کے شریک ہیں۔ لیکن دونوں کے فرائض میں بڑا فرق ہے۔

بیوی۔ مثلاً؟

میاں۔ مثلاً بعض عوارض عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ زندگی کی بہت سی ڈیوٹیاں عورت ہی ادا کرسکتی ہے۔ بچے جننا مرد کا کام نہیں۔ خانہ داری اگر مرد کے متعلق کردی جائے تو چراغ میں تیل اور کھانے کو اناج کہاں سے آئے۔؟

بیوی بس! عورتوں کو آپنے سمجھا کیا ہے؟

میاں عورت! گھر میں بیٹھ کر مَردوں کی راحت کا سامان کرنیوالی!!

بیوی۔ خواہ مرد انہیں کچلتے جائیں۔ ان کے حقوق غصب کرکے مونچھوں پر تاؤ دیتے رہیں۔ جناب! ان ظالم مَردوں نے غریب بے زبان عورتوں پر آج تک جیسے جیسے ظلم کئے ہیں تاریخ ان کی شاہد ہے۔ مرد آخر اکڑتے کس بات پر ہیں۔ عورتوں نے کیا کام نہیں کئے اور کون سا کام نہیں کرسکتیں۔

میاں لیکن یہ تو ماننا پڑے گا کہ اکثر اس کی کمزوریاں خلقی ہیں۔

بیوی مردوں کی حماقتوں۔ ان کے گناہوں کا بوجھ اُٹھانا اور آئندہ نسلوں کی ذمہ داری لینے کے بعد بھی اگر عورت کمزور ٹھیرائی جاتی ہے تو میں نہیں جانتی کہ طاقت کے کیا معنے لئے گئے ہیں؟

میاں۔ (گھڑی دیکھ کر) نو بج چکے ہیں۔ نماز پڑھنی ہے اور پھر سونا۔ اب یہ بحث ختم بھی ہوگی۔

بیوی۔ نماز تو مجھے بھی پڑھنی ہے۔ مگر مَردوں کی شیخی خوب کرکری ہوئی۔ مرد آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟

میاں (مسکرا کر) عورتوں کے والی۔ محافظ۔ خداوند مجازی۔ انکی جذباتی کمزوریوں پر حاکم۔

بیوی۔ اے کیوں نہیں۔ مرد ایسے ہی ہیں۔ واللہ میں تو ان مَردوں کی بہادری کو مانتی ہوں جو عورتوں سے طاقت آزمائی کرتے ہیں۔

میاں۔ تمہاری مرضی ہے کہ عورتوں کو بے مہار اونٹنیوں کی طرح چھوڑ دیا جائے۔

بیوی۔ (ہنستے ہوئے کھڑی ہو کر) صبر کرو۔ عورتیں کوشش کررہی ہیں کہ بچے بھی مرد جننے لگیں۔

(اشرف صبوحی دہلوی)

(بقیہ عید شباب) صٓ ۱۵۷

نغموں کے لئے بیتاب نظر آتے تھے۔ اور منتظر تھے۔ کہ ناگہاں مجمع میں ایک اضطراری کیفیت نمودار ہوئی۔ حسین منزوا ــــ پردائے لالہ رنگ سنبھالتی چلی آرہی تھی۔ اس کے دامن میں پھولوں کا ہار اور ہاتھ میں نرگس کا گلدستہ تھا۔ جب وہ مجسمہ کے قریب پہنچی تو معاً اس کی نظر سرنگوں ٹیتھونس پر پڑی۔ اس نے فوراً دامن سے ہار نکال کر ٹیتھونس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور نرگس کا گلدستہ جوپیٹر دیوتا کے پاؤں پر رکھدیا۔ مقتدائے اعظم نے پکار کر کہا:۔

"خداوند کی مشیت پوری ہوئی۔ آج یونان کی مایۂ ناز حسینہ نے بربط نواز نوجوان کو اپنے لئے منتخب کرلیا۔ آب حیات ہمیشہ کے لئے انسانی دسترس سے محروم ہوگیا۔ اچھا ہوا جرم و معصیت کو دوام نصیب نہ ہوسکا۔"

ٹیتھونس تڑپ کر اُٹھا اور چیخ کر بولا:۔

"خداوند کے حضور! ــــ میں شکست عہد کا اعتراف کرتا ہوں۔ منزوا۔ اور منزوا کی محبت حاصل کرچکنے کے بعد مجھے کسی آب حیات کی ضرورت نہیں ــــ بقائے حیات اور دوام شباب ــــ اس ایک لمحہ پر قربان کرتا ہوں۔"

اس نے منزوا کو آغوش میں لیا اور یہ کہتا ہوا معبد سے نکل گیا۔

کیا کروں لے کر دوام زندگی
جب مرے پہلو میں ہو عید شباب

دربارِ لکھنؤ کی چند عجیب و غریب اختراعات!

از جناب پروفیسر محمد علم الدین صاحب سالک ایم۔ اے۔ لاہور

لکھنؤ دربار نے اپنے محروسہ علاقے میں عجیب و غریب تمدن رائج کیا۔ لکھنؤ اور فیض آباد اس کے دو بڑے مرکز تھے۔ اس عجیب و غریب تمدن کی ابتدا آصف الدولہ کے عہد سے شروع ہوئی۔ اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے وقت میں اسے معراج کمال حاصل ہوا۔ اس تمدن کی بعض بعض باتیں نہایت دلچسپ تھیں۔ انکا تعلق زیادہ تر محلات کی زندگی سے تھا۔ لکھنؤ دربار کا سرکاری مذہب شیعہ تھا۔ دربار کے وابستگان نے مذہب کی آڑ لیکر ایسی ایسی بدعات رائج کیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

غازی الدین حیدر کی بیوی بادشاہ بیگم کہلاتی تھی، وہ مبشر خاں منجم اور تقویم ساز کی بیٹی تھی۔ باپ نے اسے نہایت اچھی تعلیم اور اعلیٰ تربیت دی تھی۔ وہ علوم و فنون میں اچھی خاصی مہارت رکھتی تھی اور نجوم میں بھی ماہر تھی۔ اعلیٰ سیرت کے علاوہ حسن میں بھی یکتا تھی۔ غازی الدین حیدر نے شہزادگی کے عالم میں اسے دیکھا اور وہ اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا۔ آخر ۱۲۰۹ھ میں دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ ایک انگریز خاتون جو اس شادی کے موقعہ پر موجود تھی لکھتی ہے کہ:۔

> "جب شادی کی رسوم ختم ہوئیں تو جواہرات نچھاور ہونے شروع ہوئے۔ میری اور ریذیڈنٹ کی آستینوں پر چند جواہرات آ پڑے۔ ریذیڈنٹ نے اپنی آستینیں جھٹک دیں اور وہ جواہرات زمین پر گر پڑے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا یہ جواہرات شاہی خواصوں نے سمیٹ کر باہم تقسیم کر لئے ان میں زمرد۔ پکھراج۔ نیلم اور ہیرے بھی تھے"۔

بادشاہ بیگم کی طبیعت میں سختی اور مزاج میں گرمی تھی، شادی کے کچھ عرصہ بعد غازی الدین حیدر محل کی ایک لونڈی پر عاشق ہو گیا۔ اس لونڈی کو وہ "صبح دولت" کے نام سے پکارا کرتا تھا، بادشاہ بیگم کو جب اس عشق و محبت کا علم ہوا تو وہ بہت برافروختہ ہوئی۔ رقابت کی آگ سے جل بھن گئی۔ اور رشک و حسد کے مارے پیچ و تاب کھانے لگی۔ اس لونڈی کے ہاں ۲۲ جمادی الاول ۱۲۱۵ھ کو ایک بیٹا پیدا ہوا۔ بادشاہ بیگم کو اب انتقام لینے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اس نے طرح طرح کے عذاب دیکر صبح دولت کو مروا ڈالا۔ کہتے ہیں کہ یہ عذاب اتنا شدید تھا کہ اسکے بیان کرنے سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بادشاہ بیگم بچے کو بھی مروانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے محل کی ایک نوکرانی فیض النساء نے اپنی چرب زبانی سے بادشاہ بیگم کو قائل کر کے بچے کو بچا لیا۔ یہی بچہ بعد میں نصیر الدین حیدر کے نام سے لکھنؤ کا بادشاہ بنا۔ بادشاہ بیگم نے خود اس بچہ کی پرورش کی۔ وہ اس سے محبت رکھتی تھی۔

بادشاہ بیگم مذہب کی سخت پابند تھی، وہ روزانہ تلاوتِ قرآن کرتی۔ اور اکثر اوراد و وظائف میں مشغول رہتی تھی۔ وہ اثنا عشریہ تھی اور اس میں بیحد غلو کرتی تھی۔ وہ جاہ پسند۔ خود رائے اور خود سر تھی، حکومت اور طاقت ہمیشہ ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی طبیعت کی گرمی کا یہ عالم تھا کہ نصیر الدین حیدر برسوں اسکے نام سے لرزتا اور کانپتا رہا اور بلا تامل اسکے حکم کی تعمیل کرتا رہا۔

بادشاہ بیگم نے محل میں عجیب و غریب باتیں رائج کیں۔ اور یہ سب کچھ مذہب کے نام پر کیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

۱۔ **صاحبُ الزّمان کی چھٹی**۔ یہ ہر سال ماہ شعبان میں بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ اور اس پر بہت سا روپیہ صرف ہوتا تھا۔

(۲) **اچھوتی**۔ بادشاہ بیگم، عالی نسل۔ خوبصورت۔ شریف زادیوں کو دوشیزگی کے عالم میں روپیہ صرف کر کے یا کسی اور طریقے سے محل میں بلاتی اور انہیں ائمہ معصوم کی زوجہ بنا کر علیحدہ علیحدہ کمروں میں رکھتی۔ یہ کمرے پورے طور پر سجے سجائے ہوتے اور ان میں ہر قسم کا سامان آرائشی موجود ہوتا۔ ائمہ معصوم کی بیبیوں کے نام پر اُن کے نام رکھے جاتے۔ ان لڑکیوں کو اچھوتیاں کہتے تھے۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک اور معصوم ہیں۔ ہر اچھوتی کی خدمت کیلئے تین تین نوکرانیاں مقرر تھیں۔ وہ ان کی خدمت میں حاضر رہتیں اور خدمت کرتیں ان اچھوتیوں کو عمدہ سے عمدہ غذا اور اعلیٰ سے اعلیٰ لباس دیا جاتا۔ وہ عطر و خوشبو میں ڈوبی تخت پر بیٹھی رہتیں۔ بادشاہ بیگم ان کا اسقدر احترام کرتی کہ علی الصباح بہ نفسِ نفیس ان کے سلام کو حاضر ہوتی اور ان کی زیارت کو باعثِ برکت خیال کرتی وہ سلام و زیارت کے بعد کسی اور کام میں مصروف ہوتی۔ ان اچھوتیوں میں سے اگر کوئی شادی کی خواہش کرتی تو بیگم اسے روکتی اور کہتی کہ تم ائمہ معصوم کی زوجیت میں آ چکی ہو۔ اس سعادت کے بعد اس قسم کی خواہش گناہ کبیرہ اور کفر کے برابر ہے

شریعت کی رو سے یہ سراسر ناجائز ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک اچھوتی بشریت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بالکل بے قابو ہو گئی۔ اس نے ہر چند اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئی۔ رات کا پہلا پہر گذرا تھا کہ اس کے کمرے سے چیخنے چلانے اور رونے پیٹنے کی آواز آنے لگی، وہ سینہ کوبی کرتی۔ بال نوچتی اور عجیب و غریب حرکات کر کے ہائے قسمت، وائے قسمت کے نعرے لگاتی تھی۔ اس کی پریشانی سے محل کی تمام مستورات جاگ اٹھیں اور اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ وہ تھی کہ زمین پر لوٹ لوٹ جاتی تھی اور کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ بادشاہ بیگم کو اطلاع ہوئی۔ وہ بھی آموجود ہوئی۔ اس نے دم دلاسا دیکر پریشانی کا سبب پوچھا۔ اس نے سسکیاں لیتے اور آہیں بھرتے ہوئے کہا کہ میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیند کا غلبہ تھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ صاحب الامر والزمان میرے پاس پہنچے ان کا چہرہ غصے کے مارے تمتا رہا تھا آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں فرمایا۔ ہم تمھیں طلاق دیتے ہیں اور اپنی زوجیت سے جدا کرتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اب میں اپنی سیاہ بختی پر ماتم کر رہی ہوں۔ جب امام زمان نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو میرا ٹھکانا اب کہاں ہے۔ وہ یہ کہہ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی، بادشاہ بیگم نے حکم دیا کہ فوراً پالکی لاؤ اور اسے سوار کر کے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس کے باپ کے گھر پہنچادو۔ چنانچہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ اور چند یوم بعد اس نے شادی کرلی۔

(۳) اچھوتا یہ عجیب و غریب ادارہ بھی بادشاہ بیگم کے دماغ کی اختراع تھی۔ شاہی محل میں ایک کمرہ ائمہ معصوم کے لئے مخصوص تھا۔ انسان تو درکنار پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا تھا۔ جب کسی امام کا یوم ولادت آتا تو اس کمرے کو ہر طرح سے آراستہ کیا جاتا۔ فرش بدلا جاتا۔ سامان آرائش کو قرینے سے سجایا جاتا۔ سونے کی بنی ہوئی قندیلیں لٹکائی جاتیں۔ زربفت کی مسندیں بچھائی جاتیں اور اس امام کے نام سے جو اچھوتی منسوب ہوتی اس کو خوب سجایا جاتا۔ زیور پہنائے جاتے۔ زرق برق لباس زیب تن کرایا جاتا اور اسے زرنگار مسند پر بٹھا دیا جاتا اس کے بعد نذریں پیش ہوتیں۔ سب سے اول بادشاہ بیگم اپنی نذر پیش کرتی پھر محلات کی دوسری عورتیں باری باری نذریں پیش کرتیں۔ اس تقریب کے خاتمہ پر یہ تمام زیور۔ لباس اور سامان اسی اچھوتی کو مل جاتا مگر مکان کا تمام سامان کسی اور نوکر کو بخش دیا جاتا تھا۔

ان کے علاوہ محل میں ائمہ اثنا عشریہ کے روضوں کی نقلیں ہر روضے کے سامنے ایک ایک مسجد بنوائی گئی اور ہر روضہ میں ضریح کی نقل اور عتبات عالیہ کے دوسرے تبرکات رکھے جاتے، روضۂ عباس کی نقل بھی موجود تھی۔ ان کے سامنے شب و روز مراسم تعزیت ادا ہوتی تھیں۔

بادشاہ بیگم حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا بیحد احترام کرتی تھی، اسلئے حرم میں کوئی اچھوتی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے تجویز نہ ہوئی تھی۔

محلات میں یہ عجیب و غریب قصہ بھی مشہور تھا کہ جنوں کا بادشاہ اکثر بادشاہ بیگم کے پاس آیا کرتا ہے۔ وہ بیگم پر عاشق ہے۔ بیگم کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر مہینے میں دسویں دن غسل کر کے نہایت اعلیٰ لباس اور زیورات پہنتی۔ اور عطر و خوشبو مل کر تن تنہا بیٹھ جاتی۔ اس حالت میں کوئی لونڈی باندی یا خواص اسکے پاس جانے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔ بادشاہ بیگم کہتی کہ آج جنوں کے بادشاہ کی آمد آمد ہے۔ مغلانیاں اور دوسری نوکرانیاں خوشامد کی خاطر کہتیں کہ ہم نے اپنے کانوں سے حقہ پینے کی آواز سُنی ہے جو اس کمرے سے آرہی تھی۔ ایک کہتی کہ کوئی بیگم کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے اس کی آواز سُنی۔ الغرض جتنے مُنہ اتنی باتیں تھیں۔ اس تقریب کے موقعہ پر بھی خاص اہتمام ہوتا تھا۔ ایک مکان اس مقصد کے لئے بھی مخصوص تھا، وہ خوب آراستہ تھا، اور اس میں گانے بجانے کا تمام سامان جمع رہتا تھا۔ خوش گلو اور حسین عورتیں اس جلسے میں گایا کرتی تھیں، اسے وہ بیٹھک کہتے تھے۔

نصیرالدین حیدر بیگم کا "لے پالک" تھا، اس کے لڑکپن کے ایام تھے وہ اکثر اس تقریب میں شامل ہوا کرتا تھا۔ شہر میں عام چرچا تھا کہ جنوں کا بادشاہ بادشاہ بیگم اور شہزادے کے پاس اکثر آیا جایا کرتا ہے اور پریاں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں، گانے والی عورتوں کو انعام ملتا اور اس طرح اس تقریب پر بھی ہزاروں روپے صرف ہو جاتے۔ جو پوشاک اس موقعہ پر بیگم پہنتی وہ گانے والیوں کو مل جاتی۔

بادشاہ بیگم نے یہ رسوم کچھ ایسے وقت جاری کیں کہ ان کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ نصیرالدین حیدر بادشاہ بیگم کی آغوش میں پرورش پا چکا تھا۔ اور اسکی تمام تربیت اسی کی نگرانی میں ہوئی تھی، اس لئے اس نے نہ صرف ان رسوم کی پابندی ہی کی بلکہ بہت سی نئی باتیں بھی ایجاد کیں۔ جنہیں رائج کرنے کے لئے اسے بیشمار دولت صرف کرنی پڑی۔ اس کے وقت کا بیشتر حصہ ان باتوں میں صرف ہو جاتا تھا، کمپنی بہادر کی طرف سے اسے بار بار تنبیہ ہوئی کہ وہ اپنا وقت رعایا کی فلاح و بہبود میں صرف کرے۔ اور ان باتوں کو ترک کردے۔ مگر بادشاہ ان فہمائشوں کی پرواہ نہ کرتا تھا۔

اچھوتے اور اچھوتیوں کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ائمہ کی فہرست سے احتراماً نکال دیا گیا تھا۔ باقی گیارہ اماموں کی ازواج یا اچھوتیاں محلات میں موجود تھیں ہر ایک کی پوشاک پر ہزار ہزار بارہ بارہ سو روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی نہایت اعلیٰ اور پرتکلف ہوتا تھا۔ گیارہ اماموں کے علاوہ دیگر

بزرگانِ دین مثلاً حضرت قاسم اور حضرت عباس وغیرہ کے لئے بھی اچھوتیاں مہیا ہوتی تھیں۔

جب کسی امام کی ولادت کا دن آتا تو بادشاہ یعنی نصیر الدین حیدر حاملہ عورتوں کی طرح بناوٹی دردِ زہ میں مبتلا ہو جاتے، پھر وضع حمل کا وقت آتا۔ ہوقت سونے کی ایک جڑاؤ گڑیا بچے کی جگہ بادشاہ کے آگے رکھدی جاتی۔ گویا یہ بچہ بادشاہ کے ہاں تولد ہوا ہے۔ بادشاہ زچہ خانے میں داخل ہوتا۔ اور وہیں کچھ دن بسر کرتا۔ خدمتگار عورتیں اور لونڈیاں بادشاہ کی خدمت میں وہ تمام اشیاء خوانوں میں رکھ کر لاتیں جو ایک زچہ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس مدت میں آپ پرہیزی کھانا کھلایا جاتا، بادشاہ ان چیزوں کو خندہ پیشانی سے استعمال کرتا۔ یہ نفاس کا زمانہ ہوتا، اسلئے کوئی شخص بادشاہ کو چھو نہیں سکتا تھا۔ اس قسم میلاد کے موقع پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے، کھانے تقسیم کئے جاتے، نوبت نقارے بجتے، رنگ رلیاں منائی جاتیں۔ لکھنؤ تمدن کی تمام رسوم جو ایک بچہ کے پیدا ہونے پر ادا کی جاتی ہیں۔ چھ یوم تک ادا ہوتی رہتی تھیں۔ چھٹے دن بادشاہ چھٹی کا غسل کرتا۔ اسوقت ایک لونڈی اس مصنوعی گڑیا کو گود میں لئے ایک کونے میں کھڑی رہتی۔ لونڈیاں رسم کے بموجب چھ گھڑے پانی کے اس جگہ بہا دیتیں گویا بچے نے بھی غسل کر لیا ہے۔

رات کے وقت بادشاہ زنانہ لباس اور زیور پہنتا۔ عورتوں کیطرح مکان کے صحن میں نکلتا اور رسم کے بموجب ستاروں کا دیدار کرتا۔ اب چھٹی کی رسم ختم ہوجاتی۔ بچے کو ایک نہایت نفیس مسہری پر لٹا دیا جاتا۔ محلات کی ساری مخلوق دست بستہ کھڑی ہوجاتی، اور بڑے عجز کے ساتھ آداب بجالاتی، نذریں پیش ہوتیں۔ جب یہ رسم ختم ہوجاتی تو کھانے کے ہزارہا خوان وہاں لائے جاتے۔ ان میں طرح طرح کے پُرتکلف کھانے اور ہر قسم کے پھل ہوتے، ان پر فاتحہ پڑھی جاتی اور انھیں تقسیم کر دیا جاتا۔ خاص خاص آدمیوں کو ان کھانوں اور پھلوں میں سے حصہ بھیجا جاتا۔ نوکر چاکر، لونڈیاں، باندیاں بھی مزے لیکر کھاتیں، ہر امام کی ولادت کے دن سونے کے بنے ہوئے بچے اس اچھوتی کو دئے جاتے جو اس امام کے نام منسوب ہوتی تھی، باقی اچھوتیوں کو چاندی کی بنی ہوئی گڑیاں دیجاتی تھیں۔

گیارہ اماموں کے علاوہ اگر کسی اور بزرگ کا یوم ولادت ہوتا تو اس کی زوجہ (اچھوتی) خود معمولی زچہ خانے میں جاتی اور وہاں وہی رسوم ادا ہوتیں جو اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ اس رسم کو اچھوتا کہتے تھے۔ جب یہ اچھوتہ کی رسم ادا ہو چکتی تو بادشاہ زنانہ لباس میں جواہر نگار میانہ یعنی ڈولی میں سوار ہوتا۔ نوکر پھلوں اور مٹھائیوں کے خوان سر پر اُٹھا لیتے، پیادہ اور سوار فوج اس کے ہمراہ ہوتی۔ بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام کے ساتھ یہ جلوس شہر میں گشت لگاتا۔ اپنا دورہ ختم کرنے کے بعد یہ جلوس شاہی محلات میں داخل ہوتا "اچھوتہ" کے لئے کوئی میعاد مقرر نہ تھی۔ کبھی ہفتہ کبھی عشرہ اور کبھی اس سے زیادہ عرصہ تک یہ رسم ادا ہوتی رہتی۔ وقائع دلپذیر کا مصنف لکھتا ہے:-

"یہ رسم شہر میں اسقدر عام اور دلپذیر ہو چکی تھی کہ شہر کی اکثر عورتیں اپنے آپ کو اچھوتی کہتیں اور اس پر فخر کرتیں ان کی سب سے بڑی پہچان یہ ہوتی تھی کہ ان کے مرد فخریہ طور پر عورتوں کی طرح گفتگو کرتے اور نیم زنانہ وضع میں رہتے تھے، ان کی وضع قطع اور چال ڈھال میں نسائیت کا رنگ غالب ہوتا تھا۔"

اس طرح اماموں کی عروسی کی تاریخیں دریافت کرکے ان کی شادی کا اہتمام بڑے زور شور سے کیا جاتا تھا۔ ساچق اور حنابندی کی رسوم بڑے تزک و احتشام سے ادا ہوتی تھیں۔ ان رسوم کے شاہد عینی نے یہ سب واقعات وقائع دلپذیر کے مصنف کو سُنائے اور اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ انھیں اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"یکم محرم حضرت فاطمہ کے نکاح کا دن ہے۔ اس دن سونے چاندی اور لعل و جواہرات سے دو ایسی گڑیاں تیار کی جاتیں کہ انھیں دُور سے دیکھنے سے یہ گمان ہوتا کہ وہ درصل انسان ہیں، ان میں ایک کا نام حضرت علی اور دوسری کا نام بی بی فاطمہ قرار دیا جاتا۔ پہلے ان کی نکاح خوانی ہوتی، اور نکاح خوانی کی ہر رسم بڑی اچھی طرح ادا ہوتی، پھر انھیں زرنگار مسہری پر لٹا دیا جاتا۔ بادشاہ نذر پیش کرتا اور تھوڑی دیر آنکھیں بند کئے مسہری کے سامنے دست بستہ کھڑا رہتا۔ اس کے بعد قسم قسم کے پھل، طرح طرح کے کھانے، اعلیٰ قسم کی مٹھائیاں خوانوں میں لگا کر ان کے سامنے رکھدی جاتیں۔ ان پر فاتحہ پڑھا جاتا، اور پھر محل کے تمام آدمیوں میں تقسیم کر دی جاتیں، اسی طرح دوسرے اماموں کی شادی کے موقعہ پر کیا جاتا۔"

عزاداری کے ایام میں اچھا خاصہ اہتمام ہوتا اور تمام چیزوں کو چھوڑ کر اس موقعہ پر جو پھول استعمال ہوتے ان کے متعلق ایک مورخ لکھتا ہے:-

"شاہی باغات کے پھولوں کے علاوہ بازاروں سے پانچ ہزار روپے کے پھول یومیہ عشرۂ محرم میں خریدے جاتے جنہیں اس عزاداری کے موقع پر استعمال کیا جاتا۔"

اگر بادشاہ کو کوئی مشکل پیش آتی یا وہ اچانک کسی مصیبت میں

مبتلا ہوجاتا تو بادشاہ ان مقامات میں جہاں اچھوتیاں رہتی تھیں گوشہ نشین ہوجاتا۔ اہل شہر کو اس خلوت کی خبر ہوتی تو وہ اکثر بازاروں میں یہ کہتے سنائی دیتے کہ اعلیٰ حضرت "اچھوتہ" میں رونق افروز ہیں۔ ان ایام میں دربار بند اور دربار کا متعلقہ کام رُکا رہتا۔ اور ارشاذ و نادر ہی کوئی ایسا مہینہ ہوتا جب بادشاہ یہاں کچھ دن بسر نہ کرتا۔

یکم محرم سے چہلم تک بادشاہ کوئی کام نہ کرتا۔ وہ شراب اور عشرت کا عاشق تھا۔ مگر ان ایام میں وہ انھیں بھی ترک کر دیتا تھا۔ ضروری سے ضروری کام اور اہم سے اہم کاغذات رُکے رہتے۔ جب چہلم گذر جاتا تو پھر بادشاہ ان کی طرف توجہ کرتا۔

یہ ہیں وہ چند خصوصیات جن کی وجہ سے لکھنؤ کا تمدن خاص طور پر مشہور ہے۔ اور جس کی وجہ سے اس کی شہرت دور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی۔ اس خصوصیت کو اودھ والوں نے بہت حد تک واجد علی شاہ کے زمانہ تک قائم رکھا۔ اس کے بعد حکومت کے ساتھ اس کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا"

فکاہات

(از جناب محمد مصطفیٰ خاں صاحب مداح (احمق) پھپھوندوی)

دلِ برباد کی آشفتہ سامانی نہیں جاتی
عجب منحوس گھر ہے جسکی ویرانی نہیں جاتی

وہاں جانا تو تھا آسان لیکن اب یہ مشکل ہے
کہ صُورت بھی جنابِ دل کی پہچانی نہیں جاتی

گراں ہر چیز ہے اس دورِ قحط و خشک سالی میں
مگر اک خونِ عاشق جسکی ارزانی نہیں جاتی

سنیماؤں کے پردے کر رہے ہیں کوششیں کیا کیا
مگر تہذیب کے جلوؤں کی عُریانی نہیں جاتی

تصور ہے مرا واں خدمتِ فوٹوگرافی پر
جہاں عکاسیٔ بہزاد بھی مانی نہیں جاتی

مگر شاعر کا دل بھی گھونسلا ہوتا ہے اُلّو کا
یہی روتے ہیں سب اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

اگر جاتی ہے قوم اے واعظِ ناداں تو کیا غم ہے
کہ دسترخوان سے تیرے تو بریانی نہیں جاتی

مری حالت وہاں سمجھی بھی جا سکتی ہے، جانی بھی،
مگر سمجھی نہیں جاتی، مگر جانی نہیں جاتی!

مِٹے جاتے ہیں، پامالِ حوادث ہوتے جاتے ہیں
مگر اسٹیج پر اپنی رجز خوانی نہیں جاتی

ترے ڈنڈے میں منوانے کی طاقت بھی تو ہو احمق
یہ کس نے کہدیا ہے بات واں مانی نہیں جاتی

جذباتِ عالیہ

محتشمی سیّد عابد علیصاحب عآبد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی صدر شعبۂ ادبیات ایرانی دیال سنگھ کالج لاہور ولیکچرار پنجاب یونیورسٹی کے ہم ممنون ہیں کہ آپنے "مشہور" کو اپنے کلام بلاغت نظام سے تزئین بخشی۔ اس رنگ تغزل کو دیکھئے جس میں خوابیدہ احساس کو جگانے کے ساتھ ساتھ جادۂ قدیم سے ایک انچ بھی قدم نہیں ہٹا۔ ذیل کے شعر کا لطف شاید آئندہ نمبر تک زائل نہ ہوگا۔

سمجھیں گے کیا ہمارے مقامِ جلیل کو ❊ وہ کم نظر جو خیر میں شر دیکھتے رہے

آپ کو یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ سیّد صاحب آئندہ بھی اپنی نظم ونثر سے مشہور کی قلمی معاونت فرماتے رہیں گے۔ ایڈیٹر

دُنیا کو ہم بہ نوعِ دگر دیکھتے رہے
تاریکیوں میں شب کی سحر دیکھتے رہے

پژمُردہ ٹہنیوں پہ ثمر دیکھتے رہے
ہنستی رہی بہار جدھر دیکھتے رہے

طوفاں میں سطحِ آب سے ڈرتے رہے ندیم
ہم سینۂ صدف میں گہر دیکھتے رہے

اے ہمدمو اثر کی تمھیں جستجو رہی!
ہم اپنی جستجو کا اثر دیکھتے رہے

سمجھیں گے کیا ہمارے مقامِ جلیل کو
وہ کم نظر جو خیر میں شر دیکھتے رہے

دامانِ مہر و ماہ پہ ہم نے بڑھائے ہاتھ
کہنے کو تھے جو اہلِ نظر دیکھتے رہے

عآبد وہ داغِ عشق ہے سینے میں شعلہ زن
حیرت سے جسکو شمس و قمر دیکھتے رہے





واردات

از حضرت ادیب مالیگانوی

جناب ادیب مالیگانوی "مشہور" سے ایک خاص اُنس اور قلبی محبت رکھتے ہیں اور یہ اسی کا اقتضا ہے کہ ہر ماہ التزام کے ساتھ مجلّہ مشہور میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ میں نے ادیب صاحب کے کلام کی خوبی کا بارہا اعتراف کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ جدید رنگِ تغزل میں ادیب صاحب صفِ اول میں ہیں چنانچہ ذیل کی غزل آپ ملاحظہ فرمائیے اور اس میں جو صاد شدہ شعر ہیں ان کی معنوی نزاکت پر غور کیجئے تو یقیناً آپ بھی میری طرح مداح ادیب ہو جائینگے صاد شدہ شعروں میں ایک ایسا کیف و سرور ہے جو مے پرتگال میں بھی نہیں۔

ایڈیٹر

نوا پیرا، جوانانِ چمن ہوں یا فغاں کرلیں
ذرا اندازۂ آب و ہوائے گلستاں کرلیں

بہار آتی رہے گی، کاروانِ رنگ و بُو لیکر
ہم اپنے داغِ دل کو کیوں نہ جبتک گلفشاں کرلیں

شرابِ زندگی کے جس کے سائے میں چھلکتے ہوں
اسیرانِ قفس! آؤ، اک ایسی بھی فغاں کرلیں

محبت نے قسم کھائی ہے ہر بیداد سہنے کی
وہ اپنی ہمتوں کو بھی شریکِ امتحاں کرلیں

ص ابھی تک عشق، عمرِ جاوداں تقسیم کرتا ہے
جنہیں کرنا ہی اپنی زندگی کو رائیگاں کرلیں

تمنا ہے، اگر راہِ وفا میں کامرانی کی؟
مذاقِ عشق کو بیگانۂ سود و زیاں کرلیں

بدلتی ہے تو بدلے، لاکھ کروٹ، فطرتِ دُنیا
ہم اپنی سادگی میں کس لئے تبدیلیاں کرلیں

زبانِ برق بھی دے داد، اس انجام بینی کی
ص دلِ اہلِ چمن میں ہم جو اپنا آشیاں کرلیں

ص کھچا دل، اور نگاہیں اُٹھ گئیں بے اختیارانہ
وہ چاہیں تو اسی کو رنگ دیگر داستاں کرلیں

زمانہ اہلِ دل کو فرصتِ غم بھی نہ دے، شاید
غنیمت ہے، کہ ان کی یاد سے جی شاد ماں کرلیں

ادیب افسردگی سی چھا رہی ہے، ساری محفل پر
اجازت ہو تو ہم کچھ "وارداتِ دل" بیاں کرلیں

دعوت

از جناب کوثر صاحب چاند پوری

دعوت ہر وقت اور ہر موسم میں دلچسپ اور خوش آیند چیز ہے جب کسی تقریب کا رنگین اور دلفریب دعوت نامہ وصول ہوتا ہے تو صرف وہی ایک شخص خوش نہیں ہوتا جو مدعو کیا جاتا ہے بلکہ گھر میں کچھ اور ہستیاں بھی ہوتی جو اس مسرت میں برابر کی شریک ہوتی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں وہ ہوتی ہیں یعنی اہل خانہ، یا بیگم جن کو اصطلاح عام میں مستورات اور اس سے زیادہ فصیح زبان میں مسکورات بھی کہتے ہیں۔ جسوقت آدمی کوئی رنگین لفافہ لاکر دیتا ہے تو پڑھنے بلکہ کھولنے سے پہلے وہ پوچھتی ہیں۔

شادی کا معلوم ہوتا ہے.

دعوت کا خط ہے !

کب ہے دعوت ؟

کیا بچوں سمیت ؟

تنہا آپ ہی کی ؟

کون ہے یہ جاہل معلوم نہیں اُسے یہاں بچے بھی ہیں !

اچھے میاں کوئی سیر دو سیر تو کھا نہیں لیتے۔

بہت کھاتے چھٹانک آدھ پاؤ

پھر کل آپ تو دعوت میں جائینگے ؟

اچھا تو بکری کا گوشت نہ منگایا جائے۔

واپسی پر جب تک وہ کھانوں کی فہرست نہ سن لیں اسوقت تک انھیں اطمینان نہیں ہوتا۔ پھر ہر کھانے کی پوری لذت اور اس کے آب و نمک کا حال بیان کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ کھانا کھانے کے بعد جب گھر میں قدم رکھا جاتا ہے تو وہ چشم براہ ہوتی ہیں اور فوراً سوال کرتی ہیں۔

کہئے کھانا کھا آئے ؟

کیا کیا کھایا ؟

بریان تو باورچی نے پکایا ہوگا ؟

فیرنی تو ہمارے یہاں کی سی نہ ہوگی

بھلا میری برابر کوئی کیا پکائیگا فیرنی

آپ ہی بتائیے ایمان سے ایسا داغ کوئی اور لگا سکتا ہے فیرنی میں جیسا ہمارے یہاں لگایا جاتا ہے۔

اور قورمہ تو قاعدہ کا تھا ؟

آئس کریم بھی تھی دسترخوان پر ؟

اور آم ؟

ارے پھر تو نام ہی کی دعوت تھی

ہندوستانی دعوتوں میں میزبان عام طور سے صاحبزادگان کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں مگر مہمان اس فروگذاشت کا انتقام نہایت سخت لیتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کھانے والا کبھی تنہا نہیں جاتا جتنے بچے پاؤں سے چل کر دعوت میں پہونچ سکتے ہیں ان سب کی انگلی پکڑ کر ساتھ لیجانا مذہبی فریضہ خیال کیا جاتا ہے۔ اگر بد قسمتی سے بچہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اپنے پیروں سے جاسکے تو پھر محبت کرنے والا مہربان باپ اُسے گود میں لیجانا باعث نجات تصور کرتا ہے۔ اگر باپ کسی وقت اس اہم فرض کو نظر انداز کر دیتا ہے تو ماں کی بروقت تنبیہ سے بچہ کو اس کا حق مل جاتا ہے۔

لیتے جائیے نا !

بچہ ہے دل نہ توڑئیے !

دیکھیے روئیگا !

ہاں ہاں گود ہی میں اُٹھا لیجئے۔

شرمانے کی آخر کونسی بات ہے اس میں۔

دعوتوں میں یہی ہوا کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر ہندوستانی گھر میں ماں کے یہی جذبات ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سو باب شریک دعوت ہوتے ہیں۔ تو دو سو بلکہ ڈھائی سو کے قریب ان کے "قرۃ العین" نہایت بے تمیزی کے ساتھ کھانا کھانے بلکہ بکھیرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ جن میں سے پچاس فیصدی پھٹے ہوئے میلے پاجامہ پر عید کی قیمتی شیروانی پہنے ہوتے ہیں جس کی آستین کھانا کھانے کے دوران ہی میں "موم جامہ" کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، کیونکہ بچوں کی آستینوں اور بہتی ہوئی ناک کا تعلق اتنا فطری ہے جو کپڑے کی قیمت اور صفائی کے باوجود بہر حال قائم رہتا ہے اور اگر خدانخواستہ تقریب ایسے موقعہ پر ہو رہی ہے جب شہر میں

"کافی کہانی" بطور وبا پھیلی ہوئی ہے تو پھر نہ پوچھئے دستر خوان کی ان چھینٹوں کے پیچھے کیا گت بن جاتی ہے۔ اگر کوئی تمیزدار بچہ دستر خوان کو بچا دیتا ہے تو جوتوں کی شامت آجاتی ہے۔

آموں کے نوروز میں گٹھلیوں اور چھلکوں سے ہولی کھیلنا تو ہندوستان کے بعض صوبوں کا عام دستور ہے۔ مگر اب کہیں کہیں دعوتوں میں کھانے کا میچ بھی ہونے لگا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ دو موٹے تازے مہمان آستینیں چڑھا کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور بالکل اس رفتار سے جس سے آجکل مصر کے ریگستان میں اتحادی فوجیں بڑھ رہی ہیں کھانا شروع کر دیتے ہیں جو پہلے کھا چکتا ہے وہ ہار جاتا ہے۔ اسی قسم کے صاحب حوصلہ مرد مجاہد سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہو جانے کے بعد کسی نے کہا تھا کہ ذرا سا نمک سلیمانی کھا لیجئے۔ جس کے جواب میں انھوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ پیٹ میں اتنی گنجائش ہوتی تو ایک لقمہ ہی اور نہ کھا لیتا۔ دستر خوان کے صوفیائے کرام کا مقولہ ہے کہ پیٹ میں جتنی جگہ ہو اتنا کھانا کھا لینا چاہئے۔ کیونکہ پانی اپنی جگہ آپ کر لیتا ہے۔ رہا سانس تو اس کی پرواہ نہیں آیا آیا نہ آیا نہ آیا۔

اس عقیدے کے کوئی بزرگ جب کسی مہذب دعوت میں جا پھنستے ہیں تو بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ایک مرتبہ شہر کے معزز رئیس نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقعہ پر دعوت کی بدقسمتی سے میزبان میونسپل بورڈ کے ممبر بھی تھے اور ممبری کی مدت ختم ہونے والی تھی۔ اس نازک وقت میں رائے دہندگان کو کھانے پر نہ بلانا آئندہ کامیابی کے امکانات کو ختم کرنا تھا ظاہر ہے کہ ہندوستانی رائے دہندگان جو بالعموم "نکڑانی" ہی سے محروم ہوتے ہیں۔ کسی شان و شوکت کے مالک ہوا کرتے ہیں۔ دستر خوان بچھانے کے بعد چینی کی صاف ستھری پلیٹیں رکھی گئیں۔ پھر ڈونگوں میں کھانا آیا، اتفاق سے شوربہ کا ایک ڈونگا ان ووٹروں کے سامنے ہی رکھا تھا انھوں نے ذرا اور قریب کر کے اسے کھولا اور بے تکلف کھانا شروع کر دیا۔ سامنے جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے پہلے تو اپنی محرومیٔ قسمت پر ناک بھوں چڑھائی پھر ہمت کر کے ہاتھ بڑھایا اور ڈونگا اٹھانے کا قصد کیا۔

یہ بگڑ کر بولے کیا کرتے ہو؟

مجھے دیجئے ذرا یہ ڈونگا!

نہیں یہ میرا ہے تم اور منگاؤ۔!

بھائی ڈونگا ایک آدمی کے لئے نہیں ہوا کرتا!

آدمی آدمی میں فرق بھی تو ہوتا ہے۔ تم جیسوں کے لئے ایک نہ آتا ہوگا۔

ووٹر کو معلوم تھا اس وقت دستر خوان پر اسکی کیا حیثیت ہے اور میزبان کی نظر میں وہ کس وقار و امتیاز کا مالک ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسی کا ایک ووٹ نہ ملنے پر میزبان صاحب کا ممبری کی کرسی سے محروم رہ جانا عین ممکن ہے۔ آخر کافی جنگ و جدل کے بعد میزبان کو پورے ڈونگے پر ان کا حق تسلیم کرنا پڑا۔

جس طرح شہر کے لوگ زیادہ کھانے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے اسی طرح دیہاتی میزبان کم کھانے والے مہمان کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک زمیندار نے بڑے شوق اور اصرار سے اپنے پرگنہ کے تحصیلدار کی دعوت کی اور کھانا پکوانے میں بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ ہر قسم کھانے نہایت قاعدے اور سلیقہ سے تیار کرائے۔ تحصیلدار صاحب اپنے پورے عملہ کے ساتھ رونق افروز ہوئے اور حسب عادت تھوڑا سا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ میزبان کو سخت ناگواری ہوئی۔ کہ ہم نے تو آپ کی دعوت میں پانی کی طرح روپیہ بہا دیا اور آپ ہیں کہ دو لقمے کھا کر ہی خاموش ہو گئے۔ وہ بولا حضور اچھی طرح کھائیے

کیا پسند نہیں آیا کھانا۔

پھر تھوڑا سا اور سرکار!

ابھی تو آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

حضور کھائیے تو سہی کوئی نقصان نہ ہوگا۔

اچھا ذرا سا چورن کھا لیجئے گا اوپر سے!

تحصیلدار صاحب اصول کے آدمی تھے۔ انھوں نے کہا بھائی! میں نے خوب پیٹ بھر کر کھا لیا۔

میزبان کو بڑا قلق ہوا کہ اس نے تحصیلدار کے لئے اتنا روپیہ خرچ کر دیا اور وہ پیٹ سے زائد دو لقمے بھی اسکے کہنے سے نہ کھا سکا۔ جب دستر خوان اٹھایا جا چکا تو زمیندار منہ پھلائے پھر رہا تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ چودھری کھا چکے تحصیلدار صاحب؟

ہاں کھانا تو کھا چکے مگر کیا بتاؤں تحصیلدار دیکھنے میں بھی اچھا خاصہ مرد ہے۔ بولنے اور بحث کرنے میں بھی مرد ہے۔ چلنے میں بھی بودا نہیں چار چار کوس پیدل بھاگ لیتا ہے مگر بھائی کھانے میں نرا خرگوش نکلا۔ اس نے تو عورتوں کو بھی مات کر دیا۔ وہ بھی اس سے کچھ زیادہ ہی کھا لیتی ہونگی۔

انگریزی دعوتوں کا اصول انگریزی سیاست سے زیادہ پیچیدہ ہے اور ہر شخص سے اس کو پوری طرح سمجھ لینے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ پرانی وضع قطع کے کوئی بزرگ انگریزی کھانے کی میز پر آجاتے ہیں تو ان کی حیثیت یادگا دیوار قہقہہ کی سی ہو جاتی ہے۔

ہمارے ایک ایسے ہی سن رسیدہ دوست انگریزی قسم کا کھانا کھانے میں مصروف تھے پڈنگ کی ڈش آپکے سامنے آئی تو آپ نے بڑی رغبت سے

اسے نوش جان فرمایا۔ ملازم نے چاہا کہ صاحب کے سامنے سے ڈش اُٹھا کر آگے بڑھا دے آپ نے بگڑ کر فرمایا بھائی کھانے کو تو دے!

جس چیز کو دیکھو اُٹھا کر بھاگ جاتا ہے۔

ہٹ الگ ہم اسی سے پیٹ بھرینگے!

انگریزی میز پر کھانا شروع کرنا بھی ایک مہم سر کرنے کی برابر ہوتا ہے اگر قریب والے "صاحب" بھی خیریت سے ناواقف یا ستم ظریف واقع ہوتے ہیں۔ تو یہ کھانا آفتِ جان ہی ہوجاتا ہے۔ کھانوں کی صورت اور حیثیت سے کسی طرح معلوم نہیں ہوسکتا کہ انھیں کیونکر کھایا جاتا ہے۔ ایک صاحب میز پر کھانا کھا رہے تھے قریب ہی دوسرے "صاحب" تشریف فرما تھے یہ ان کو دیکھتے جارہے تھے اور جس طرح وہ کھاتے یہ نقل اُتار دیتے۔ چاول کھانے کی نوبت آئی تو قریب کے ہمسفر نے کہا آپ جانتے ہیں میں قبض کا مریض ہوں چاول مجھے نقصان دیتے ہیں۔

اچھا مجھے تو بتائیے کیونکر کھاؤں؟ کانٹے سے کھاؤں یا چمچہ سے یا ہاتھ سے؟

لاحول ولاقوۃ، چمچہ اور ہاتھ سے ہرگز نہ کھانا کانٹے سے کھائیے!

وہ حسب ہدایت کانٹے سے کھانے لگے لیکن چاول اور کانٹے کا معاملہ پانی اور جال کا سا نکلا۔ جتنے چاول وہ کانٹے میں بھر کر اُٹھاتے اس میں سے بہت کم منزل مقصود تک پہونچتے، اُستاد نے آہستہ سے کہا ذرا جھٹکے سے!

جھٹکے سے آخر کیونکر؟

کانٹے پر چاول رکھکر مُنہ کھول دیجئے اور کانٹے والے ہاتھ سے پوری طاقت اور جھٹکے کے ساتھ چاولوں کو مُنہ کی طرف اُچھال لئے، انھوں نے ایک دو دفعہ ایسا ہی کیا، لیکن مسلسل قہقہوں اور اشاروں سے گمان ہوا کہ انھیں اس کام میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

بعض دعوتوں میں منتظمین کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ کھانے والوں سے ان کی تعداد بڑھ جاتی ہے، اور اتنا شور و غوغا ہوتا ہے کہ بہرہ آدمی بھی تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے۔

ہاتھ دھولیجئے!

ارے تو یہ ادھر لاؤ!

صابون یہ ہے۔

جوتہ یہیں اُتار دیجئے۔

اندر چلئے اندر!

جب مہمان قرینہ سے بیٹھ جاتے ہیں اور کھانا آنے لگتا ہے تو ارباب انتظام کی پوری مجلس انتظامیہ گاڑھے کے میلے کچیلے کپڑے پہنے، ننگے پیر دسترخوان پر اسطرح چلنے پھرنے لگتی ہے جیسے برما روڈ پر چینی افواج، اور کھانا چُن دینے کے بعد بالکل اس انداز سے جیسے جامع مسجد میں مکبّر پکار کر کہدیتا ہے، دعا مانگنے کھڑے ہو! مستعد آدمی اذان دینے کے طور پر چیخ کر کہتے ہیں،

شروع کیجئے!

اس کے بعد چابک دست صاحبانِ انتظام شوربہ کی دیگچیاں لیکر ادھر ادھر دوڑنے لگتے ہیں اور جسوقت کوئی مٹی کا پیالہ دیگچی میں ڈبو کر کسی کو دینے کا ارادہ کرتا ہے تو ہر مرتبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈگمگاتی ہوئی کشتی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہماری سفید شیروانی پر اُلٹ جائیگی۔ اس موقعہ پر کافی ضبط کرنے کے بعد بھی مُنہ سے نکل جاتا ہے۔

دیکھئے!

مجھے تو بچائیے!

افوہ میری ٹوپی۔

وہ اس اضطراب کے مقابلہ میں نہایت اطمینان سے فرماتے ہیں،

بیٹھے رہئے!

ایک بوند نہیں گر سکتی۔

مگر اس احتیاط اور اطمینان ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ پاس بیٹھے ہوئے کسی سفید پوش کے سر پر پیالہ اُلٹ ہی جاتا ہے۔"

دو آتشہ

از:- ماہر القادری صاحب

یورش ہے درد و غم کی دلِ داغدار پر
آجاؤ اب بھی ہے مری دُنیا بہار پر

زاہد! تری نماز کا انداز ہائے! ہائے!
احسان جیسے کر دیا پروردگار پر

اس نے متاعِ دردِ محبت بھی سونپ دی
یہ اعتماد تھا مری مشتِ غبار پر

وہ چشمِ مست اور توجہ خدا کی شان!
اب میری زندگی کا نشہ ہے اُتار پر

اُس چشمِ التفات نے برباد کر دیا
چلنا پڑا ہے تیغِ محبت کی دھار پر

ماہر نفس نفس ہے سلام و پیامِ دوست
قربان سو وصال غمِ انتظار پر

اب کیا ہو

جاڑے کی ایک رات

جناب ایم۔ ایم اسلم صاحب

زیر نظر افسانہ اندازِ گل افشانی گفتار کی ایک حسین و جمیل تصویر ہے۔ خبر نہیں محترم ایم۔ اسلم صاحب نے ساغر و صہبا سامنے رکھکر اسے لکھا ہے یا چائے کی گرم پیالی پی کر۔ چونکہ افسانہ میں غایت شگفتگی ہے۔ اس لئے اول الذکر صورت یعنی پیمانۂ صہبا کا تصور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مشکل یہ آپڑی کہ اس سوئے ظن سے آپکے شیشۂ پارسائی کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال ہے۔ کچھ بھی ہو یہ افسانہ لطافت خیال میں یونانی نزاکتِ خیال سے ٹکرا رہا ہے اور ہم اسے اپنے شعر و ادب کا ایک شاہکار کہہ سکتے ہیں "اب کیا ہو؟" بلاشبہ یہ عنوان ہی عطر ادب ہے،

ایڈیٹر

(*)

کالی رات اور کڑکڑاتا جاڑا۔ آسمان پر بادل چھا رہے ہیں۔ بستر برف کی طرح سرد ہے لیکن ریڈیو کی آواز بہت صاف ہے۔ پنجاب میں تو ریڈیو کا لطف اگر کچھ آتا ہے تو جاڑے ہی کے موسم میں آتا ہے۔ تنہائی اور پریشانی دامنگیر ہے۔ اس حالت میں یہی غنیمت ہے۔ آخر کچھ تو ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ آخر یہ خرافات ہے کیا؟ نہ سر نہ پیر۔ سب درست ؎

عجب نہیں کہ پریشاں ہو گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

لیکن پریشانی کی کچھ وجہ بھی تو ہونی چاہئے۔ بے معنی کیسے ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

بھئی ہے تو سہی! اس چوہے کمبخت نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن ہے کوئی دزد دلاور ہی! بجلی کی روشنی میں بھی ڈاکہ زنی کا ارتکاب کر رہا ہے ریڈیو کا ہندوستانی پروگرام تو ختم ہو چکا۔ اب غیر زبان کے پروگرام ہیں۔ اور غیر زبان میں سمجھتا نہیں۔ سوچتا ہوں کہ خط کا جواب کیا دوں؟ اسی خط نے تو پریشان کر رکھا ہے جناب!

"آپ جو کچھ چاہتے ہیں میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے لیکن میں چاہتا کیا ہوں۔ بس اتنا ہی نا کہ ؎

ڈھونڈھے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

اور انھیں اتنا بھی منظور نہیں! خیر

"عشق اور الفت کی تصویر مصوروں نے اندھی دکھلائی ہے۔ لیکن دُنیا تو اندھی نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ یوں لبِ بام پہروں کھڑے رہنا۔ نہ کچھ کہہ سکنا نہ سُن سکنا۔ فائدہ ہی کیا؟ لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع دینا کہاں کی عقلمندی ہے"۔

اب تو آپ سمجھ گئے نا! کہ یہ قضیہ کیا ہے؟ اور اگر اب بھی نہیں سمجھے تو پھر صاف ہی کہدوں ع

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا!

یعنی ؎

آنکھ کھلتے ہی صبح تیری یار ؛ دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے ؛ شام تک جی اُداس رہتا ہے

"یہی تو مصیبت ہے۔ مجھ سے تو آپکے جی بہلانے کا سامان ہو نہیں سکتا۔ آپ کا جی تو تب بہلے۔ جب میں بھی صبح سے شام تک دیوار سے لگی تصویر کی طرح خاموش کھڑی رہوں۔ آپ کی گُنگ اشاریئے قسم لے لیجئے جو میں کبھی سمجھ سکی ہوں۔ تو میں پوچھتی ہوں کہ آخر اس قسم کی حرکات سے آپ کو لطف کیا حاصل ہوتا ہے۔ آپ کی بیقراریاں۔ بے تابیاں اور اضطراب لاکھ ہوں۔ مجھے اس سے کیا؟ عورت آن پر جان دیتی ہے۔ اگر کچھ عقل ہے یا عشق نے دماغ بالکل ہی معطل نہیں کر رکھا تو اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے!"

لیجئے! یہ ہے وہ خط جس نے مجھے دن بھر سے پریشان کر رکھا ہے۔ اب بتلائیے؟ کیا جواب دوں۔ عورت آن پر جان دیتی ہے۔ لیکن یہاں تو آن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ میل نہ ملاقات۔ صرف نامہ و پیام۔ وہ بھی

کوئی پندرہ بیس روز سے۔ سچ ہے پڑھے لکھے حسین کو قابو کرنا ذرا مشکل ہی ہوا کرتا ہے۔

اب فرمائیے! جسے اتنا بھی پسند نہیں کہ کبھی لب بام آکر جھلک ہی دکھلا دے۔ اس سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ عسرت اور تنگدستی میں یہ آن بان ہے تو اگر دولت کی فراوانی ہوتی تو پٹوا بھی دیتیں تو کچھ بعید نہ تھا۔

دل تو یہ چاہتا ہے کہ یہ کھیل ختم ہی کر دوں! لیکن کیا واقعی دل یہی چاہتا ہے۔ خیر! اس خط کا جواب تو ضرور دینا چاہئے اسکے بعد آخری فیصلہ کے متعلق غور کر لیا جائے گا۔

ایسی عورت کو دل کی تباہ حالت کا واسطہ دیکر نرم کرنا محض بے سود ہے۔ راز طشت از بام دینے کی دھمکی بھی ایک طفلانہ حرکت ہوگی۔ پھر لکھوں تو کیا لکھوں۔ سوچتا ہوں۔ سوچتا ہوں۔ لیکن کچھ سوجھتا نہیں۔ ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے ہوت بازار سے کوئی حضرت گاتے جا رہے ہیں ع

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی!

ہُوں! قدرت نے کیا خوب دستگیری کی۔ اس سے بہتر اور کوئی جواب نہ ہوگا۔

بس ٹھیک ہے!

مہربان! سلام شوق!

عتاب نامہ ملا۔ شکریہ! حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں ؎

نہ ملیگا نہ ملے گا کوئی ہم مر نہ جائینگے
خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی

والسلام!
راندۂ درگاہ

صبح مہترانی آئے گی اسے خط دیدوں گا۔ وہی تو ایک رازدار ہے۔

اُف توبہ! یہ ایک بھی بج گیا۔ اب سونا چاہئے! روشنی بند کی تو یہ کمبخت چوہا پھر دھاوا بول دیگا۔ اور جو روشنی رہی تو پروانے کب سونے دینگے۔ بہرکیف! روشنی بند ہی کرنی پڑے گی۔ نیت شب بخیر!!

دوسرے روز

بھنگن کی جوانی تو ایک مشہور چیز ہے۔ یقین نہ ہو تو راجو کو دیکھ لیجئے بیس بائیس کا سن ہے۔ گندمی رنگ ہے۔ بدن خوب مضبوط ہے۔ آنکھوں میں کاجل بھی لگاتی ہے اور چلتی بھی ذرا اکڑ کر ہے۔ سینہ کا اُبھار بھی قیامت ہے۔ لیکن ہے "کڑوی"۔ رعب میں آنا تو جانتی ہی نہیں۔ ہاں! ذرا خوشامد پسند ہے۔ ذرا کمرہ صاف کرے پھر بات کروں گا......

"راجو! تم دن بھر کام کرتے تھکتی نہیں۔ جب دیکھو کسی نہ کسی دھندے میں لگی ہو۔"

"کمانے والا جو بھرتی ہو کر چلا گیا۔ کام نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے۔"

"روپے بھی تو بھیجتا ہوگا۔ تمھارے ہی گہنے پاتے کی خاطر غریب نے پردیس جانا منظور کیا ہوگا۔ سچ کہو! یاد تو آتا ہوگا"

(مسکرا کر) "بیتی جو ہوا"

"بھئی! ہے قسمت والا!"

"کیسے؟"

"جسے راجو ایسی پتنی ملے!"

"مجھے کیا سُرخاب کے پر لگے ہیں؟"

"پر کیسے؟ تم خود سرخاب ہو"

"آج آپ یہاں بیٹھے رہے ہیں۔ کوٹھے پر نہیں گئے"

"تمھاراہی انتظار کر رہا تھا۔ ایک ذرا سا کام ہے اگر کر سکو"

"کیا کام" (ہنستے ہوئے)

میں نے تکیہ کے نیچے سے رات کا لکھا ہوا خط نکال کر اسے دکھایا اور کہا:-

"یہ پہنچا دو ذرا"

(خط لیتے ہوئے) "یہ بھی کوئی کام ہے بھلا"

"ہمّت کا کام ہے راجو!"

راجو نے میری طرف دیکھا

"یہاں سے فارغ ہو کر سیدھی وہیں جاؤنگی"

"اور جو کوئی جھاڑ پڑ گئی تو"

"پہلے ہی دن کا خوف تھا" ہنسکر "اب کیا پڑے گی"

خط تو میں نے راجو کو دیدیا ہے۔ لیکن اب راجو عصر کے بعد ہی آئے گی نو دس گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔ انتظار جو موت سے بھی زیادہ سخت ہے!

کوٹھے پر جاؤں یا نہ جاؤں۔ جانا تو چاہئے! کیا خیال ہے آپ کا؟

اب بارہ بجنے کو ہیں۔ صبح سے اسوقت تک چار بار کوٹھے پر سے ہو آیا ہوں۔ لیکن بے مرام ہی رہا۔ رہی میری بیتابی! تو یہ تو ایک متعدی مرض ہے ؎

سکوں نہ ڈھونڈ کہ صبح ازل سے ہے اتنک
ضمیر ارض و سما اوج مرد و زن بے تاب!

میری تو بات ہی جانے دیجئے!

چار بجے کے بعد (اسی روز)

آج دن بھر دیدارِ یار سے محروم ہی رہا۔ پہلے تو خیر دن میں دو چار بار جھلک نظر آجاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے میرے خط نے ناراض کر دیا ہوگا۔ راجو کمبخت بھی ابھی تک نہیں آئی ہے تو جھنجلائی لیکن جب تک سولہ سنگار نہ کرے گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ جوان جو ہوئی۔ جوانی اور شباب کو عسرت یا امارت سے کچھ واسطہ نہیں۔ امیر زادیاں اگر اعلیٰ قسم کے پوڈر اور پومیڈ استعمال کرتی ہیں تو غریب گلابی رنگ سے ہی گال لال کر لیتی ہیں۔ آج کل یہی فیشن جو ہوا۔ غلام اور محکوم فیشن کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں۔ مجھے تو اپنے مسلمان دوستوں پر تعجب ہوتا ہے۔ جانے! یہ بھلے لوگ اپنی شاندار اسلامی تہذیب کیوں بھول گئے۔ جس رنگ میں حکمراں کو رنگا ہوا دیکھتے ہیں وہی روپ دھار لیتے ہیں۔ اپنے سکھ بھائیوں کی قومی غیرت پر رشک آتا ہے۔ یوں تو ہم لوگ اپنے ان بھائیوں کا مذاق ہی اڑایا کرتے ہیں لیکن اگر ہم گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو ہمارا ان کا مقابلہ ہی کیا۔ مذہب اور قومیت کے رنگ میں قوم کی قوم ہی رنگی ہوئی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فیشن کی لعنت سے ہم لوگوں سے کچھ زیادہ ہی محفوظ ہیں۔ زندہ قوموں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوا کرتے ہیں۔

یہ راجو آج کہاں مر گئی۔ لیجئے! شیطان کا ذکر کیا تو شیطان آموجود ہوا۔ وہ آرہی ہے۔ ظالم کا بسنتی رنگ کا ڈوپٹہ کیا بہار دکھلا رہا ہے۔ ارے! کمبخت نے ناک پر بھی گلابی رنگ لگا رکھا ہے۔ ذرا ناک کی تیلی ملاحظہ کیجئے، کیا چمک رہی ہے۔ کچھ مسکراتی سی آرہی ہے۔ لیکن حیا کے ساتھ ؎

حسین ہونٹوں کی جنبشوں میں لرز رہی ہے حیا کی دُنیا
جو کیفِ شوخی بنا ہوا ہے نگاہ اس کو چھپا رہی ہے!

میرے خط کا جواب لائی ہوگی۔ بھلا ہو سکتا ہے کہ نہ لائی ہو۔

راجو آئی، میرا نوکر چائے لے آیا۔ راجو ہنس کر بولی۔

"ایک میرا کام کیجئے گا ذرا سا!"

"کیا؟"

راجو نے کرتے کے اندر سے ایک خط نکالا اور میری طرف بڑھا کر

"ذرا یہ پڑھ دیجئے!"

"میں اپنا خط تمہیں کیوں سناؤں" میں نے خط لیکر کہا۔

"توبہ ہے!" (ہنس کر) بلی کو چھچھڑوں کے خواب! یہ تو میرا ہے"

"تمہارا؟" کہاں سے آیا؟ اور میرا؟"

"آپ پڑھئے تو سہی۔ کیا لکھا ہے؟"

یہ راجو کے پتی کا خط تھا۔ میں نے پڑھ کر سنایا۔ اسکے پتی نے بیس روپے بھیجے تھے۔ راجو بولی:۔

"آئے بڑے راجا! جیسے میں اسکے روپے کی بھوکی ہوں۔ کوئی کام کی بات بھی لکھی"

"کہہ تو رہا ہوں۔ بیس روپے بھیجے ہیں"

"کچھ آنے کو نہیں لکھا؟"

"لکھا تو ہے! سنا نہیں تم؟"

"آپنے سنا ہی کب؟ کب آنے کو لکھا ہے؟"

"اُداس ہو گئیں کیا؟"

"توبہ ہے! اُداس بھی تو ہونا ہوا۔ لکھا کیا ہے؟"

"اگلے مہینے آئے گا۔ پندرہ روز کی چھٹی لی ہے"

"مذاق کرتے ہیں آپ! (کچھ شرما کر)

"یقین نہ ہو تو اُن سے پڑھوا لینا"

"کس سے؟"

"جن کے خط لایا کرتی ہو"

"توبہ ہے! آپ کے من میں تو خط بستے ہیں۔ یہ لیجئے اپنا خط۔ کیا رکھا ہے بیکار خطوں میں۔ یا ان کو اپنے یہاں بلوائیے یا ہمت کرکے خود وہاں چلے جائیے۔ جاڑے کی کالی راتیں ہیں۔ کون دیکھتا ہے راتوں میں"

"کمبخت! پہلے ہی کیوں نہ دیدیا!"

"کیا بیکار بات کے پیچھے پڑے ہیں آپ"

راجو نے اپنا خط لپیٹ کر کرتی کی جیب میں رکھا اور کام میں مشغول ہو گئی۔ میں خط پڑھنے لگا۔

"آپ تو پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ آپ کی تو وہی بات ہے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان! دو چار بار کوٹھے پر دیکھ لیا اور محبت ہو گئی۔ مرنے والے اور ہی ہوتے ہیں۔ آپ تو وہ سنگ دل ہیں کہ دوسروں کو مار کر ہی دم لیں۔ سبحان اللہ! قاصد خوب ڈھونڈا آپ نے۔ انتخاب کی داد دیتی ہوں لیکن اسے اتنا تو سمجھا دیجئے کہ ناک پر اتنا رنگ نہیں لگایا کرتے۔ دل بہلانے کو اچھی چیز ہے۔ خط کے بہانے سے ہی بات چیت کا موقع خوب نکل آتا ہوگا۔ مٹھی بھی تو اس کی گرم ہو جاتی ہوگی۔ بھول مجھ سے ہی ہوئی۔ پہلے ہی روز ڈانٹ دیتی تو اس الجھن میں کیوں پڑتی۔ میں ایک سہیلی کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ کمبخت دوبارہ آئی۔ خوب وفادار قاصد ہے آپ کا۔ اور طرحدار بھی۔ بھنگن ہوئی تو کیا۔ اسکے اس کہنے پر کہ

بی بی! کچھ تو لکھدو! مجھے ہنسی آگئی۔ پنسل پاس تھی
اس سے یہ سطور لکھدی ہیں۔ اور نہیں تو غریب کو دو چار آنے
ہی مل جائینگے۔ بس اب خدا ہی کا شکر کیجئے! اور مجھے
معاف کیجئے!"

سُن لیا خط آپ نے۔ لیکن کچھ سمجھے بھی آپ! دیکھ لی عورت کی ہوشمندی۔ دو چار سطروں ہی میں کیا کچھ کہدیا۔ اسے یقین تھا کہ میں حسب عادت کوٹھے پر گیا ہوں گا۔ میری تسلی کو یہ بھی بتلا دیا کہ آج سہیلی کے ہاں مدعو تھی۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف آگ اور دوسری طرف نہ ہو یعنی ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ؟
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی !

ارے معاذاللہ! یہ میں نے کیا کہدیا۔ آگ کیسی! یہ تو محض ایک دل لگی تھی۔ شغل بیکاری کہئے! یہ بھی سمجھا دیا کہ قاصد کا مُنہ بند رکھنے کے لئے اس کی مٹھی بھی گرمانی چاہئے۔ میں تو اتنے روز بھولا ہی رہا۔ جوان قاصد اور اس کا طرحدار ہونا ایک عورت یہ بات کیسے فراموش کر سکتی تھی۔ مجھ سے راہ و رسم نہ سہی لیکن راجو جوان تو تھی اور بن سنور کر بھی رہتی تھی۔ اس نے یہ بھی بتلا دیا ہوگا کہ گھر میں بس ہی میں ہوں۔ نہ محتسب نہ نگہبان! محض شرارت۔ مذاق! لیکن شرارت اور مذاق آپ بے معنی نہ سمجھئے! یہ کسی اور بات کی تمہید تھی۔

"کچھ کام تو نہیں" راجو نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا۔
"راجو! آج تو تمہیں کچھ انعام دینا چاہئے۔!"
"بن گیا کام؟"
ظالم کی شوخی دیکھو کیا مسکرا کر اور آنکھیں مٹکا کر پوچھا ہے۔
"کیسا کام؟"
"جس کے پیچھے آپ پڑے ہیں"
"کچھ تم سے کہا بھی تھا؟"
"کچھ بھی نہیں! سیانی ہے بڑی!"
میں نے دو روپے راجو کی طرف پھینکدیئے۔
"گویا دلالی ہے" اس نے روپے اٹھاتے ہوئے کہا۔
"مزدوری!" "گلابی رنگ ڈھیر سارا خرید لو!"
"توبہ ہے! تب ہی آپ میری طرف دیکھ کر مسکرایا کرتے ہیں"
یہ کہکر لچکتی ہوئی چلی گئی۔

ایک دوست کے ساتھ سینما جانے کا وعدہ تھا۔ وہ آگئے اور ہم سینما چلے گئے۔ ذرا شوق ملاحظہ کیجئے۔ شام کا شو دیکھ کر ایک اور سینما میں دوسرا شو دیکھنے جا بیٹھے۔ لیکن نہ پہلی فلم دیکھ کر کچھ لطف آیا نہ دوسری۔ بے معنی گانے۔ لغو مکالمے۔ رہا پلاٹ تو نہ سر نہ پیر۔ باہر نکلے تو ہوا بدن کاٹتی تھی۔ تانگے میں بیٹھے اور گھر پہنچے۔ کھانا بھی سرد ملا۔ دوسری شو دیکھنے کی یہ سزا تھی۔ خدا کا شکر ہے جناب موش کی کھٹ کھٹ آج کہیں سنائی نہیں دیتی۔ کہیں بلی کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔

سونے سے بیشتر نامۂ دلدار پھر ایکبار پڑھا۔ جیب ہی میں تو تھا۔ نیند تو آ رہی تھی لیکن دل چاہتا تھا کہ قاصد کے آتے آتے جواب لکھ رکھوں۔ دو ایک خط لکھے لیکن جواب کچھ پسند نہ آیا۔ آخر یہ لکھا!۔

مہربان!

آپنے سچ کہا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان! اب اگر آپنے مجھے مہمان تسلیم کر لیا ہے تو پھر میزبان کا مہمان سے یوں گریز کرنا کیا معنی! ہاں جناب! دو چار بار کوٹھے پر دیکھ لینے سے واقعی کیا بنتا ہے یہاں تو ؎

مشکلیں ہوتی ہیں آسان بڑی مشکل سے
وصل کے ہوتے ہیں سامان بڑی مشکل سے

لیکن یہ تسلی کیا کم ہے کہ سامان ہو تو جاتے ہیں۔ معاف فرمائیے! مجھ سے تو یہ بھنگن ہی خوش نصیب ہے، جسے آپ سے ہمکلام ہونے کا شرف تو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ہے بڑی سمجھدار۔ ایک روز کہہ رہی تھی کہ کیا بچوں کی طرح کوٹھے پر سے تاک جھانک لگائے رکھتے ہو۔ یا خود ان کے یہاں چلے جاؤ یا انہیں اپنے یہاں بلوا لو۔ دیکھ لیا آپنے! راجو کتنی سمجھدار ہے۔ رہا اس غریب کا گالوں اور ناک پر رنگ لگانا تو یہ بھی اس نے آپ سے ہی سیکھا ہوگا۔ میں کیا جانوں رنگ کہاں کہاں لگا کرتا ہے اور کیسے لگایا جاتا ہے۔

خیر! مذاق تو پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ اب فرمائیے ارادہ کیا ہے یہ احقر کسی روز در دولت پر حاضر ہو کر مجرا بجا لائے یا آپ قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیگی۔ واقعی دور دور سے ایکدوسرے کو دیکھنے سے کچھ لطف حاصل نہیں ہوتا۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ ہی کسی وقت غریب خانہ پر تشریف لے آویں۔ اپنا ہی تو گھر ہے۔ پھر کچھ فاصلہ بھی تو زیادہ نہیں۔ دو گھڑی بیٹھ کر چلے جائیے گا ؎

اُکسا دے چراغ آکے مرے خانۂ دل کا
قبل اسکے کہ شعلے کی جگہ صرف دھواں ہو

لیکن دیکھئے۔ اب ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا۔ سمجھ لیا نا آپ نے ؎

دل پر گذر چکی ہیں ہزاروں قیامتیں

اب مسکرا کے وعدۂ فردا نہ کیجئے!

والسلام

راندۂ درگاہ!

دوسرے روز

راجو آئی۔ اور آتے ہی کام میں لگ گئی۔ میرا خیال تھا کہ جانے سے بیشتر خود ہی کام کاج کو پوچھے گی۔ لیکن آج تو اس نے چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ کمبخت کی سُرخ رنگ کی چولی کیا بہار دکھا رہی ہے۔ گندمی رنگ کی کلائیوں میں شربتی رنگ کی چوڑیاں کیا بھلی بھلی نظر آ رہی ہیں۔ ارے! یہ تو جانے لگی۔

"راجو!"

"کیا حکم ہے سرکار؟"

"پھر کچھ سوچا بھی تم نے؟"

"کیا سوچوں میں"

"تو یہ جاڑے کی کالی راتیں کیا یوں ہی گذر جائینگی؟"

"وہ کیوں؟ راتوں کو بیٹھے خط لکھا کیجئے!"

"جو کچھ مجھ سے کہا تھا اس سے بھی تو کہا ہوتا"

"کہہ دیکھوں گی" مسکرا کر "کوئی لکھا ہے خط آپنے؟"

"یہ لو" خط تو یہ لکھا رکھا ہے۔ لیکن کچھ ہمت بھی کرو"

راجو نے خط لے لیا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

آج دوبار کوٹھے پر گیا۔ بخت یاور تھا۔ دیدار ہو گئے! آج ایک ملنے والے آگئے۔ جانے! گھر والی سے خفا ہو کر آئے تھے۔ حضرت ایسے بیٹھے کہ چار بج گئے۔ دل کہہ رہا تھا کہ بام پر جاؤ۔ جاتا کیسے؟ یہ صاحب چار بجے کے بعد اٹھے ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد راجو آگئی۔ کچھ مسکرا رہی تھی۔

"جواب لائیں؟"

"نہیں"!

"ارے! یہ کیوں؟ ناراض ہو گئیں کیا؟"

"بہت زیادہ" مُسکراتے ہوئے۔

"کچھ وجہ بھی؟"

"خود پوچھ لیجئے گا"

"میں؟ ان سے؟"

"جی ہاں!"

"کیسے؟"

"جس طرح مجھ سے باتیں کر رہے ہیں"

دیکھا آپ نے کتنی شوخ ہے ظالم! جب بہت پریشان کر چکی تو کہنے لگی کہ وہ محبوبۂ طناز آج رات دس بجے کے قریب آئے گی اور صبح ہوتے ہی واپس چلی جائے گی۔

شکر کیجئے! اگر شادی مرگ نہیں ہوا۔

"تم ساتھ آؤگی"؟

"ہاں"!

"اور گھر واپس بھی تم ہی لے جاؤگی؟"

"جی ہاں"

"راجو! آج تم نے کمال کر دیا۔ کیا چال چلیں تم۔ کس طرح آمادہ ہو گئی؟"

"یہ ان سے پوچھئے گا"

راجو چلی گئی! دس کب بجیں گے؟ ابھی تو سات بھی نہیں بجے۔ ہے تو بھنگن ہی لیکن بہت ہوشیار نکلی۔ شاید کھانا بھی کھائے۔ دس بجے! آج کل تو رات کا کھانا بہت سویرے کھا لیا جاتا ہے۔ بہر کیف! کچھ تو ہونا چاہیئے۔ میں تانگے میں سوار ہو کر بازار گیا۔ کچھ پھل کچھ مٹھائیاں خرید لایا۔ وقت تو لیکن کٹتا ہی نہ تھا۔ ریڈیو کا پروگرام بھی کچھ ایسا ویسا ہی تھا۔ دہلی۔ لکھنو، سب بیہودہ! اپنے یہاں کی تقریر ہو رہی تھی۔ تقریر کے بعد ایک گیت تھا خدا خدا کر کے تقریر ختم ہوئی۔ اور پھر یہ گیت سُنائی دیا۔

کھیل انوکھے من کے

آئی جوانی! بیت گئے دن کھیلن کے!!

بھونرے مُنہ چومیں کلیوں کا، شور ہے جگ میں رنگ رلیوں کا

من میں جس کے پریم کی آگ لگی ہو؟

کچھ نہ سوجھے کچھ نہ بوجھے!

کھیل انوکھے من کے!!

گانے والی نے خوب لوچدار آواز سے گایا۔ لطف آگیا۔ لیکن آج تو دس بجنے سے رہے! انتظار بھی کیا مصیبت ہے۔ کل پڑتی ہی نہیں۔ دل کی دھڑکن جاتی ہی نہیں۔ اگر آرزوئیں کامیاب ہوتی نظر آئیں تو خوف پریشان کرنے لگتا۔ قربان جاؤں قسمت کے! موقع بھی خوب ملا۔ خوب مزے سے وقت کٹے گا۔ پہلی ہی ملاقات ذرا مشکل ہوتی ہے۔ پھر راہ خود بخود نکل آتی ہے۔ راجو کو مُنہ مانگا انعام دوں گا۔ واہ ری راجو! خدا خدا کر کے دس بجے۔ بس اب آتی ہی ہو گی۔ دریچہ کھول کر جھانکنے لگا۔

گلی سُنسان پڑی تھی۔ اور رات زلفِ دوست کی طرح سیاہ۔ اور جاڑا! دس بجکر دس منٹ ہو گئے۔ ممکن ہے گھر والوں میں سے کوئی جاگتا ہو۔ خدا کرے! اب تو ساڑھے دس ہونے لگے! اچانک دروازے کا پٹ کھُلا۔ راجو تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ اور اوپر آکر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے آگے بڑھکر سیڑھیوں کی طرف جھانکا۔ سیاہ رنگ کا برقعہ نظر آیا۔ میں ہاتھ پکڑ کر اوپر لے آیا۔ اور پلنگ پر بٹھا دیا۔

"مبارک ہو!" راجو نے مسکرا کر کہا۔ "میں سویرے ہی آجاؤنگی بس آج سے خط وَط لکھنے بند کر دیجئے!"

راجو چلی گئی۔ میں نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ سیاہ نقاب اٹھا ہوا تھا اور سیاہ نقاب میں سے چہرہ اس طرح نظر آرہا تھا جیسے سیاہ بدلیوں میں سے چاند! کچھ حجاب کچھ شرم!۔

ناز اور ناز برداریاں! کھانے پینے سے انکار!

پھر شکوے اور شکائیتیں۔

"خوب ہیں آپ بھی! پہلے ہی روز اشارے شروع کر دیے۔ میری ہی بھول تھی جو آپکو دیکھ کر بھی کھڑی رہی۔ آپنے اتنا تنگ کیا۔ کہ دل چاہتا تھا کہ اماں سے کہوں کہ مکان بدل لیں۔"

پھر کچھ قاصد کا ذکر اذکار!

"بڑی مکار نکلی یہ لونڈی تو۔ بڑا ہوشیار ایجنٹ ہے آپکا۔ جانے! کیا کچھ پڑھا کر بھیجا تھا اُسے آپنے؟"

پھر کچھ اپنی باتیں۔

"ابا جان کو اس دنیا سے گئے مدت ہو چکی ہے ایک بھائی ملازم ہے۔ تبدیل ہو کر اس شہر میں آئے ہیں۔ انھیں اکثر دورہ پر جانا ہوتا ہے۔ دس روز یہاں تو بس روز باہر"

"بہرکیف! اس ذرہ نوازی کا شکریہ!"

"پہلے مجبور کرنا پھر شکریہ! اب اگر کسی کو پتہ چل جائے تو پھر؟"

"فکر مت کیجئے! گلی سُنسان پڑی ہے"!

"لیکن یہ آپ کو سوجھی کیا؟"

"دل نے مجبور کر دیا! اور آپ؟"

"میں خود حیران ہوں؟"

"کیوں؟"

"آ کیوں گئی؟"

"میری محبت کھینچ لائی"

"اوہو! محبت کا دعویٰ بھی ہے"

"تو نہیں کیا۔ ارے! باتوں ہی باتوں میں بارہ بج گئے!"

"سو رہیئے!"

"اور آپ؟"

"میں راجو کی راہ دیکھتی ہوں۔ کہا بھی تھا نگوڑی سے جلدی آجائیو"

"ابھی تو تشریف لے جانے میں چار گھنٹے ہیں"

وقت خوب لطف سے گذرا۔ لیکن آنکھ اُسوقت کھلی۔ جب دروازہ زور زور سے کھڑکایا جا رہا تھا۔

"راجو آئی ہے۔ دروازہ کھولدوں"

"بہت جلدی آگئی کم بخت!"

"اچھا ہوا۔ کوئی دیکھے گا تو نہیں"

دروازہ پر برابر دستک ہو رہی تھی۔

"ٹھیرو! ٹھیرو! کھولتا ہوں"

وہ جب تیار ہو گئی تو بولی۔

"اب کھولدیجئے!"

"ارے!........."

"ارے!..........."

سامنے میری بیوی کھڑی تھی۔ یہ کئی روز سے میکے گئی ہوئی تھی۔ مجھے اس کے آنے کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ گاڑی صبح چار بجے پہنچی تھی۔ اب پانچ بجے تھے۔ میرا شب کا رفیق دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اور بیوی دروازے میں کھڑی غصے سے کانپ رہی تھی۔ اور میں مجرموں کی طرح پلنگ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

فرمائیے! اب کیا ہو؟

"قطعہ تاریخ سالنامہ مشہور"

(از جناب شیخ محمد عبدالعزیز صاحب عزیز حاصلپوری از مُلتان)

دیکھ کر "سالنامۂ مشہور"
لُطف اندوز ہو رہے ہیں سب
بہرِ تاریخ اے عزیز کہو
"ہے یہ روشن چراغِ علم و ادب"
۱۹ ۴۳

افسانہ

دولت

از جناب محمد امین صاحب ضاشر قپوری

رحیم بخش کی زندگی گمنامی کی زندگی تھی۔ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی طرح کوئی اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کا چھوٹا بھائی فیض بخش بھی اسے بھول گیا تھا۔ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ ہر روز آمنا سامنا بھی ہوتا تھا۔ کریم بخش نے کئی بار چاہا کہ بھائی سے بات کرے وہ آگے بڑھتا مگر فیض بخش مُنہ پھیر لیتا۔ اسے رحیم بخش سے نفرت نہ تھی، بلکہ بھرے بازار میں اس سے بات کرنا کسرِ شان سمجھتا تھا۔ میلے کچیلے پھٹے کپڑوں سے اسے بدبو آتی تھی۔ اور ان سب باتوں سے بڑھکر دنیا کا آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا اور طرح طرح کی کانا پھوسیاں "عجیب آدمی ہے کنگلے سے مصافحہ کر رہا ہے، باتیں کر رہا ہے، اسے اپنی امارت کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں۔ وغیرہ وغیرہ"

اس کے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں گونجتیں، جیسے دُنیا اس کا مُنہ چڑھا رہی ہے، بڑبڑاتا ہوا بھاگنے کی کوشش کرتا۔ بھائی سے دُور بھاگنے کی، رحیم بخش کا ہاتھ گر پڑتا، کہتا "میں نے غلطی کی! جو اس کے نام سے پکارا ــ وہ اب میرا بھائی نہیں ہے، اور لوگوں کی طرح وہ ایک انسان ہے ایسا انسان جو رحیم بخش سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا" پھر اس کی آنکھیں خود دیر پڑتیں "رحیم بخش تو انسان ہے؟" آپ ہی کہتا "کون کہتا ہے کہ میں انسان ہوں؟ کاش میں حیوان ہوتا، لوگ اسقدر نفرت تو نہ کرتے مجھ سے"

پھر کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں، اس کے پھٹے کپڑے جیسے اُجلے اور صاف کپڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے، لکڑی کے بجائے ہاتھ میں جلیبی خوبصورت چھڑی تھی، لوگ مصافحہ کے لئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے "آپ کہاں تھے اتنے دنوں خوب منافع ہو رہا ہوگا، جنگ میں ہر چیز ناپید ہو گئی ہے، مگر تمھارے پاس تو گودام بھرے ہوئے ہونگے، ایک کے چار ہو رہے ہونگے۔ خدا اور برکت دے۔

ہاں بڑے صاحبزادے کی طبیعت کیسی ہے اب، آج صبح ذکر ہو رہا تھا جب سے معلوم ہوا ہے تم سے ملنے کے لئے بے چین تھا، اچھا ہوا جو ملاقات ہو گئی کس کا علاج ہے؟ وہ حکیم صاحب بہت ہوشیار ہیں، اور لائق بھی، آج ان کی ٹکر کا سارے شہر میں کوئی حکیم نہیں ہے، دم توڑتے ہوئے مریض دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں ان کے علاج سے، دور کیوں جاتے ہو۔ میرے بھائی نام تو آپ جانتے ہی ہونگے، وکالت کرتے ہیں، نزلہ زکام میں مبتلا تھے، بخار پیچھا نہ چھوڑتا تھا، کاروبار چوپٹ ہو گیا، میں انھیں حکیم صاحب کے پاس لے گیا۔ بس آٹھ روز میں سب روگ چلا گیا۔ گھبرائیے نہیں انشاءاللہ جلد فائدہ ہو جائے گا ــ"

"ہی ہی ہی" وہ کھِل کھلا کر ہنس پڑا، "سب روگ چلا گیا" دہرا کر بولا "لوگ بھی عجیب ہیں، کوئی نہیں پوچھتا میاں کیا حال ہے، پھٹے کپڑے پہنے ہوئے ہو، آؤ آج کھانا میرے ہاں کھا لینا ــ!" کہتے ہوئے اس کی نظریں دُور اُٹھ گئیں، دیگیں چمک رہی تھیں، شامیانے تنے ہوئے تھے، کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، غالباً کوئی بارات آنے والی تھی، اُس کے پاؤں اُٹھے، دیگ سے خوشبو کی مہک نکلی، رحیم بخش کی بھوک تیز ہو گئی، رات کو مسجد میں اس نے روٹی کا سوال کیا تھا، نماز کے بعد ایک صاحب اسے ساتھ لے گئے۔

"بھکاری ہو؟"

"نہیں صاحب، کاروبار چوپٹ ہو گیا، ہاتھ میں ایک پیسہ نہیں، جو دھندہ کروں، مزدوری کے لائق نہیں ہوں، بڑھاپے کی عمر ہے، خدا یہ وقت آنے سے پہلے اُٹھا لے، اپنے پرائے کوئی ساتھی نہیں ہے، میاں صاحب ایڑیاں رگڑ رہا ہوں"

آدمی رحمدل تھے، دو روٹی اور سالن لے آئے، اس نے پیٹ بھر کر کھایا رات کو گہری نیند سویا، صبح سے دوپہر ہو گئی، پیٹ بھوک سے بھینچ رہا تھا معلوم ہوتا تھا آنتیں سکڑ گئی ہیں اور خالی پیٹ میں اس طرح بج رہی ہیں جیسے کسی خالی برتن میں ٹھیکرے آواز دیتے ہوں، وہ قریب جا کر کھڑا ہو گیا "کھانا تیار نہیں ہوا کہ کنگلے پہلے ہی آن دھمکے"، ایک بولا، دوسرے نے کہا "بارات کا انتظار کیوں کرتے ہو، ان لوگوں کو ہی کیوں نہ کھلا دیا جائے" پہلے نے دوسرے کو مسکرا کر دیکھا، بولا "باوا کا قرض لینے آئے ہو، کھانا چاہتے ہو تو شام کو آنا، یہ ٹب جھوٹے ہی کیلئے رکھے ہوئے ہیں" اشارہ کرتے ہوئے بولا، وہ کچھ کہے بغیر لوٹ آیا۔ "یہ باراتیوں کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ نئے اور بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس باراتی اس سے پیٹ بھرینگے، بہتیروں کا پیٹ پہلے ہی بھرا ہوا ہوگا، صبح سے اب تک کئی بار کھایا ہوگا ناشتہ، نہاری اور نہ جانے کس کس بہانے سے پیٹ کی تواضع کی جاتی ہے۔

اس کے کان میں ڈکاروں کی آواز گونجنے لگی،

کھٹی میٹھی ڈکاریں۔ "یار پیٹ بہت بھر گیا ہے، قورمہ بہت لذیذ تھا ہاتھ کھینچنے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی، سوڈا کی چار بوتلیں بھی پی ہیں مگر طبیعت کسملا رہی ہے"

ایک نے ہنس کر کہا" بھائی مال پرایا تھا مگر پیٹ تو اپنا تھا، دیکھ بھال کر کھاتے"

"پرایا مال اور اپنا پیٹ" وہ بولا" یہاں اپنا مال بھی پرایا ہے، اور پیٹ البتہ دونوں وقت مُنہ کھول دیتا ہے، کھانے کو مانگتا ہے، کھانا، کھانا— ! کون کھلائے" "بھائی بھوکا ہوں، روٹی دلوا دو" ایک سے بولا۔

"جیب بھر رہی ہوگی، بھکاری بہت جمع کرتے ہیں، روٹی لے کیوں نہیں لیتے، چار پیسے خرچ ہونگے، بھیک مانگتے شرم نہیں آتی تمہیں، لوگوں کو پریشان کرتے ہو"

اس نے گردن جھکالی، پھٹی ہوئی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا، پیسے! کہاں ہیں میرے پاس؟ سوچتے ہوئے اس نے چند ٹھیکرے جیب میں ڈال لئے، ہلاتے ہوئے بولا" جیب بھر گئی ہے اب تو— میری جیب بھری ہوئی ہے" "میں ان سے کھانا خرید سکتا ہوں، کپڑے خرید سکتا ہوں، رہنے کے لئے مکان خرید سکتا ہوں موٹر لے سکتا ہوں—"

تیزی سے ایک پھل والے کی طرف بڑھا، زرد زرد کیلے چمک رہے تھے،

"کے پیسے کی درجن ہے؟"

"چھ آنے"

"چھ آنے" کہتے ہوئے بولا" ایک درجن دیدو" پیسے نکالنے کیلئے جیب میں ہاتھ ڈالا، ایک بڑا ٹھیکرا اس کے ہاتھ پر ڈال کر بولا" لو پیسے"

"مذاق کرتے ہو"، دوکاندار چونک کر بولا۔

"یہ پیسے نہیں ہیں کیا؟" مسکرا کر بولا

"میں کہتا ہوں مذاق نہ کرو، پیسے نکالو" ٹھیکرا پھینک کر بولا، ٹک کی آواز آئی، ٹھیکرا دُور جا پڑا تھا، اُس نے مڑ کر دیکھا۔

"کیلے رکھدو" وہ اسکے ہاتھ سے چھین کر بولا

"چلے آئے ٹھیکرے جیب میں ڈالکر کیلے خریدنے"

اس نے چونک کر دیکھا جیسے اب اس کا دماغ ٹھکانے پر آگیا تھا۔

ٹھیکرے پھینک کر بولا" میں پاگل ہوں۔ ٹھیکروں کو پیسے سمجھکر جیب میں رکھ لئے" زمین پر نظریں گاڑ دیں۔ چیخکر بولا" یہ ٹھیکرے کسی کا نقصان تو نہیں کرتے۔ نہ جانے کتنے لوگ انھیں ٹھوکر مار کر دور پھینکدیتے ہیں، اور پیسے، تانبے، چاندی اور سونے کے گول گول سکے اندر ہی اندر ہزاروں کے دل چھید ڈالتے ہیں، لاکھوں کی جانیں لے لیتے ہیں، چوری، جھوٹ، قتل نہ جانے کیسے کیسے فعلوں پر آمادہ کرتے ہیں، بھائی سے بھائی کو جدا کر دیتے ہیں" کہتے ہوئے اسے فیض بخش یاد آگیا۔ کس طرح اس نے بڑے بھائی کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھا کر ساری جائداد پر قبضہ جما لیا تھا۔

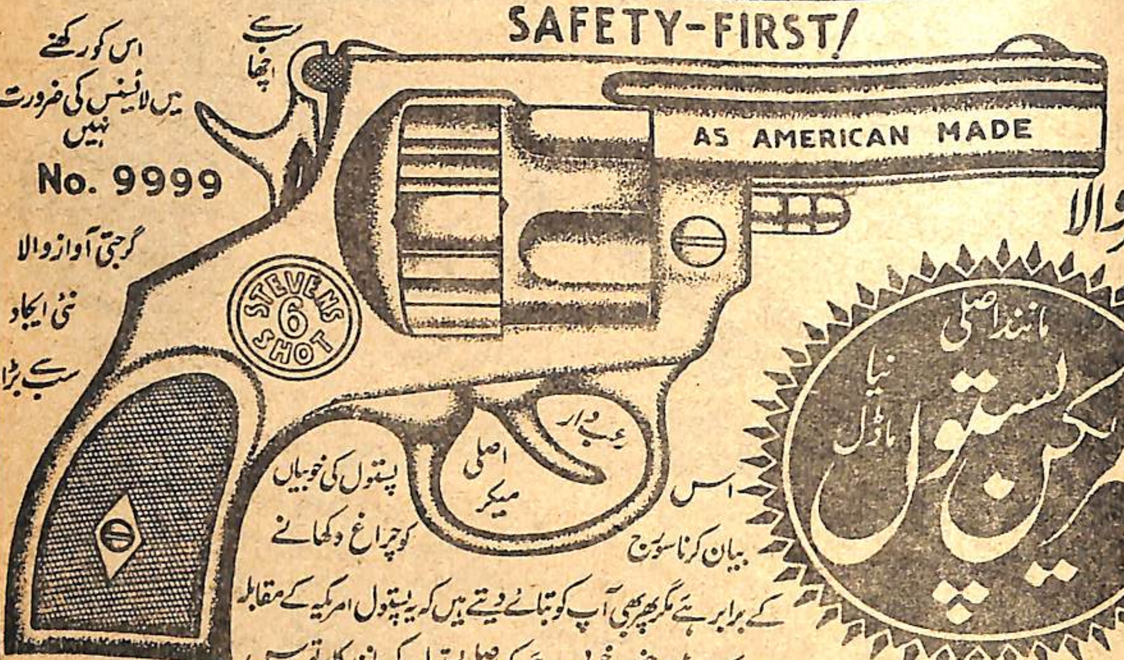
لوگوں نے کہا" مقدمہ کرو، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ، انصاف ہوگا، خرچہ ہم دیتے ہیں، بعد میں ادا کر دینا، وہ بولا" جس بھائی کو محبت سے پالا ہے آج اس کے لئے کچہری میں جاؤں، مقدمہ لڑوں، جس پودے کو پسینے سے سینچا ہے آج خود ہی اس کی جڑ کاٹ کر نیست و نابود کر دوں—" وہ کانپ اُٹھا، "مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ میرے کونسے بال بچے ہیں، اکیلا دم ہوں، دو روٹی دونوں وقت کافی ہیں فیض بخش تو آرام سے رہے گا—!"

اُس نے مڑ کر دیکھا، سامنے سے بارات آرہی تھی، پھولوں سے لدی ہوئی موٹر کی مہک سے بازار میں خوشبو پھیل گئی، وہ بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا ہشاش بشاش باراتی— ہجوم کو چیرتی ہوئی اس کی نظریں ایک چہرے پر رُک گئیں، فیض بخش اس کا چھوٹا بھائی بارات کے ساتھ جا رہا تھا۔

"راستہ چھوڑدو موٹر آرہی ہے" ایک گرج کر بولا، وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے کان گونجنے لگے "کھانا چاہتے ہو تو شام کو آنا" ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کے آگے بڑے بڑے ٹب گھوم گئے، جو جھوٹ کے لئے رکھے ہوئے تھے، وہ شانے جھٹک کر ایک طرف کو ہولیا"

خاص رعائت۔ ہم نے قیمتوں میں بڑی بھاری رعائت کردی ہے۔ اس لئے جلد فائدہ اٹھائیں:۔

مُفت! بالکل مُفت! مُفت!



زبردست
چھ فیر والا

مانند اصلی
نیا
امریکن پستول
ماڈل

اس کو رکھنے میں لائیسنس کی ضرورت نہیں

No. 9999

گرجتی آواز والا
نئی ایجاد
سب سے بڑا

اس پستول کی خوبیاں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے مگر پھر بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ یہ پستول امریکہ کے مقابلہ پر حال ہی میں تیار ہو کر آئے ہیں جنمیں خوبی یہ ہے۔ کہ اصلی پستول کی مانند کارتوس رکھنے کی چرخی بنی ہوئی ہے اور چرخی میں چھ کارتوس آجاتے ہیں۔ گھوڑا دبانے سے چرخی خود بخود گھومتی ہے۔ اور کارتوس (شاٹ) چلنے کی اس زور سے آواز آتی ہے کہ خود چھوڑنے والا بھی حیران رہ جاتا ہے اپنی جان و مال کی حفاظت کیلئے اس پستول سے بہتر اسوقت کوئی ریوالور نہیں ہے اسمیں ½ انچ کارتوس چلتے ہیں اس پستول کا وزن تقریباً ۱۵ اونس ہے لمبائی قریباً 7 چور۔ ڈاکو اور جنگلی جانور مثلاً شیر چیتا۔ ہرن وغیرہ اسکی آواز سنکر اور شکل ہی دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت حفاظتِ جان و مال کیلئے بہت ہی عمدہ چیز ہے۔ مانند اصلی پستول ہندوستان بھر میں صرف ہم سے ملیگا قیمت نمبر ۷۷۷ پستول بمعہ ۵۵ کارتوس صرف چار روپیہ آٹھ آنہ (Rs. 4/8/-) نمبر ۸۸۸۸ عمدہ کوالٹی اصلی فولاد کا بنا ہوا بمعہ ۵۵ کارتوس رعائتی قیمت صرف پانچ روپیہ تیرہ آنے (Rs. 5/13/-) نمبر ۹۹۹۹ سپیشل درجہ خاص نیو ماڈل بمعہ ۸۵ کارتوس قیمت چھ روپیہ بارہ آنہ (Rs. 6/12/-) فالتو شاٹ (کارتوس) چار سو 400 کی رعائتی قیمت (Rs. 3/-/-) پستول لگانے کے لئے خوبصورت پیٹی و خول ایک روپیہ بارہ آنہ (Rs. 1/12/-) پستول کے لئے تیل (-/12/-) محصولڈاک و پیکینگ -/15/1 الگ۔ اس پستول کو مشہور کرنے کیلئے ہر پستول کے ساتھ ایک عدد فینسی رسٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت ہے۔ خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے۔ اور ایک تولہ (سونا) لنڈن نیو گولڈ بالکل مفت بھیجا جاتا ہے۔

ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کردی جاتی ہے دو پستول اکٹھے منگوانے والے کو محصولڈاک بالکل معاف اور تین تولہ (سونا) لنڈن نیو گولڈ اور تین عدد گھڑی مُفت انعام

ملنے کا اصلی پتہ } لنڈن کمرشل کمپنی ایم۔ڈی پوسٹ بکس 165/165 لاہور شہر۔ (پنجاب)



Bosfo
Be more lovely with vitamin F
Sunil
SNOW
جلد کی نزاکت اور خوبصورتی
وٹامن ایف پر موقوف ہے جو سنیل سنو میں خاص طور پر آپکی خوبصورتی
برقرار رکھنے کیلئے شامل کیا گیا ہے اپنے شہر کے دوکانداروں سے طلب فرماویں۔
تیار کردہ
بمبئی سوپ فیکٹری بمبئی
سول ایجنٹ
چشتی اینڈ کمپنی لمیٹڈ چاندنی چوک دہلی
SUNIL SNOW
SUNIL SNOW

ہمہ اوست

از جناب سید بشارت علی صاحب بشارت دہلوی

تیری ہر اک دل میں پنہاں میرے مولا راز ہے　　ہر گدائے بینوا کو تیرے در پر ناز ہے!
باب رحمت زاہد و عاصی پہ یکساں باز ہے　　عشق کی کچھ انتہا تیرے نہ کچھ آغاز ہے
یہ سرودِ عشق بھی کیا خوب تیرا ساز ہے؟
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

عشق والوں کو خدا! چشمِ بُتِ طناز ہے　　اور مجنوں کو خدا لیلےٰ کا ہر انداز ہے!
پوچھئے مُسلم سے کہتا ہے خدا اک راز ہے　　دعوئ مطرب خدا میرا ہی ہم آواز ہے!
راگ ہیں تیرے ہیں سب جیسا کسی کا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

چار عُنصر سے دیا ہے ایک طنبورہ بنا　　آمد و شد کے لئے تارِ نفس پیدا کیا
کر کے سب کچھ عشق کا سُر اسکے اندر بھر دیا　　راگ یہ جس نے الاپا وہ ہی عارف ہو گیا
الغرض یہ سازِ ہستی سازِ یزداں ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

پردۂ گُل میں ہے بلبل کو تری ہی جُستجُو　　سرو کی اک آڑ ہے قُمری کا ہے محبُوب تُو
ہر کلی کو بیکلی ہے اور ہے تیری آرزو　　پتّہ پتّہ میں پتہ تیرا، تری پھولوں میں بُو
تیرا جلوہ دیکھنے کو چشمِ نرگس باز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

برہمن کہتا ہے بُت بنکر تو بُت خانہ میں ہے　　کہتا ہے صُوفی کہ تو اس دل کے کاشانہ میں ہے
مست کہتا ہے کہ ساقی بن کے میخانہ میں ہے　　ہے گمُاں ساقی کا تو مے بنکے پیمانہ میں ہے
ہے غرض تو ہر جگہ لیکن جدا انداز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

نام رٹتی ہے چمن میں تیرا بُلبُل کی زبان!　　جستجو میں تیری کہتا ہے پپیہا پی کہاں؟
ہو صدا ناقوس کی یا ہو وہ کعبہ کی اذاں　　الغرض ہر ایک پردے سے تو ہوتا ہے عیاں
عقل عاجز ہے بشارت کی کہ یہ کیا راز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

سالِ نو

سال نو پر یہ آہنگِ درد ایسی نہیں ہے جس کو سنکر سننے والے تڑپ جائیں بلاشبہ سال گزشتہ نے عالم انسانیت کی تخریب میں جسقدر حصہ لیا ہے اسکی مثال تاریخ عالم میں نایاب ہے، ہم کہسکتے ہیں کہ ۴۲ء کے دامن پر انسانی خون کے اتنے دھبے تھے جن کا شمار بھی دشوار تھا۔ اور بجا طور پر ہر شخص کی یہ التجا تھی ع دامن یار خدا ڈھانکلے پردہ تیرا۔ بالآخر ۴۲ء کا پردہ ڈھک گیا اور ۴۳ء سے ہمارا نوجوان شاعر نازش دہلوی پوچھ رہا ہے کہ بتا! تو پھول برسائیگا یا آگ کے انگارے اُچھالیگا۔ امن و آسائش کا پیغام لایا ہے یا اپنے پیشرو کی طرح تباہی و بربادی کے مناظر دکھائے گا۔ اس کا جواب تو مستقبل کے ہاتھ میں ہے مگر ہاں ـــ نازش کی فصاحت و بلاغت۔ تسلسل اور روانی جو نظم ہذا کے ایک ایک نقطہ سے ہویدا ہے قدر دانانِ مشہور سے داد طلب ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی دِلّی کا مذاقِ سخن مُردہ نہیں ہوا۔"

ایڈیٹر

قاتلانہ شان سے اے سالِ نو آیا ہے تو
کیا کہوں کس اَبرِ خوں آشام کا سایا ہے تو

تیغ پھر نکلی نیامِ گردشِ ایام سے
بے گناہوں کا لہو ٹپکے گا سقف و بام سے

ہائے شانِ آدمیت کو شکستِ فاش ہے
موت کے جبڑوں میں جرّارِ وطن کی لاش ہے

زلفِ خاک آلود و پیچیدہ ہی نقشہ درد کا
چہرۂ گیتی پہ غازہ رہ گیا ہے گرد کا

پنجۂ افلاس نے لوٹا ہے دُنیا کا سُہاگ!
آسماں کے ہاتھ میں تیار ہے دوزخ کی آگ

دہر میں انسانیت بھی سر پٹکتی رہ گئی!!
زندگی تک اپنے مرکز سے بھٹکتی رہ گئی

آرہی ہے کان میں یہ کس کی آہٹ دیکھنا
ہائے دُنیا کے لبوں پر کپکپاہٹ دیکھنا

آستیں اُلٹے ہوئے تیغِ ستم تولے ہوئے
آرہی ہے سامنے وہ موت مُنہ کھولے ہوئے

تنگ ہے اب عرصۂ ہستی جہاں پر تنگ ہے
دعویٰ تہذیب جنکو ہے یہ انکی جنگ ہے

کفر گردی میں اگر ایمان قائم ہو تو ہو
دہر میں اک اتحادی شان قائم ہو تو ہو

سالِ نو کیا کوئی دلچسپی بھی تیرے ساتھ ہے؟
کیا نظامِ امن و آسائش میں تیرا ہاتھ ہے؟

کیا ترے دامن میں کچھ انصاف کے گوہر بھی ہیں؟
کیا تری تعمیر میں کچھ امن کے عُنصر بھی ہیں؟

عصرِ حاضر کیلئے بھی کیا کوئی بہبود ہے؟
زندگی بھی کیا ترے دربار میں موجود ہے؟

کوئی رنگِ عافیت بھی کیا ترے جامے میں ہے؟
کیا مقدر کا پلٹ دینا بھی ہنگامے میں ہے؟

جام و مینا کی بھی ہے جھنکار اس آواز میں؟
کیا محبت کے ترانے بھی ہیں تیرے ساز میں؟

پھول بھی برسینگے تیرے مُسکرانے میں کوئی؟
سکۂ آسودگی بھی ہے خزانے میں کوئی؟

تیرے زُمرے میں ہیں کیا کوئی طرب آثار بھی؟
ہیں جلو میں کیا معیشت کے علمبردار بھی؟

سوگواری میں ہے کیا کوئی جوانی کی بہار؟
قلزمِ ذخار میں ہے کیا روانی کی بہار؟

سانس اطمینان کا بھی کیا ترے سینے میں ہے؟
جوہرِ رنگین بھی کیا کوئی اس آئینے میں ہے؟

موجِ تسکیں بھی ہے کیا اس بادۂ سرجوش میں؟
کیا پناہوں کی ہے گنجائش تری آغوش میں؟

طالبِ نظارہ ہے نازش، اُلٹ اپنی نقاب
انقلاب اے سالِ نو، اے عصرِ حاضر انقلاب



بادلوں کے دامن میں

از جناب مولانا مشیر احمد صاحب علوی ناظر کاکوروی

سالنامۂ مشہور کیلئے

ہمارے محترم کرم فرما مولانا مشیر احمد صاحب علوی ناظر کاکوروی نے گذشتہ سال ایک کتاب لکھی تھی جو ہیرو لفٹیننٹ فلائٹ مسٹر کمال علیگ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط مسٹر کمال علیگ نے انگلستان سے اپنی ایک عزیزہ کو ہندوستان بھیجے تھے۔ خطوط بہت ہی دلچسپ ہیں اور تمام تر جنگی حالات سے لبریز ہیں۔ اگر ہم انھیں تبلیغی جنگی سیاسی مقالہ کہیں تو ناموزوں نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک خط آفتاب کے جنگی نمبر میں چھپ چکا ہے ہمارے پیہم اصرار پر ناظر صاحب نے "سالنامہ مشہور" کے لئے تین خط اور ارسال فرمائے ہیں اور آئندہ فروری نمبر کے لئے ایک دلچسپ تاریخی مقالہ "محمد لنکن" بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ہم وہ خط بھی جو آفتاب میں شائع ہو چکا ہے مع مزید تین خطوں کے شائع کر رہے ہیں اُمید کہ قارئین دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ فرمائینگے۔

ایڈیٹر

(✵)

از انگلستان

عزیز از جان ثریا خانم۔ خدا کرے تم بالکل بخیر ہو۔ تم کو حیرت ہوگی کہ اب تک میں نے تم کو کوئی خط نہیں لکھا۔ یقین مانو میرا دل خط نہ لکھنے سے بیچین تھا لیکن یہاں فرصت بالکل نہیں ملتی ہے۔ آج نوروز کی تعطیل ہے لوگوں کو شہر[شہروں] میں جانے کی اجازت ہے اسلئے پہلا کام یہی کرتا ہوں کہ تم کو خط لکھوں۔ تم کو حیرت ہوگی کہ انگلستان میں جنگ کے متعلق گھبراہٹ نہیں ہے۔ میں نے ایسا غیر معمولی استقلال برطانی آبادی میں پایا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ کارخانے کھلے ہوئے ہیں۔ اسکولوں میں تعلیم ہو رہی ہے۔ میدانوں میں بچے کھیل رہے ہیں حالانکہ کل شب کو ہمارے ہوائی بیڑے نے جرمنی اور اسکے مقبوضات پر بڑی شدت سے حملہ کیا تھا۔ فضائی وزارت کا بیان ہے کہ واسمشون کی گودی پر ہیسم کے مارشلنگ بارڈ پر اور ہالینڈ کے ساحل کی۔ ایک فیکٹری پر ہمارے بیڑے نے بڑی کامیابی کے ساتھ بم برسائے۔ جس کمرہ میں آج کل میں رہتا ہوں اس کی چھت پر بموں کی وجہ سے شگاف پڑ گئے ہیں۔

ہاں یہ تو کہنے کو بھول ہی گیا کہ جب ہمارا دستہ ہندوستان سے گذشتہ سال انگلستان ٹریننگ کے لئے آیا تھا تو حضور ملک معظم نے شرفِ باریابی بخشا۔ وزرائے سلطنت نے مصافحہ کیا۔ اکثر ہندوستانی طلبا نے جوش اخوت میں مصافحہ[مضافحہ] کیا۔ آکسفورڈ و کیمرج کی مشہور درسگاہیں دیکھیں۔ ڈاکٹر نکلسن سے بھی ملاقات ہوئی وہ ڈاکٹر ہادی حسن کو دریافت کرتے تھے۔ کیمرج کی مجلس میں بھی شرکت کی اکثر اصحاب سر بشیر حسین زیدی وزیر اعظم ریاست رامپور اور جسٹس مسٹر معین الدین انصاری فرنگی محلی کا بھی تذکرہ ہوتا رہا۔ عرصہ ہوا ان لوگوں نے نوائے کیمرج نامی اردو رسالہ یہاں سے نکالا تھا۔

انگلستان میں تمام ہندوستانیوں نے میرا خیر مقدم اسقدر جوش و طنیت اور خلوص سے کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو بے اختیار جاری ہوگئے۔ گھر کی یاد کو بھول گیا۔ ہر جگہ یقین مانو ثریا۔ تمھاری کمی محسوس کرتا رہا۔

لندن میں یونیورسٹی کے شعبۂ شرقیہ میں بھی مشرقی اخلاق دیکھکر طبیعت کو بڑی مسرت ہوئی۔ کسی قسم کی مغائرت یا چھوت چھات دکھائی نہ دی، ایک ہی میز پر ہم لوگوں نے گھر کے ایک رکن کی حیثیت سے کھانا کھایا۔ کاش یہ عمدہ فضا ہندوستان میں بھی ہوتی۔

سر جارج لیمبرٹ سابق گورنر سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ وہ والد کو دریافت کرتے تھے۔ ہمارے دار العلوم علیگڈھ سے انگلستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ جس دن میں مسٹر وارث امیر علی سے ملا تو سب سے زیادہ اس امر سے متاثر ہوا کہ انھوں نے میرے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کھجور تاج اور ہلال ہمارے کالج کا طراز نمایاں کر دیا تھا۔ اس دعوت میں سر فیروز خاں نون اور مسٹر ایس لال اور ڈاکٹر طامس کوئل سے بھی ملاقات ہوئی۔ انڈیا آفس آکر چند خواتین سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ جو ۱۶۰ ازی حیثیت سے جنگی خدمات کر رہی ہیں۔ ان میں ہندوستانی بھی ہیں اور انگریز بھی۔ ہندی خواتین اپنے قومی لباس یعنی ساڑیوں میں ہیں۔

دار العلوم کو بھی دیکھا۔ پارلیمنٹ کے ایک معزز مہمان نے ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ اور خاص طور سے عمارت دکھانے کی تکلیف گوارا کی۔ بہت عالیشان عمارت ہے۔ تمام عمارت میں گدے دار بینچیں بچھی ہوئی ہیں۔ وسط میں ایک بہت بڑی اور بھاری میز رکھی ہے جسپر کھڑے ہوکر مقررین تقریریں کرتے ہیں۔ اس

عمارت کی ایک بالائی منزل بھی تھی جس میں عوام کو جا کر تقریریں سُننے کی عام اجازت وآزادی ہے یہاں بہت آرام سے بیٹھنے کا انتظام ہے۔

دارالامراء بھی دیکھا۔ انتظام تقریباً ایک ہی سا ہے۔ ہاں سامان یہاں زیادہ پُرتکلف اور نظر فریب ہے، اور قیمتی بھی۔ ملک معظم و ملکہ معظمہ کے لئے سنہری کرسیاں سُرخ مخمل سے منڈھی ہوئی ہیں۔ شاہی چبوترے کی حدبندی آہنی کڑیوں سے کی گئی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ عمارت ۳۵ لاکھ پونڈ میں بنکر تیار ہوئی ہے۔ اور ہر وقت یونین جیک اس عمارت پر لہرایا کرتا ہے۔ اور شب کے وقت ایک روشن وچمکدار گھڑی ہمیشہ چمکتی رہتی ہے۔ یہ عمارت بیحد شاندار ہے اور جابجا بڑی بڑی تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ مجھکو شہنشاہ جہانگیر کی ایک تصویر دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی۔ سرٹامس رو جہانگیر کے حضور میں دست بستہ ایستادہ ہے۔ اور بھی تصویریں دلکش اور نظر فریب ہیں۔

گذشتہ اتوار کو ڈاکٹر بیلی سے ملاقات ہوئی۔ بہت دیر تک سر اقبال کے نظریہ پر بحث ہوتی رہی۔ دور حاضر کے اُردو شعرا کا بھی ذکر آیا۔ ان کے میز پر سامنے نور اللغات موجود تھا۔ ان کے مشورہ پر شاہی کتب خانہ بھی دیکھا جہاں لاکھوں مختلف زبانوں کی مخطوطات موجود ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بڑے سلیقہ سے جمع کئے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہندی مصنفین اپنی تصانیف کے نسخے یہاں بھیجنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ ڈاکٹر بیلی سے نیاز فتحپوری۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ خواجہ حسن نظامی۔ امیر احمد علوی۔ عبدالماجد دریابادی۔ علامہ نور الحسن نیّر۔ اور رشید احمد صدیقی کے متعلق بہت دیر تک گفت وشنید ہوتی رہی۔ رام بابو سکسینہ کا بھی ذکر آیا۔ اور مرزا محمد عسکری کا بھی۔ علیگڈھ کے طرز تعلیم اور خدمات ادب کا بھی ذکر خیر رہا۔ مجھکو ہمیشہ سے خواجہ کمال الدین مرحوم کے مشن سے دلچسپی ہے۔ گذشتہ جمعہ کو شاہجہان مسجد گیا تھا جو سرے (دوکنگ) میں ہے ——— تمہارا کمال

۲

ساحل انگلستان
۱۷ فروری ۱۹۴۰ء

کسی کے قلب مضطر سے بے اختیار نکلی ہوئی دعائیں و سلام شوق قبول کرو۔

میرا پہلا خط تم کو ملا ہوگا تعجب ہے کہ تمہاری خیر و عافیت ابھی تک نہیں معلوم ہوئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس بے چینی کا تم کو مطلق احساس نہیں ہے جو اسکو پہنچی ہے جو پردیس میں اپنے محبت کرنے والوں سے دُور حرمان نصیبی کے دن کاٹ رہا ہو۔ مشرق کی جانب سے اگر ہوا بھی چلتی ہے تو یقین مانو میری روح میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے ——— جنگ اب خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا۔ جنگ عظیم سے پیشتر پولینڈ جرمنی کا ایک جزو تھا لیکن وارسا کے صلحنامہ کے بعد اس کو خود مختار کر دیا گیا تھا۔ پولینڈ پر چہار جانب سے ایسا زبردست حملہ ہوا کہ غریب پولینڈ کو ہتھیار ڈالدینا پڑے۔ برطانوی وفرانسیسی افواج نے تیاری کا حکم دیدیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا۔ ۶ ستمبر کو ایک ہوائی بیڑے نے نہر کیل پر شدید بمباری کی اور وارسا پر جرمن بمباروں نے بمباری کی۔ برطانیہ میں ایک جنگی کیبٹی مقرر کی گئی اور مسٹر ونسٹن چرچل وزیر بحر مقرر کئے گئے ہیں اور جنگی کمیٹی میں ان کو جگہ دی گئی ہے اور ہندوستان بھی جنگ میں شامل ہو گیا ہے۔ ۷ ستمبر سے جنوبی افریقہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کم از کم تین سال تک جنگ جاری رہے گی۔

ہماری فوجیں فرانس پہنچ گئی ہیں۔ روس نے پولینڈ پر حملہ کر دیا، ۲۸ ستمبر کو وارسا نے ہتھیار ڈالدیئے۔ اکتوبر میں رائل اوک مشہور برطانوی جنگی جہاز کو ایک جرمنی کی آبدوز کشتی نے غرق کر دیا ہے۔ ترکی فرانس اور برطانیہ میں ایک مفاہمت ہو گئی ہے۔ نومبر میں میونخ ہال میں ہٹلر تقریر کر رہا تھا کہ اسوقت بم پھٹا مگر وہ بچ گیا۔ اسی ماہ میں برطانیہ کے مشرقی ساحل کے سمندری راستہ پر جرمنی نے سرنگیں بچھا دی ہیں اور ہوا کے ذریعہ سے بھی سرنگیں جرمنی نے بچھا دی ہیں۔ افسوس ہے کہ راولپنڈی جہاز بھی غرق کر دیا گیا۔ دسمبر میں جرمنی کا مشہور جنگی جہاز گراف سپی کو جنگ میں نقصان پہنچا ہے اور اس کے کپتان نے اپنے جنگی جہاز کو غرق کر دیا ۱۹۴۰ء کے شروع میں مسٹر بلور بلیشیا موجودہ سکرٹری جنگ نے استعفے دیدیا اور ان کی جگہ مسٹر اسٹینلی کا تقرر ہو گیا ہے۔

گذشتہ ماہ میں ہمارے غیر جانبدار جہازوں پر بحر شمالی میں جرمنی نے ہوائی حملہ کیا۔ اس ماہ میں بلگریڈ کے مقام پر بلقان کانفرنس ہوئی۔ جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ بلقان کے معاہدہ کو، سال تک اور برقرار رکھا جائے۔ اس کانفرنس میں یوگوسلاویا۔ رومانیا۔ یونان اور ٹرکی کے نمائندے شریک تھے اور سرلچ اوغلو کی صدارت میں یہ اجلاس ہوا تھا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر جنگ کی ابتدا جرمنی کی جانب سے ہوئی ہے۔ بسمارک، فریڈرک، ہٹلر وغیرہ نے اپنے اعزاز اور نام کو بلند و قائم کرنے کے لئے اکثر گذشتہ زمانہ میں جنگ کا جھنڈا بلند کیا ہے ۱۹۱۴ء میں بھی جرمنی نے جنگ کا آغاز کیا تھا۔ اور اس جنگ کی ابتدا بھی پولینڈ پر حملہ سے ہوئی تھی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے برطانوی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑکر دُنیا کو محو حیرت بنا دیا تھا اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ شجاعت و سپہ گری میں وہ دُنیا کے کسی دوسرے سپاہی سے پیچھے نہیں ہیں اپنی اور اپنی بہادری اور شجاعت سے دشمن کے چھکے چھڑا دئے تھے۔ اور دشمنوں نے بھی ان کی جوانمردی کی تعریف کی تھی۔ ایک قیدی جرمن افسر نے مجھ سے بیان کیا کہ "خدا جانتا ہے کہ ہندوستانی غضب کے بہادر و نڈر ہوتے ہیں۔ ہم لوگ ہندوستانیوں کا تذکرہ نہایت حقارت

سے کیا کرتے تھے، لیکن جنگ عظیم کے بعد ہم ان کو دوسری نگاہ سے دیکھنے کے لئے مجبور ہیں۔ وہ شیروں کی طرح جھپٹتے ہیں اور سنگینوں، خنجروں اور تلواروں سے میدان صاف کردیتے ہیں۔ موت کی ان کی نگاہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی"

انگلستان میں مارننگ پوسٹ کے فاضل ایڈیٹر سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بیان کیا کہ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ایک اشاعت میں حسب ذیل مقالہ لکھا تھا تمھاری دلچسپی کے لئے نقل کرتا ہوں۔

"گھمسان سے گھمسان لڑائیوں میں ہندوستانی افواج نے اپنی غیر متزلزل وفاداری اور بے نظیر مردانگی کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے۔ یورپ کے جاڑے کے طویل مہینوں میں ہندوستانیوں کو بڑی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا توپوں کے گولوں، مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیوں اور بموں کی موسلا دھار بارش میں ہندوستانی نڈر سپاہیوں نے جاں بکف ہوکر اپنی لازوال مستقل مزاجی، مردانگی اور بہادری کا ایک ایسا ثبوت دیا ہے کہ دنیا کی تاریخ کی نظیر قاصر نظر آتی ہے۔ تمام جنگی کارناموں میں ہندوستانی سپاہیوں نے ہندوستان کے نام کو بلند کیا اپنے کو قابل فخر سپاہی ثابت کیا ہے۔ ہندوستان کو اپنے سپوتوں کی شجاعت پر بجا طور پر ناز کرنا چاہئے"

پولینڈ کی آزادی سلب ہوگئی ہے یہاں کے نہتے باشندے نازیوں (ناتسیوں) بہیمانہ حملوں کا شکار ہورہے ہیں۔ بڑے بڑے شہر ویران ہوگئے ہیں۔ باشندے خانماں برباد ہوگئے ہیں۔ جنگلوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں یا جوان زبردستی فیکٹریوں میں مزدوروں و غلاموں کی طرح استعمال کئے جارہے ہیں ——

آجکل فرصت کم ہے بمشکل وقت نکال کر یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اب رخصت شب بخیر۔ ظفر عمر صاحب کی خدمت میں تسلیم نیاز۔ پروفیسر نامق خلیل کی خدمت میں خادمانہ آداب۔

تم سے ملاقات کی سچی آرزو

تمھارا خیر طلب (کمال)

—— ۳ ——

روبار انگلستان
۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء

سرمایۂ نشاط۔ دعائیں۔ عین اشتیاق میں تمھارا نامۂ محبت ملا، بدریافت خیریت خوشی ہوئی۔ یہ معلوم کرکے کہ پروفیسر نامق کمال عنقریب ہندوستان سے چلے جائینگے نہایت درجہ قلق ہوا۔ یہ کیوں کیا جواب دے سکتا ہوں؟ تم خود اسکو مجھ سے زیادہ جانتی ہو! تم نے کیا طے کیا ہے علیگڈھ چھوڑنے کا تم کو بھی تاسف ہے۔ میرے لئے یہی تسکین کا ذریعہ ہے۔ پروفیسر نامق کمال کو وزارت حربیہ ترکیہ جمہوریہ نے کیوں واپس بلالیا ہے۔ کیا ملکی انتظامات کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے! تفصیل سے لکھنا۔ اسکے یہ معنے ہوئے کہ اب علیگڈھ سے ترکی زبان کی تعلیم ختم ہوگئی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ تم سے ملاقات کب اور کن حالات میں ہوگی ——
بظاہر مجھکو تو مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے۔ اسوقت میرا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ بخدا اس دور و دراز اور خطرناک منزل میں بھی تمھاری محبت کے بھروسہ پر زندہ تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم ہندوستان میں کسی مدرسہ میں ملازمت قبول کرکے یہیں قیام کرلو۔ علیگڈھ میں ڈاکٹر رشید جہاں نے خود تم سے اس امر کی خواہش کی تھی لیکن تم نے پسند نہ کیا۔ میرے خیال میں لکھنؤ مسلم کالج کراسھتویٹ کالج الہ آباد کلکتہ مسلم کالج بمبئی مدرسہ طالبات پنجاب کے کرسچین کالج ایسے مقامات جہاں تم کو بہت آسانی سے عمدہ ملازمت مل سکتی ہے لیکن جو بات علیگڈھ میں تھی وہ کہاں مل سکتی ہے جو ادبی فضا یہاں مل سکتی ہے — ہندوستان میں تم کو کہیں نہ ملے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں تم تنہا کیسے رہوگی —— کل ڈنمارک کے شمالی ساحل پر جب ہمارا شاہی فضائی دستہ گشت کررہا تھا تو اسوقت ایک عجیب منظر دیکھا کہ ایک چھوٹی سی آبدوز کشتی نے ایک دس ہزار ٹن وزنی جرمنی جہاز کو جو ناروے کی جانب جارہا تھا اور چار ہزار جرمن سپاہ اور کثیر سامان جنگ سے لدا ہوا تھا تارپیڈو مار کر غرق کردیا۔ دوسرے دن اخبارات سے علم ہوا کہ اس جہاز کے تمام سپاہی ڈوب گئے اور ناروے کے ساحل پر جرمن لاشیں کائی کی طرح پھیل گئیں۔ لطف یہ ہے کہ جرمنوں نے اس ساحل پر سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ جس بہادر نے قادر اندازی سے تارپیڈو مارا ہے اسکے قبضہ میں آج وزارت بحری سے ڈی۔ ایس۔ او کا خطاب عطا کیا گیا ہے۔ جہاز اکیلا نہ تھا۔ طیاروں اور غارتگر جہازوں کا ایک بڑا بدرقہ اس کی حفاظت میں تھا۔ برطانوی آبدوز نے دو میل کے فاصلہ سے تارپیڈو مارا تھا ——۔

گذشتہ ماہ مجھکو شاہی ہسپتال میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔ جو جگہ مجھکو ملی اس جگہ ایک انگریز کرنل لیٹا ہوا تھا۔ جب اسکو معلوم ہوا کہ فلائٹ لفٹنٹ کمال زخمی ہوکر آیا ہے بڑی خوشی سے وہ جگہ چھوڑ دی اور باوجود سخت زخموں کے بھی بمشکل کھڑا ہوگیا۔ اور نہایت درجہ خوشی سے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور وہ ہسپتال کے ایک معمولی مریض کی حیثیت سے پیچھے کے کمرہ میں چلا گیا جو اس کمرے کو دیکھتے ہوئے نہایت تاریک اور گندہ بھی تھا۔ مجھکو اس امر نے بے حد

متاثر کیا۔ نرسوں نے اس درجہ دلسوزی سے میری تیمارداری کی ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ نرسوں و ڈاکٹروں کا وسیع اخلاق جو میں نے انگلستان میں دیکھا اس کا عشر عشیر بھی ہندوستان میں نظر نہیں آتا ——— اصل میں قصہ یہ ہوا کہ میں ساحل ہالینڈ پر گشت میں گیا ہوا تھا۔ جس وقت ساحل انگلستان قریب آگیا تو اتفاق سے دشمن کے طیارہ نے حملہ کیا، میں نے قلابازی کھائی اور ابھی سنبھلنے کا موقعہ نہ ملا تھا کہ میرے جہاز پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ اور جب مڑ کر دیکھا تو دشمن کو تعاقب کرتے ہوئے پایا، میں نے بھی ایک گولی ایسی ماری کہ دشمن کے جہاز کا ایک شانہ بیکار ہوگیا۔ میں نے دوبارہ برق رفتاری سے آسمان کی جانب پرواز کی اور پلٹ کر اس شدت سے دوسرے جہاز پر حملہ کیا کہ میرے جہاز کے پٹرول کی ٹنکی پھٹ گئی اور اب میرا جہاز تقریباً بیکار ہوگیا۔ لیکن میں نے تعاقب نہ چھوڑا گو اب پٹرول ختم ہو رہا تھا لیکن میں نے نہایت سُرعت سے دشمن کے ہوائی جہاز کو تباہ کردیا۔ اور تیز پرواز کر کے ساحل انگلستان پر پہونچگیا۔ یہ واقعہ رودبار انگلستان پر پیش آیا تھا۔ اب میرے پاس گولیاں ختم ہوچکی تھیں، ہوائی جہاز کے قالب میں شگاف پڑ گئے تھے، پنکھے بھی ٹوٹ چکے تھے، زندگی محال تھی، میرا ہوائی جہاز نیچے گرنا شروع ہوا، پرواز کے قابل جہاز نہ رہا تھا۔ اتفاقِ وقت دیکھئے کہ ساحل کے قریب ہی محافظتی دستہ موجود تھا ہوائی جہاز کی حالت کو دیکھ کر میری امداد کو پہنچ گئے۔ جیسے ہی میری امداد کو دستہ آگیا تو میں پیرشوٹ سے نیچے کود گیا، لیکن زخم بھی آگئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہاں جہاز اُترا۔ رات کی سیاہی میں جہاز نیچے گرتا گیا لیکن مجھکو اب ہوش نہیں ہے کہ کیا ہوا۔ جب آنکھ کھلی تو میں شاہی ہسپتال میں تھا سب سے زیادہ تعجب انگیز مسئلہ میری نظر میں یہ تھا کہ میں زندہ کیسے رہا؟۔ ابھی کمزوری باقی ہے، لیکن تم خوش ہو گی کہ وزارتِ فضائی نے مجھکو بھی ڈسٹنگوشڈ فلائنگ کراس دینے کا اعلان کیا ہے۔

میں خط کے ساتھ ایک تصویر بھیجتا ہوں۔ جس میں برطانوی ساحلوں کے قریب برطانوی جنگی جہاز اور ہوائی جہاز پہرہ دے رہے ہیں۔ ہوائی جہاز فضا میں تیر رہے ہیں۔ اور بحری جہاز ان کی محافظت میں سمندر میں گشت کر رہے ہیں۔ آئندہ تم کو اور تصویریں بھی بھیجوں گا۔

ہوائی جہازوں نے دور حاضرہ کی جنگ میں غیر معمولی حصہ لیا ہے بلکہ اکثر موقعوں پر تو انھوں نے جنگ کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ہوائی جہاز صرف برّی فوج کے لئے نہیں بلکہ بحری بیڑے کے لئے بھی مفید ثابت ہوئے ہیں۔

جرمنی نے لندن کے باشندوں پر خوف و دہشت طاری کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن شبانہ روز کی بمباری کے بعد بھی لندن کی حالت بقول ہز میجسٹی ملک معظم یہ ثابت ہو رہی ہے کہ وہ اتحاد و اتفاق اور عزم و استقلال ہی کے لئے تعمیر ہوا ہے۔ ممدوح نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ کسی شہر کے در و دیوار شہر نہیں ہوتے بلکہ جو وہاں رہتے ہیں ان سے شہریت قائم ہوتی ہے۔

لندن میں ۸۰ لاکھ مکانوں اور ان کے رہنے والوں نے جس غیر معمولی عزم و استقلال کا ثبوت دیا ہے دنیا اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ جسوقت بمباری شروع ہوئی ہے اور طیارہ شکن توپوں سے گولے چھوڑے جاتے ہیں تو کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ طیّاروں کی پرواز سے فضا میں ایک خاص قسم کی گونج پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک گرجا گھر میں پناہ گزیں پہلے سے خطرہ کی گھنٹی سنکر جمع ہوگئے تھے اور وہاں گا کر لوگ اور بات چیت کر کے وقت گذار دیتے ہیں کسی قسم کی مطلق گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

اچھا اب خط ختم کرتا ہوں۔ تمھارا خیر طلب

کمال

——— ۴ ———

رودبار انگلستان

مورخہ ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

سرمایۂ نشاط۔ بہت بہت دُعائیں۔ تمھارا محبت نامہ ابھی ایرمیل سے ملا حالات معلوم ہوئے۔ یہ دریافت کر کے کہ تم علیل ہوگئی تھیں طبیعت کو انتشار ہوا خدا کرے اب تم بالکل بخیر ہو۔ تم نے سنا ہوگا کہ جرمنی نے ڈنمارک پر قبضہ کرلیا۔ اور ناروے پر بھی حملہ شروع کردیا ناروک کھجورڈ میں زبردست بحری جنگ ہوئی جس میں دشمن کے سات رسد کے جہاز اور برطانیہ کے دو تباہ کن جہاز ناروک کے مقام پر غرق ہوگئے اور ہماری آبدوز کشتیوں نے جرمنی کے مستعد جنگی جہاز ایڈمرل شیر اور گشتی جہاز کارلس رہ کو تباہ و برباد کردیا۔ اس ماہ ہمارے ہوائی دستہ نے زبردست شبخون مارا اور ناروے کے ہوائی مستقروں پر بمباری کی۔ گذشتہ ماہ میں ہمارے فضائی دستہ نے جرمنی کے دارالسلطنت برلن پر ۴ بار کامیاب حملہ کیا فرانس اور برطانیہ نے فن لینڈ کو فوجی امداد دینے کا وعدہ کرلیا ہے لیکن ناروے اور سوئڈن کے رویہ کی بناء پر اس نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔ ماسکو میں روس اور فنلینڈ کے درمیان صلح ہوئی۔ جس کی رو سے فنلینڈ نے خاکنائے کریلین معہ ویبوری اور جزیرہ نما ہانگو کو روس کے سُپرد کردیا۔ ہانگو میں فوجی مستقر بھی تھا۔ لڑائی اب روز بروز خطرناک ہوتی جارہی ہے۔ لیکن انگلستان کی سخت آبادی پر اس جنگ کے اثرات کے متعلق مطلق انتشار محسوس نہیں ہوتا۔ ایک نوعمر نرس نے ہنس کر مجھ سے بیان کیا کہ مَوت کو بہادری سے قبول کرنا چاہئے۔ یہ جرأت دیکھکر میں ششدرہ گیا بچوں میں اس درجہ بہادری اور جرأت ہے کہ بیان سے باہر ہے وہ اب ہوائی جہاز کا مذاق اُڑایا کرتے ہیں۔ ہر اسکول میں پناہ کی جگہ موجود ہے۔ روزانہ مشق کے طور پر فرضی گھنٹی بجتے ہی وہ لوگ فوراً پناہ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں گایا بجایا کرتے ہیں۔ ڈنمارک کو زرعی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہاں

دودھ اور مکھن کثرت سے تیار رہتا ہے۔ اور کاشتکار بڑے جفاکش و محنتی ہوتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو ملکی پیداوار سے محروم کر دیا گیا ہے اور مویشی کثیر تعداد میں جرمنی جا رہے ہیں۔ قہوہ بالکل دستیاب نہیں ہوتا۔ جسقدر چربی تھی اسکو بھی جرمنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ ایندھن پر بھی پابندیاں شروع ہو گئی ہیں کوپن ہیگن کے چند سینما گھروں کے سوا باقی تمام تھیٹروں کو قانوناً بند کر دیا گیا ہے ملک کے طول و عرض میں جرمن سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ باہر سے جو کوئلہ آتا ہے وہ جرمنی کے سپاہی لے لیتے ہیں۔ باہر سے چارہ آنا بند ہو گیا ہے اس لئے مویشی بھوکوں مر رہے ہیں۔ اخبارات پر زبردست پہرہ لگا دیا گیا ہے۔ پولینڈ میں پھانسیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ہزارہا باشندوں کو بطور غلام جرمنی بھیجدیا گیا ہے۔ کم و بیش تیس ہزار سول آبادی کو پھانسی دی گئی اور ان کی لاشیں سڑکوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ بندرگاہ گڈھیا ناکی کل آبادی جو تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی، شہر بدر کر دی گئی۔ جرمن آبادی قائم ہو رہی ہے۔ ان کی تحریر و تقریر کی آزادیاں سلب ہو چکی ہیں۔ نوعمر بچوں اور نازک عورتوں سے بھی سخت محنت لی جا رہی ہے۔ چکوسلواکیہ کی طرح وہاں بھی اسکولوں کا نصاب بدل کر جرمن نصاب تعلیم جاری کیا جا رہا ہے۔ قومی لباس کے استعمال کی مخالفت کی گئی ہے قومی ترانہ یا قومی گانے ممنوع ہو گئے ہیں۔ اسکولوں کو توڑ کر فوجی بارگیں بنائی گئی ہیں سینما ہالوں کو بند کر دیا گیا ہے۔ جرمن فلم پراپگنڈہ کے سرکاری تھیٹروں میں دکھائے جا رہے ہیں۔ جو شخص اسکے خلاف ورزی کرتا ہے اس کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔

مزدوروں کی تمام انجمنوں کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا ہے۔ پریگ میں حکومت کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کو سنگین سزائیں دی گئی ہیں اور اس پاداش میں ایک ہزار طلباء کو جرمنی بھیجدیا گیا ہے۔ ہر جگہ جرمن عدالتیں قائم ہیں بوہیمیا میں قحط پھیل گیا ہے۔

معصوم و پاک نظروں سے تمکو بے اختیار دیکھنے کی آرزو

تمہارا پرستار کمال

جذباتِ نخشب

از جناب نخشب صاحب جارچوی

جو طور پر تھی وہی برق بزمِ یار میں ہے
مرا مذاقِ نظر میرے اختیار میں ہے

فسونِ ہوش و خرد بھی بیانِ یار میں ہے
کہ وعدہ جھوٹ ہے اور حدِ اعتبار میں ہے

وہ جانتے بھی نہیں کیا ہیں اضطراب و جنوں
اور اُن کا ہاتھ بھی رعنائیِ بہار میں ہے

رہِ وفا میں مجھے فکرِ ماسوا کیوں ہو
تم اختیار میں کیا ہو سب اختیار میں ہے

یقینِ جلوہ اگر ہو تو بزمِ ہوش کہاں
فریبِ جلوہ ہے جو چشمِ ہوشیار میں ہے

مجھے تو آپ کے وعدوں کا ہے یقیں لیکن!
فسردگی میں یہ کیوں بزمِ انتظار میں ہے

میں روتا اور بھلا قلبِ خوں شدہ کیلئے
تمہارا راز بھی اس چشمِ اشکبار میں ہے

زمانہ بھر جسے کہتا ہے بے وفا نخشب
وہی وہی مری آغوشِ انتظار میں ہے

قوّتِ حافظہ

از جناب محترم سیّد محبوبُ الرّضوی دیوبندی

ذیل کا پُر مغز مقالہ بڑے کام کی چیز ہے اور خصوصاً دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک نسخۂ کیمیا ہے۔ محترم مولانا سید محبوب الرضوی کا بہس شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انھوں نے بڑی کاوش کے ساتھ حافظہ کو بڑھانے اور قائم رکھنے کے مستند طریقے بتائے ہیں۔ ایڈیٹر

ہماری روزانہ کی ضروریاتِ زندگی میں قوتِ حافظہ ایک خاص اہمیّت رکھتی ہے۔ ہم شب و روز مختلف تصانیف اور بے شمار اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ خطبے اور تقریریں سنتے رہتے ہیں اور ہمیشہ یہ شوق دامنگیر رہتا ہے کہ دنیا بھر کے معلومات حاصل کرلیں۔ مگر اکثر ان کے یاد رکھنے میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ اور اکثر و بیشتر باوجود احساس ضرورت مطالعہ کردہ مضامین سنی ہوئی اور گزری ہوئی باتوں کا بہت کم حصہ یاد رہتا ہے۔ حافظہ قوی نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر باتیں محو ہو جاتی ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ بروقت مطالعہ ان قواعد و اصول کا لحاظ نہیں رکھا جاتا جن کو ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ اس کے بغیر علم پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا۔ چنانچہ ایک شخص علم و حکمت کی صدہا کتابیں پڑھتا اور ہزاروں باتیں سنتا ہے۔ مگر قوتِ حافظہ سے بے بہرہ ہے۔ تو اکثر و بیشتر یہ تمام سعی و کاوش اور محنت و کوشش اور صرف وقت سب رائیگاں اور لاحاصل ہو جاتے ہیں۔

ذیل میں قوتِ حافظہ کے اصولِ موضوعہ کے طور پر چند قواعد پیش کش ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد بہت کافی حد تک سہو و نسیان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرا موضوع بحث قوتِ حافظہ کے خالص فطری اور طبعی طریقے بیان کرتا ہے، طبی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کا حق میرے نزدیک صرف اطباءِ کرام کو حاصل ہے۔

حافظہ کی مثال — حافظہ کی مثال ایک بہترین اور باہوش خزانچی کی سی ہے جو محسوسات و مسموعات اور مدرکات کو بحفاظت تمام منضبط اور محفوظ رکھتا ہے اور بروقت ضرورت ان کو پیش کر دیتا ہے۔

قوتِ حافظہ کی قسمیں — قوتِ حافظہ کی دو قسمیں ہیں، تحفظ اور تذکّر۔ پڑھے، دیکھے، سنے یا خیال کئے ہوئے واقعات کے ضبط اور حفظ کرنے کو تحفظ کہتے ہیں۔ اور حسب مرضی اور ارادۃً ایسے واقعات محفوظہ کے یاد میں لانے کا نام تذکّر ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ واقعات کو جس قدر زیادہ توجہ سے دیکھا یا سُنا جائے گا اسی قدر زیادہ مدت تک ان کا نقش حافظہ میں قائم رہیگا۔ اس کے برخلاف عدم توجہی واقعات کو بہت جلد حافظہ سے معدوم کر دیتی ہے۔

قوتِ حافظہ کا مخزن دماغ ہے۔ حکماء کا خیال ہے کہ عام طور پر قوتِ حافظہ کا ارتقا پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور پچاس سال تک باقی رہتا ہے۔ لیکن تشریح جدید سے ثابت ہوتا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں دماغ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ہر دس سال میں تقریباً نصف چھٹانک تک وزن قدرتاً کم ہوتا جاتا ہے۔ دماغ کا اوسطِ وزن صحیح، تندرست اور جوان مردوں میں تقریباً ۴۹½ اونس اور عورتوں میں ۴۴ اونس تک ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا دماغ وزنی اور بڑا ہوتا ہے وہ عقلمند اور کم وزن اور چھوٹے سر والے بالعموم معمولی عقل کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں میں کم و بیش اس کے برخلاف بھی مشاہدہ میں آیا ہے۔ مگر قوتِ تذکّر قوت حافظہ کے تنزل و انحطاط کے باوجود صحیح اور درست رہتی ہے۔

مشاہدات میں نہ صرف قوتِ حافظہ کی میعاد میں اختلاف ہے بلکہ اسکی قوت میں بھی، یعنی اس کی قوت اشخاص مختلف میں مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جو دس بیس مرتبہ کی تکرار سے بھی مضمون یا تقریر یاد نہیں کر سکتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ایک یا دو دفعہ میں مضمون پڑھ کر یا تقریریں سنکر حرف بحرف یاد کر لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل باتیں قوتِ حافظہ میں نقص پیدا کر دیتی ہیں:-

(۱) سر میں چوٹ لگنا۔

(۲) مغز میں مرض پیدا ہو جانا۔

(۳) کثرتِ ضعف اور امراض میں مبتلا ہو جانے سے۔

(۴) شراب اور منشیات کا بکثرت استعمال کرنا۔

(۵) تعیش کی زندگی بسر کرنا۔

(۶) عدم توجہی کی عادت ڈال لینا۔

(۷) رنج و فکر اور غم و غصہ۔

(۸) عمر رسیدگی۔ (۹) دائمی نزلہ و زکام۔

نقصانات: بلا کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام ضروری یادداشتیں، مضامین، واقعات اور الفاظ بروقت اور حسب ضرورت یاد نہیں آتے اور گفتگو و تقریر غیر مدلل اور زور و قوت سے عاری ہو جاتی ہے اور دوسرے کو اپنے خیالات، نظریات، اور تصورات سے متاثر اور مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔

قوتِ حافظہ کے ارتقا کے ذرائع

قوتِ حافظہ کی ترقی اور پختگی کے لئے سعی و مشق کو بہت بڑا دخل حاصل ہے

چنانچہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ روحانی و جسمانی قویٰ معقول مشق اور مناسب ورزش سے ترقی پاتے ہیں اور بیکار رہنے یا اعتدال سے زیادہ محنت و ریاضت سے بگڑ جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص سنیاسی کے مانند اپنے ہاتھ کو ہلائے جلائے نہیں اور سیدھا کھڑا رہنے دے تو وہ سوکھ کر بے کار ہو جائے گا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت کی جانب سے خواہ کیسی ہی صحیح قوتیں اور سالم اعضاء انسان کو عطا کئے گئے ہوں اگر وہ ان کو کام میں نہ لائے اور یوں ہی چھوڑ دے تو وہ ایسے نکمے اور بیکار ہو جائیں گے اور شاید ایسے بگڑ جائیں کہ پھر کسی حکمت و علاج سے بھی پہلی صورت اور اصلی قوت پر نہ آسکیں گے! برخلاف اسکے اگر ہم افراط و تفریط کو چھوڑ کر روحانی و جسمانی قوتوں کی برمحل اور بروقت اعتدال کے ساتھ مشق کریں تو ان میں کافی حد تک کمال پیدا کیا جا سکتا ہے۔

کسی بات کو حافظہ میں محفوظ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو بخوبی دیکھ کر یا پڑھ کر سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جو چیز اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی یا دُھندلی نظر آتی ہے وہ پہچانی نہیں جاتی، اور جب پہچانی نہیں جاتی تو حافظہ میں محفوظ نہیں رہتی۔ پس ضروری ہے کہ یاد کردنی امور کو خوب سمجھ لیا جائے ورنہ حافظہ میں جم جانا اور یاد رہنا دشوار ہوگا، مثلاً ادب و انشا، اور غیر زبانیں سیکھنے والے کیلئے ضروری ہے کہ جس طرح علم تشریح کا طالب علم اس بات کا خواہاں رہتا ہے کہ جسم انسانی میں رگ و ریشہ، ہڈی اور اعصاب وغیرہ کس کس موزونیت اور ترتیب سے کس کس موقع پر واقع ہوئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس کے لئے لازمی ہے کہ اس امر کا متجسس رہے کہ اجزائے کلام کس کس قرینہ اور انداز سے عبارت میں آتے ہیں۔ اس عمل سے نہ صرف یہ کہ زبان پر قدرت حاصل ہوگی اور بروقت الفاظ خود بخود یاد آتے جائینگے بلکہ تفہیم کو بھی ترقی ہوگی۔ غرضیکہ توجہ اور نظر غائر حافظہ کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

مطالعہ کتب کے وقت ضروری ہے کہ مفید باتوں کا غیر مفید باتوں سے حافظہ میں علیحدہ انتخاب کر لیا جائے۔ اگر مفید باتوں کا کم مفید باتوں سے انتخاب نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام حافظہ ساری باتوں کو محفوظ نہیں رکھ سکے گا الا یہ کہ جن کے حافظہ بہت قوی ہوں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جن باتوں کو تمیز کرکے چھانٹ لیا جاتا ہے وہ حافظہ میں ضرور محفوظ رہتی ہیں۔ مگر ضروری اور غیر ضروری باتوں میں امتیاز کے لئے کم از کم متوسط درجہ کے علم کی ضرورت ہے۔

مطالعۂ کتاب میں یہ بھی ضروری ہے کہ خاص خاص مقامات پر جن کا یاد رکھنا ضروری اور مفید ہو نشان لگا دئے جائیں اور جب ایک باب ختم ہو جائے تو نشان زدہ مقامات کا ایک دو مرتبہ پھر مطالعہ کر لیا جائے اور اس عمل کو ساری کتاب میں استعمال کیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ کتاب کی روح حافظہ میں محفوظ ہو جائے گی اور با آسانی ساری کتاب کی تشریح کی جا سکے گی۔ اسکے بعد اگر ممکن ہو تو پڑھے ہوئے مضمون یا سُنی ہوئی تقریر کو دوسرے شخص کو سنا دیا جائے بار بار اس کا تذکرہ کرنا مضمون کو حافظہ میں راسخ کر دیتا ہے۔ اس طرح پر عمل کرنے میں علاوہ ازیں ایک دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ طاقت طلاقت اور قوت نطق بڑھ جائے گی اور بروقت و برمحل تبصرہ اور تائید و تردید کرنے کی قوت پیدا ہو جائیگی۔

یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ طلباء بار بار تکرار کرنے سے سبق یاد کر لیتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے صرف و نحو کے قواعد اور گردانیں اور خاص خاص الفاظ بار بار یاد کرنے سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اس میں تکرار کی قسم سب سے عمدہ ہے۔ اس طریقے سے واقعات اور مضمون کا نقش حافظہ میں بہت گہرا بیٹھ جاتا ہے۔ نیز اگر یہ سُنانا اور تکرار ابتداً اپنے سے چھوٹوں یا کم علموں کے سامنے ہو تو قوت بیان میں معتد بہ ترقی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ یونانی حکیم ہرطیس کا اسی طریقہ پر عمل تھا اور اس کا قول ہے کہ "اس عمل سے مجھے عظیم الشان علمی فوائد حاصل ہوئے"۔

ذہین و ذکی اشخاص سے مجالست اور گفت و شنید کرتے، باغات کی سیر و تفریح اور سرور و نشاط سے بھی قوت حافظہ ترقی پذیر ہوتی ہے

یہ خیال صحیح نہیں کہ معلومات میں جسقدر وسعت اور ترقی ہوتی ہے حافظہ کمزور ہوتا جاتا ہے، بلکہ حافظہ کو جدید معلومات کے یاد کرنے میں بتدریج ترقی ہوتی رہتی ہے، کیونکہ جن خیالات میں ہم پہلے سے مشغول ہیں انکا تسلسل خواہ وہ کسی درجہ کا ہو وہ ہمارے جدید علم و معلومات سے ایک طرح کی تقویت حاصل کرتا ہے۔ ہاں البتہ واقعات کے یاد رکھنے کے لئے سمجھ، شوق اور دلچسپی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ چیزیں حافظہ کی معاونت میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً کسی چیز کو صرف سمجھ لینے کے سبب سے ہم بڑھتے چلے جاتے ہیں اور وہ حافظہ میں بلا کوشش اور بغیر ارادے کے خود بخود جمتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ دلچسپ ناول یا افسانہ دیکھنے سے طبیعت ایسی لگ جاتی ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاتے ہیں اور بغیر ختم کئے نہیں چھوڑتے حالانکہ اس کو پڑھ کر یاد رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ تاہم وہ خود بخود بغیر قصد و ارادہ کے یاد ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اول تو افسانہ سمجھ میں خوب آتا ہے اور اس کے دلچسپ اور دلنشین ہونے سے حافظہ خواہ مخواہ اسکو قبول کر لیتا ہے،

ایک شعر اور — ؟

از ادیب لبیب حضرت مولانا ماہر القادری صاحب حیدر آبادی

فاضلِ جلیل حضرت مولانا ماہر القادری صاحب اُس مُقدس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے علوم دینیہ حاصل کرنے کے ساتھ اُردو ادب کی ٹھوس خدمت کی ہے اور اپنے نام کا ایک نہ مٹنے والا نقش عالم ہند کے جریدہ پر ثبت کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کی نظم ہو یا نثر۔ جہاں کہیں نظر آتی ہے ہر لب اُسے چومتا ہے اور ہر دل اُسے پیار کرتا ہے۔ زیر نظر افسانہ کا تخیل کتنا رنگین ہے۔ پھر شستہ زبان کے ساتھ پاکیزہ بیانی گویا سونے پر سہاگہ ہے امید کہ آپ اس افسانہ کو پڑھ کر بیحد محظوظ ہوں گے۔

ایڈیٹر

(※)

فرؔید ایک غریب مگر شریف خانوادے کا چشم و چراغ تھا، ماں باپ مر چکے تھے، تھوڑی سی زمینداری اُس کے حصّہ میں آئی تھی، جس کی دیکھ بھال فرؔید کے چچا کرتے تھے، فرید کے چچا کے یہاں لکڑیوں کی ٹال بھی تھی، فرید کے ذمّہ اس کی نگرانی تھی، فرید خوش خلق، متواضع اور ملنسار تھا، محلہ کے اکثر نوجوان اُس کے دوست تھے، ٹال پر بہت سے دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا، لکڑیوں کی ٹال، فرید کی ملنساری اور ہر دلعزیزی کے باعث چوپال اور بیٹھک بن گئی تھی، دِن نکلنے سے بہت رات گئے تک دوست احباب بیٹھتے اور حُقّے کی چلم تو کسی وقت ٹھنڈی ہی نہ ہوتی تھی، ایک آتا، دوسرا جاتا۔ دوستوں کا دِن بھر تانتا بندھا رہتا، فرید کے چچا کو بھتیجے کے دوستوں کی یہ دھما چوکڑی ناگوار تھی، مگر فرید کی دل دہی کا اُن کو بڑا خیال تھا۔ اُنھوں نے دوستوں کے آنے جانے پر کبھی روک ٹوک نہیں کی۔

فرید کے دوستوں میں ہر طبیعت اور مذاق کے نوجوان تھے، کبھی کبھا ٹال میں شعر شاعری بلکہ مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا، لیکن یہ مشاعرہ بے تکلفی کی بزم تھی، جہاں چند ہم مذاق اور کم سواد نوجوان اپنے اور دوسروں کے شعر پڑھکر دل بہلا لیتے تھے۔ برسات کی رُت تھی، بادل برس کر کُھل گیا تھا، بہت ہی مہین بوندیں پڑ رہی تھیں۔ فرید کے دوست جمع تھے، ایک دوست نے کہا کہ آؤ شاعری ہو جائے، بڑا اچھا موسم ہے، اس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، اس تجویز پر سب نے چلّا کر کہا، ضرور، ضرور! مُشاعرہ ہونا چاہئے، بھئی! شاکر کو بھی بعض وقت خوب سوجھتی ہے۔ شاکر کے نانا بھی بڑے ہی ہنسوڑ، خوش مزاج اور با مذاق تھے۔ اُنھی کی خُوبُو اس میں آئی ہے —

ایک دوست :۔ (دو تین دفعہ کھانس کر) بھئی! وہ حضرت داؔغ کی غزل ہے نا! جس کا مطلع ہے :۔

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے
قضا مر رہی تُو کہاں آتے آتے

خاکسار نے اُس پر طبع آزمائی کی ہے، ملاحظہ ہو :— (معاف فرمایئے مطلع یاد نہیں آرہا ہے —!)

پیامی کے پیروں میں چھالے پڑے ہیں
وہاں جاتے جاتے، یہاں آتے آتے

اس پر مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں :۔

اے سبحان اللہ! واہ دوست کیا فرمایا ہے؟ زبان کا چٹخارہ اور اُس پر مضمون آفرینی اور معاملہ بندی! تمھارا ہی حِصّہ ہے! ارے نہ ہوا میں کسی مُلک کا بادشاہ قسم خدا کی اس شعر پر جاگیر بخش دیتا — نوجوان شاعر نے مُسکرا کر سلام کیا اور غزل کے باقی شعروں کو سُنا کر، مجمع سے خوب داد حاصل کی۔

ایک دوسرے نوجوان نے کشتی نما ٹوپی سنبھالتے ہوئے کہا حضرت غالؔب کی زمین میں چند شعر عرض کئے ہیں :۔

اُن کی زلفیں اس طرح رُخ پر پریشاں ہوگئیں
میں یہ سمجھا میری بربادی کا عنواں ہوگئیں

دوستوں نے شور تحسین سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ایک من چلے نوجوان نے کہا :۔

"آج معلوم ہوا ہے کہ آپ کسی پر عاشق بھی ہیں۔"

اِس پر دوسرے دوست نے پھبتی کہی :۔

"ارے میاں یہ ظفر تو خاندانی عاشق ہے، شیریں کے جانباز عاشق فرہاؔد سے جا کر ملتا ہے اس کا نسب نامہ ..."

تیسرے صاحب گویا ہوئے :-

فرماتا ہوں — (مجمع سے قہقہہ بلند ہوا) لاحول ولاقوۃ! عرض کرتا ہوں :-

بے رنگ ہے جہانِ گلستاں ترے بغیر
مصروفِ نالہ ہے گُلِ خنداں ترے بغیر

مجمع سے شور اُٹھا :-

" غالب کے رنگ میں کہا ہے مطلع — واہ میاں شفیق جیتے رہو، ابھی عمر ہی کیا ہے بڑے ہو کر قصبہ کا نام روشن کرو گے --- بھئی اب تو تمھارا کلام شہر کی طوائفیں گانے لگی ہیں ---"

شفیق صاحب اس پر تن کر بیٹھ گئے، اور قدرے متوحش ہو کر بولے :-

— طوائفوں کو غزلیں میں نے تھوڑی دی تھیں کسی رسالہ یا اخبار سے نقل کر لی ہوں گی "

آخر میں ایک مزاحیہ شاعر نے غزل پڑھی اور اس شعر پر :-

صرف اک میں ہی نہ تھا پامالِ بیدادِ ستم
پڑ رہی تھیں غیر پر بھی جوتیاں کل رات کو

ہال کی عمارت قہقہوں سے گونج اُٹھی، جوانی اپنی جگہ، "قیامت خاموش" بھی ہے اور "محشر برپا" بھی۔ پھر جہاں چند بے فکرے نوجوان اکٹھے ہو جائیں وہاں کی خوش فعلیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا کیا پوچھنا، محفل اپنے پورے شباب پر تھی، قہقہوں کے غیر مرتب ساز چھڑے ہوئے تھے کہ اتنے میں "دھڑام دھڑام" کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ قہقہے یکایک تھم گئے، سب دوست حیرت کے ساتھ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ گلی کے نکڑ پر کسی نے آواز دی :-

"— ارے دوڑو، بچاؤ، قاضی جی کا مکان گر گیا"

فرید اور اس کے دوست تیزی کے ساتھ دوڑے، قاضی جی کا مکان قریب ہی تھا۔ ذرا سی دیر میں یہ لوگ وہاں پہنچ گئے، اُنھوں نے جا کر دیکھا کہ زنانہ حصہ کی دیوار شق ہو کر، دالان کا ایک حصہ ڈھے گیا ہے اور ملبہ کے نیچے دو تین آدمی دبے پڑے ہیں، فرید اور اس کے دوستوں نے ملبہ کو ہٹا کر دبے ہوئے آدمیوں کو نکالا، فرید نے سب سے زیادہ مستعدی اور ہمدردی کا ثبوت دیا، اُس نے ایک ٹوٹی ہوئی کڑی کو زور سے اُٹھا کر ایک نوجوان لڑکی کو نکالا، اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا، اور لڑکی کا ماتھا، فرید کے ہاتھ سے نکلے ہوئے خون میں تر بتر ہو گیا،

"— میری اماں کہاں ہیں —" لڑکی نے گھبرا کر کہا۔

"وہ یہیں ہیں، خیریت سے ہیں، گھبراؤ نہیں، کوئی جانی نقصان نہیں ہوا — فرید نے جواب دیا۔

دو تین عورتیں بیہوش تھیں، ایک ماما کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، اور ایک چھوکرے کے سر سے خون نکل رہا تھا، محلہ کے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے، قاضی جی کے گھر کے مرد بھی خبر پا کر مکان میں آ گئے۔ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا، عورتوں کو مسہریوں اور پلنگوں پر لٹا دیا گیا، گرد وغبار کو صاف کیا گیا، وہی نوجوان لڑکی جسے فرید نے نکالا تھا پلنگ پر لٹائی گئی، اُس کے بھائی نے آکر دیکھا کہ بہن کی پیشانی خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نے گھبرا کر کہا :-

"رشیدہ! تمھارے سر میں بہت چوٹ آئی ہے، ابھی تک خون نکل رہا ہے"

رشیدہ نے جواب دیا :-

— اکبر بھائی! میرے تو ذرا بھی چوٹ نہیں آئی مجھے جن صاحب نے نکالا تھا، ان کا ہاتھ زخمی ہو گیا، اور ان کے ہاتھ کا خون میرے ماتھے پر لگ گیا۔ میں تو خدا کے فضل سے بالکل اچھی ہوں — اور ہاں بھائی جان! مجھے جنھوں نے نکالا تھا وہ شاید مجمع میں ہی ہوں گے ان کا شکریہ تو ادا کر دیجئے۔ بڑی ہمدردی کی اُنھوں نے میرے ساتھ — ! میرے لئے اپنے ہاتھ کو زخمی کر لیا — !

اکبر باہر گیا، لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، اور ہر شخص اپنے خاص انداز میں ہمدردی کا اظہار اور اس حادثہ پر تنقید کر رہا تھا :—

— خدا کا شکر ہے جانی نقصان نہیں ہوا — قاضی جی مرحوم کی نیکیاں کام آئی ہیں آج کے دن — خدا کا بڑا کرم یہ ہوا کہ دالان کا شہتیر نہیں گرا، نہیں تو قیامت ہی ہو جاتی — قاضی جی کے لڑکے بڑے بے پروا ہیں مکان کی مرمت ہی نہیں کراتے — یہ مکان بہت ہی بے ٹھکا بنا ہے اتنا بڑا دالان اور کُل دو دروازے۔

— بارش بھی تو ایک ہفتہ سے ہو رہی ہے اللہ میاں بھی بعض وقت بڑے غصّہ میں آجاتے ہیں —

اکبر نے دیکھا کہ فرید کے زخمی ہاتھ پر ایک بوڑھا آدمی لوٹے سے پانی ڈال رہا ہے اور فرید جمے ہوئے خون کو آہستہ آہستہ مل رہا ہے۔

فرید صاحب! آپ کی مہربانی کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا! — اکبر نے کہا

——اکبر میاں یہ تو رسمی باتیں ہیں، میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ شکریہ ادا کر کے مجھے پشیمان بنا رہے ہیں —— فرید نے زخم دھوتے ہوئے کہا۔

——میں تانگہ منگائے دیتا ہوں، آپ اسی وقت شفاخانہ جا کر زخم کی مرہم پٹی کرا لیجئے، برسات کی چوٹ خطرناک ہوتی ہے۔ وہاں میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر بھی ہیں، میں ساتھ ہوں گا تو وہ خاص توجہ کے ساتھ علاج کریں گے —— اکبر ہمدردانہ انداز میں بولا۔

——جوان آدمی کہیں ایسی چوٹوں کی پروا کرتے ہیں، میں تو قیامت تک دواخانہ نہیں جاؤں گا، ڈاکٹر بھی دیکھ کر ہنسے گا کہ جوانی اور اتنا ڈھیلا، کرچی کی نوک چبھ جانے سے ذرا سا خون نکل گیا ہے، ایک دو دن میں خراش مندمل ہو جائیگی —— فرید نے جواب دیا اور تھوڑی دیر میں اور لوگوں کے ساتھ فرید بھی واپس چلا گیا۔

زندگی حادثات کا نام ہے، ہر انسان کو حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حادثات اور واقعات نہ ہوں تو زندگی بے روح اور غیر دلچسپ ہو کر رہ جائے یہ حادثات ہی جو زندگی میں جان ڈالتے ہیں، ایک طرز پر بسر ہونے والی زندگی اُس بےحس مشین کی طرح ہے جو ہمیشہ کسی ایک خاص کام کی تکمیل کے لئے چلتی رہتی ہے — عورت فطرتاً سرد مزاج اور حلیم الطبع واقع ہوئی ہے لیکن جب وہ کسی حادثہ سے متاثر ہوتی ہے تو اس کے جذبات و احساسات میں طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ مرد کے جذبات اپنا رُخ بدلتے رہتے ہیں مگر عورت استقلال کا پیکر ہے، اس کے جذبات اور محسوسات مرکزیت چاہتے ہیں، برے جذبات کی رو میں بہ کر بھی عورت آوارہ دماغ نہیں ہوتی اور وہ اس عالم میں بھی ایک مستقل سہارا ڈھونڈھتی ہے، رشیدہ کے دل میں اس حادثہ کے بعد سے ایک خلش پیدا ہو گئی تھی —— ایسی خلش جس کا کوئی نام نہیں جو پیدا ہوتی ہے تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس "خلش" کو عرف عام میں محبت کہہ سکتے ہیں۔ مگر رشیدہ محبت کے مفہوم و معنی سے قطعاً نا آشنا تھی۔ "ایک خلش" ، "ایک خواہش بے نام" اور ایک ایسی چبھن جس کے محرکات سے وہ خود بھی بے خبر تھی، اُس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ پہروں سوچتی تھی کہ فرید نے اُسے کس قدر ہمدردی کے ساتھ ملبہ کے نیچے سے نکالا تھا اور فرید کا ہاتھ زخمی ہو گیا، کئی دفعہ تو غور کرتے کرتے رشیدہ نے اپنا ماتھا چھوا، اس تصور کے ساتھ کہ وہ فرید کے ہاتھ سے نکلے ہوئے خون میں آلودہ ہے —— مگر خون کے قطرے دُھل چکے تھے، لیکن اُس دن کا حادثہ ایک مستقل خلش بن گیا تھا ——

رشیدہ نے اپنے بڑے بھائی سے پوچھ پوچھ کر فرید کے متعلق بہت کچھ معلوم کر لیا تھا، مکان بن جانے کے بعد رشیدہ کے یہاں میلاد شریف ہوا تو اس میں فرید کو خاص طور پر بُلایا گیا۔ فرید بہت خوش آواز تھا۔ لوگوں کے اصرار پر اس نے میلاد شریف میں کچھ نظمیں سُنائیں جن کو خاص طور پر پسند کیا گیا۔ رشیدہ نے فرید کو اُس حادثہ کے بعد دوسری مرتبہ دیکھا تھا، چلمن کی آڑ سے وہ فرید کے ہاتھوں کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی، اُنہی ہاتھوں نے تو اُسے حادثہ کے دن خلک سے اُٹھایا تھا اور اسی ہاتھ کے لہو نے تو اُس کے دامن دل پر کچھ ادھوری سی لکیریں کھینچ دی تھیں۔

فرید کو پان کھانے کا بہت شوق تھا، اندر سے پانوں کی تھالی آئی جس میں بہت سُبک گلوریاں تھیں، فرید نے ذرا سی دیر میں گلوریوں کا خون کر دیا، دوبارہ جو پان بن کر آئے تو وہ ان گلوریوں کی طرح نہ تھے۔ فرید نے اکبر سے کہا کہ بھئی! مجھے تو وہی پہلی جیسی گلوریاں بنوا کر لا دو۔ وہ گلوریاں تو بہت ہی خوب تھیں۔ اکبر نے اندر جا کر اپنی بہن رشیدہ سے کہا کہ فرید تمھارے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوریوں کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ تھوڑی سی گلوریاں اور بنا دو، رشیدہ کی خوشی کا کیا پوچھنا، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ اُدھر سے پیام بھیجا گیا ہے، یہی خوش فہمیاں اور غلط اندیشیاں تو محبت کو پیچ در پیچ بناتی ہیں اور سہارا بھی دیتی ہیں، محبت کے ہوائی قلعے آگے چل کر فولادی حصار بن جاتے ہیں۔ رشیدہ نے ذرا سی دیر میں بہت سی گلوریاں بنا کر چھوکرے کے ہاتھ باہر بھیج دیں۔ رشیدہ نے اب کی مرتبہ اور زیادہ اہتمام کے ساتھ گلوریاں بنائیں مگر شدتِ مسرت نے اُسے قدرے وارفتہ بنا دیا تھا۔ پانوں میں چونا زیادہ لگ گیا۔ فرید گلوری چباتے ہی سی سی کرنے لگا اور اُگالدان میں پان تھوکتے ہوئے بولا:-

——منہ کے ٹکڑے اُڑ گئے، یہ مذاق کیا ہے کسی نے یا انتقام لیا ہے ——

میلاد شریف ختم ہونے کے بعد سب لوگوں کے ساتھ فرید بھی اپنے گھر چلا گیا، گلوریوں میں زیادہ چونا لگنے کا واقعہ اور فرید کے تنقیدی فقرے رشیدہ کے کان تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے غصہ کی نگاہوں سے اپنی انگلیوں کو دیکھا کہ گلوریوں میں زیادہ چونا لگانے کی یہی مجرم ہیں وہ دل ہی دل میں پشیمان اور متاسف ہو رہی تھی۔ مگر یہ خیال اس کے تصورات کو سہارا دے رہا تھا کہ گلوریوں کے واقعہ نے کچھ تعلق خاطر تو پیدا کر دیا۔ بات گئی گزری ہوگئی، لیکن رشیدہ کی خلش کچھ اور زیادہ اُبھر چکی تھی۔ اور اس خلش میں اب وہ کچھ لذت اور کچھ درد محسوس کر رہی تھی وہ لذت و درد کی اس منزل میں تھی جہاں آدمی احساس و تاثر کے باوجود کسی مقصد اور منزل کا تعین نہیں کر سکتا، رشیدہ —— بھولی اور معصوم رشیدہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس "خلش پنہاں" کی آڑ سے کوئی "آغاز" جھانک رہا ہے اکبر سے وہ فرید کے متعلق دریافت کرتی رہتی تھی اور اکبر کو یہ چیز بہت ناگوار تھی

وہ رشیدہ کے سوالات کے بہت ہی ادھورے اور بعض وقت دل شکن جواب دیتا تھا

——— فرید صاحب کے یہاں لکڑی کی تجارت ہوتی ہے ———

رشیدہ نے ایک دن دریافت کیا۔

——— تجارت کیا ہوتی ہے سو دو سو روپیہ کی لکڑیوں کی ٹال رکھ لی ہے اُس نے ——— اکبر نے جواب دیا

——— فرید صاحب سے آپ کی بچپن سے دوستی ہوگی ———

رشیدہ نے پوچھا

——— دوستی کا ہے کی، چند دن ہم دونوں ایک مکتب میں پڑھے ہیں ——— اکبر ترش رو ہوکر بولا۔

——— تو اب آپ کا اُن کے ہاں آنا جانا نہیں ہے

رشیدہ نے پھر دریافت کیا۔

——— میں ایسے لفنگوں سے دوستی نہیں رکھتا، اور وہ شریف و معزز ہی کیوں نہ ہو، مجھے فرصت بھی تو نہیں ہے ——— اکبر جواب دیتے ہوئے چلا گیا۔

اکبر کے جوابات سے رشیدہ کو دُکھ ہوتا تھا، مگر اکبر بھی جذبہ غیرت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ کوئی شریف بھائی اس بات کو پسند نہیں کرسکتا کہ اُس کی بہن غیر مرد کا دلچسپی کے ساتھ ذکر کرے اور بھائی تشفی بخش باتیں کرکے اس لے کو اور بڑھائے، رشیدہ دل سے مجبور تھی، غیرت و محبت ایک دوسرے کا توڑ کر رہے تھے۔

محلہ میں ایک نیا پوسٹ مین بدل کر آیا جو انگریزی نہیں جانتا تھا۔ یہی پوسٹ مین ایک دن فرید کی ٹال پر آیا اور اس سے انگریزی خط پڑھوانے لگا۔ فرید نے تمام پتے پڑھ دیئے اور محلہ والوں کا پتہ پوسٹ مین کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ کون شخص کہاں رہتا ہے۔ ان ہی خطوط میں رشیدہ کے نام کا ایک پیکٹ تھا جس پر انگریزی میں پتہ لکھا ہوا تھا۔ پوسٹ مین نے خطوط کا پلندا فرید کے قریب کی میز پر رکھ دیا اور خود چلم بھرنے کے لئے چلا گیا، فرید شعر گنگنا رہا تھا۔ پنسل اس کے ہاتھ میں تھی۔ جوان آدمی کی اُنگلیاں اکثر بے چین رہتی ہیں۔ اس نے بالکل بے خبری اور محویت کے عالم میں، رشیدہ کے نام کے پیکٹ پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا:۔

جو میرے لئے منتظر جانب در تھی
اب تک وہی چشم نگراں ڈھونڈھ رہا ہوں

پوسٹ مین نے حقہ پیا، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور اس کے بعد وہ اپنا جھولا اور خطوط اُٹھا کر ڈاک بانٹنے کے لئے چلا گیا۔ اکبر کے یہاں کے بہت سے خطوط تھے، جن میں ایک لفافہ بیرنگ بھی تھا، پوسٹ مین نے ملازم کے ہاتھ ڈاک اندر زنانہ میں بھجوا دی اور بیرنگ چٹھی کے محصول کے انتظار میں کھڑا رہا۔ رشیدہ نے پیکٹ دیکھا اور اس کی نظر پنسل سے لکھے ہوئے شعر پر پڑی۔ رشیدہ نے اکبر کو شعر پڑھ کر سُنایا۔

——— شعر اچھا ہے، لیکن کیا یہ شعر پیکٹ پر چھپا ہوا ہے۔ ——— اکبر نے پوچھا۔

——— جی نہیں! کسی نے پنسل سے پیکٹ پر لکھ دیا ہے

——— رشیدہ نے جواب دیا۔

اکبر بیرنگ خط کا محصول اور پیکٹ لئے ہوئے باہر آیا۔

——— اس پیکٹ پر شعر کس نے لکھا ہے ——— اکبر نے پوسٹ مین سے دریافت کیا۔

——— شعر ——— کیسا شعر ——— جی ——— !

پوسٹ مین نے متحیر ہوکر جواب دیا۔

——— یہ دیکھو ——— اس پیکٹ پر پنسل سے شعر لکھا ہوا ہے عینک لگا کر بھی تم کو دکھائی نہیں دیتا ——— اکبر عتاب آمیز انداز میں بولا۔

پوسٹ مین نے پیکٹ پر لکھے ہوئے شعر کو پڑھا، اور ڈاڑھی کھجلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس نے اپنے خاص انداز میں عینک کو ناک کی نوک پر رکھ لیا، اور کان میں لگے ہوئے قلم کو چھوتے ہوئے بولا:۔

——— یہ جو کالی مسجد کے پاس لکڑی کی ٹال ہے، وہاں میں نے حقہ میں دو چار کش لگائے تھے اور اپنے خطوط میز پر رکھ دیئے تھے، ایک نوجوان جن کا لانبا قد اور شربتی آنکھیں ہیں ٹال پر بیٹھے ہوئے تھے، اُن کے ہاتھ میں پنسل تھی، وہ شعر گنگنا رہے تھے، اُنھوں نے ممکن ہے پیکٹ پر شعر لکھ دیا ہو ———

فرید کے متعلق رشیدہ کے سوالات نے اکبر کو پہلے ہی سے بدگمان کر دیا تھا، اب اس کو یقین ہوگیا کہ فرید کو اس کی بہن سے دلچسپی ہے اور یہ شعر اس نے قصداً لکھ کر بھیجا ہے اُس نے دُوَنّی پوسٹ مین کی طرف پھینکتے ہوئے کہا:۔

——— تم پوسٹ مینی کرتے ہو یا قُرمی! ——— ایں ——— ! پرائے خطوں پر دوسروں سے عبارتیں لکھواتے ہو ——— خیر! میں عنقریب تمھارا مزاج بحال کرا دوں گا۔

بیچارہ پوسٹ مین دونی اُٹھا کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ کیونکہ اکبر کے تیور بگڑے ہوئے تھے اور غصہ میں بھرا ہوا آدمی دلایل اور تاویلات سے اُلٹا چڑتا ہے اکبر تیزی کے ساتھ گھر میں آیا، اُس نے پیکٹ کے پُرزے پُرزے کر دئے، اور ماما پر برس پڑا:۔

—— دیکھو! تم لکڑیاں سعید خاں (فریدؔ کے چچا کا نام) کی ٹال سے کبھی خرید کر نہ لانا، نہیں تو کان پکڑ کر مکان سے باہر نکال دوں گا۔

رشیدہ نے اس پر کہا:۔

—— بھائی جان! کیوں خیر تو ہے، آپ بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ سعید خاں کی ٹال سے لکڑی مول لینے میں کیا ہرج ہے۔ یہ ٹال سب سے قریب ہے، لکڑی کی ڈھلوائی برائے نام دینا پڑتی ہے اور مال بھی اچھا ملتا ہے ——

اکبر بہن کا جواب سن کر غصہ سے کانپنے لگا، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور یہی دلچسپی فرید کی طرف سے مدافعت کر رہی ہے، وہ جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولا:۔

—— رشیدہ! تم اس معاملہ میں دخل نہ دو —— دیکھو! میں تم سے پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں، یہ فریدؔ بڑے حرفوں کا بنا ہوا ہے، اس کے اطوار اچھے نہیں ہیں، محلہ کے آوارہ اور لفنگے لونڈوں کا وہ چودھری ہے، اُسی بدمعاش کے بچے نے تمہارے پیکٹ پر شعر لکھا تھا —— میں اس کو شرارت کا مزہ چکھا کر رہوں گا، غیرت دُنیا سے ابھی ناپید نہیں ہوئی —!

اکبر بہن کی طرف عتاب آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر چلا گیا، رشیدہ کے دل کی خلش جو کچھ یوں ہی سی اُبھری تھی، اکبر کے اس کہنے سے کہ فریدؔ نے پیکٹ پر شعر لکھ کر بھیجا تھا اور زیادہ نمایاں ہو گئی، وہ اس شعر کو جو بغیر کسی قصد و ارادہ کے لکھا گیا تھا اپنے نام "پیام" سمجھ رہی تھی، اس کے جذبات و تصورات کا آب خاموش ہلکورے لینے لگا۔ آج کے واقعہ سے وہ خوش تھی، بہت زیادہ خوش —!

محبت ہمیشہ کمزور بلکہ بعض وقت خیالی سہارے ڈھونڈتی ہے —!

رشیدہ کو یقین تھا کہ فریدؔ کو بھی اس کے ساتھ دلچسپی ہے۔ وہ کئی دن تک غور کرتی رہی کہ فریدؔ کے شعر کا جواب کس عنوان سے دیا جائے — غیرت روکتی تھی کہ غیر مرد کے پاس زبانی پیام بھیجنا یا خط لکھنا مناسب نہیں، محبت کا تقاضہ تھا کہ قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہیئے، عقل اور محبت، دماغ اور دل میں کئی روز تک جنگ ہوتی رہی نتیجہ؟ وہی جو ہوا کرتا ہے، یعنی عقل و دماغ کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، اس نے خط لکھا:۔

—— آپ کا لکھا ہوا شعر، دل پر نقش ہو گیا ہے، میرے دل و دماغ اُس شعر کے لُطف میں ڈوبے ہوئے ہیں، کیا یہ شعر آپ ہی کا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پوری نظم مجھے بھیج دیجئے میں مشکور ہوں گی، آپ کے ہاتھ کا زخم اچھا ہو گیا ہوگا، آپ کتنے ہمدرد اور مہربان ہیں

برسات کا حادثہ —— آپ بھی شاید نہ بھولے ہونگے!

رشیدہ نے ماما کو خط دیا اور تاکید کی کہ خط فریدؔ کے ہاتھ میں جا کر دینا، فرید کو ماما نے جا کر خط دیا۔

اور اُس نے خط کی پُشت پر ہی جواب لکھ دیا:۔

—— میں نے کوئی شعر آپ کو لکھ کر نہیں بھیجا یا تو آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا کسی حادثہ کے لئے زمین تیار کی جا رہی ہے مگر:۔

بروایں دام بر مُرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

آج کے بعد مجھے کبھی خط نہ لکھیئے، میں جواب نہیں دوں گا شریف عورتیں، غیر مردوں کو اس طرح مخاطب نہیں کیا کرتیں —— افسوس! اللہ تعالیٰ آپ کو صراط مستقیم سے دور نہ ہونے دے ——

رشیدہ ماما کے ہاتھ خط بھیجنے کے بعد کیا کیا خیالی قلعے تیار کر رہی تھی، اس کو یقین تھا کہ فریدؔ کی طرف سے شوق سے بھرا ہوا جواب آئے گا اور نہ جانے اس میں کیا کیا لکھا ہوگا۔ وہ جواب کے انتظار میں ٹہلنے لگی، انتظار وقت کی رفتار کو اور زیادہ سست کر دیتا ہے۔ اس کی نگاہ دروازے پر جمی ہوئی تھی، تھوڑی دیر بعد ماما آئی اور خط رشیدہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ رشیدہ نے شوق و محبت کے ہاتھوں سے خط کھولا، خط پڑھتے میں اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا اس کی پلکیں بے اختیار غمناک ہو گئیں۔ وہ پھولوں کا انتظار کر رہی تھی اور جواب میں پتھر ملے، آب حیات کی جگہ اس کے ہونٹوں سے زہر کا پیالہ لگا دیا گیا۔ کنواری لڑکی کا دل یوں بھی نازک اور حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر خوب روئی۔ آنسو نکل جانے کے بعد ذرا ٹھنڈک پڑ گئی اور اس نے پلنگ سے اُٹھ کر فریدؔ کے خط کو اپنی صندوقچی میں بند کر دیا۔

فریدؔ کے تلخ اور انتہائی دل شکن جواب سے اُس کو بد دل ہو جانا چاہیئے تھا مگر دل کی پھانس ایسی باتوں سے اور زیادہ چبھتی ہے، اور محبت کی بیل ہمیشہ ناکامیوں، محرومیوں اور تلخیوں کے سہارے ہی نشو و نما پاتی ہے۔ ناکامیوں سے محبت میں جان پڑتی ہے۔ محبت کا پودا پامال ہو کر اور زیادہ پھولتا پھلتا ہے جس محبت میں ناکامیاں اور تلخیاں نہ ہوں تو وہ محبت نہیں قمار بازی ہے کہ اتفاق سے داؤں نکل آیا اور جواری کے پو بارے ہو گئے۔ محبت کو جتنا ٹھکرایا جاتا ہے اتنی ہی وہ مُحکم و اُستوار ہوتی ہے۔ فریدؔ کے تلخ جواب نے آگ کو اور بھڑکا دیا۔ تریا ہٹ مشہور ہے تو عورت کو جب ٹھکرایا جاتا ہے تو اس کی ضدی طبیعت بد دلی پیدا نہیں ہونے دیتی بلکہ وہ اس کو اُکساتی ہے کہ جو کام شروع کیا ہے اُسے پورا ہونا چاہیئے، رشیدہ کے تصورات پر اب فرید کا خیال مستولی ہو چکا تھا، فریدؔ کے بغیر وہ اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی محسوس کرتی تھی۔

اکبر کی بدگمان طبیعت انتقام پر آمادہ تھی، بہت سوچ بچار کے بعد

اس نے فیصلہ کیا کہ پتھر کا جواب پتھر سے ہی دینا چاہئے، اس نے بے گناہ اور شریف فرید کا دل دُکھانے کے لئے لوگوں میں یہ بات مشہور کرنی شروع کی کہ فرید کی بیوہ بہن اور فرید کے دوست ہاشم کے آپس میں تعلقات ہیں اور وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں فرید کے کان میں بھی یہ بھنک پڑی، ابھی بات واضح نہیں ہوئی تھی۔ اکبر نے ایک گمنام خط فرید کے نام بھجوایا جس میں تمام فرضی واقعات درج تھے، خط پڑھکر فرید تلملا گیا، اس کی رگ غیرت پر کاری ضرب لگی تھی، دماغ مختل تھا اور حواس پریشان! ہاشم اس کا بہت بے تکلف دوست تھا، فرید کی بیوہ بہن پردے کی آڑ سے بات چیت بھی کر لیا کرتی تھی، اُسی ہاشم سے جس کے متعلق اکبر نے غلط باتیں مشہور کی تھیں اور تہمتیں تراشی تھیں! فرید کے ذہن میں بہت سے منصوبے آ رہے تھے۔ وہ ہاشم اور اپنی بہن دونوں کو قابل گردن زدنی سمجھتا تھا۔ بہن کی محبت اب نفرت سے بدل چکی تھی، اس کا دماغ اس تصور سے غیر متوازن ہوا جا رہا تھا کہ قصبہ کے لوگوں میں اس کی بہن کی بدچلنی کے چرچے ہو رہے ہیں۔

—— مجھے یہاں سے کہیں چلا جانا چاہئے —— فرید زور زور سے انگلیاں چٹخلاتے ہوئے بولا، اور تال ہی سے اُٹھ کر بڑے بازار میں آ گیا اور فیروز آباد جانے والی لاری میں بیٹھ گیا۔ فیروز آباد اسٹیشن وہاں سے ستر میل کے فاصلہ پر تھا چار گھنٹہ میں لاری وہاں پہنچ گئی، موٹر لاری کے مسافر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، کوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ کوئی آہستہ آہستہ گا رہا تھا، مگر فرید ایک گہرے خیال میں غرق تھا۔ اس کی محویت نے اس جلوت کو خلوت بنا دیا تھا، اس کے چہرے پر حزن و ملال، غم غصہ اور بدحواسی کے آثار نمایاں تھے

—— کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے —— فرید کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے دریافت کیا۔

—— میں بالکل اچھا ہوں —— فرید نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

—— مگر آپ کا چہرہ تو کچھ اور ہی بتاتا ہے —— مسافر نے کہا۔

—— آپ وکیلوں کی طرح جرح نہ کیجئے، آپ کو میرے حالات سے کیا سروکار —— فرید نے ترشروئی کے ساتھ جواب دیا اور مسافر بھی قدرے جھینپ کر خاموش ہو گیا، فرید کے جواب کو مسافر نے یقیناً کج خلقی پر محمول کیا ہوگا مگر فرید اپنے دل کی بات اس سے کیوں کہتا اس کا غم کسی طرح ہلکا نہیں ہو سکتا تھا! اس نے اسی لئے تو وطن کو چھوڑا تھا کہ اس کے کان تک بہن کی بدچلنی کے افسانے نہ آئیں، جو بات وہ سُننا گوارا نہ کرتا تھا اور جس کے لئے اُس نے جلاوطنی اور دیس نکالا قبول کیا تھا، اُسے وہ دوسرے سے کہہ ہی نہیں سکتا تھا، اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اُسے کیا کرنا اور کہاں جانا چاہئے؟ سوچتے سوچتے وہ مسکرایا اس انداز کے ساتھ گویا کہ کوئی مفید بات اس کے ذہن میں آ گئی۔ کلکتہ جانے والی ٹرین آئی اور وہ اُس میں ٹکٹ خریدے بغیر بیٹھ گیا، دوسرے جنکشن پر ٹکٹ چیکر ڈبہ میں آیا، چند مُسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے کے بعد اس نے فرید کی طرف ٹکٹ دکھانے کے لئے اشارہ کیا، فرید خاموشی کے ساتھ ٹرین کے باہر دیکھنے لگا۔

—— ٹکٹ دِکھلایئے ٹکٹ —— ٹکٹ چیکر نے فرید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

—— میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے —— فرید نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

—— تو پھر پانچ روپے آٹھ آنے دیجئے —— ٹکٹ چیکر جیب سے رسید نکالتے ہوئے بولا۔

—— میں ایک پیسہ بھی تم کو نہیں دوں گا، میں چاہوں تو اتنے روپے تم کو دے سکتا ہوں، مگر نہیں میں ایسا نہیں کروں گا، میں قانون شکنی کرنا چاہتا ہوں —— فرید نے یہ کہتے ہوئے جیب سے روپیوں کی پرس (PURSE) نکالی اور ٹکٹ چیکر کی آنکھوں کے سامنے ٹرین سے باہر پھینک دی، جنکشن آنے پر فرید کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اور قانون شکنی کرنے کے جُرم میں اس کا چالان ہوا، فرید عدالت میں پیش کیا گیا، عدالت کے سوالات کا جواب اس نے عجیب انداز میں دیا:۔

—— میں نے جرم نہیں کیا —— لیکن میں خود غلط کہہ رہا ہوں ہاں! ہاں! میں نے ارتکاب جرم کیا ہے، میں نے قانون شکنی کی ہے، دنیا کے قانون کا میری نظر میں کوئی احترام نہیں۔ مجھے شوق سے جیل خانہ بھیج دو —— آہ! جیل خانہ، سکون کی جگہ، اطمینان کا مقام —— یہ دنیا جہنم میں جھونک دینے کے قابل ہے، یہاں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ——

فرید کی بے ربط باتوں اور مجنونانہ انداز کو دیکھ کر مجسٹریٹ کو شبہ ہوا کہ ملزم کا دماغ خراب ہے، چنانچہ ڈاکٹر کے طبی مشورے کے بعد اسے پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ —— جو شخص اپنی خوشی سے جیل خانے جانے کے لئے تیار ہو اُسے پاگل اور مجنوں ہونا ہی چاہئے —— ہر جذبہ کی شدت اپنے اندر جنون کے رجحانات رکھتی ہے —— !

پاگل خانے میں فرید کو عجیب عجیب قسم کے لوگوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا دار المجانین میں ہر قسم کے پاگل تھے، عالم پاگل، فلسفی پاگل، قمار باز پاگل، تاجر پاگل

اور عشاق پاگل ——— ! دنیا میں پاگلوں کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں، اُتنی ہی قسموں کے پاگل یہاں موجود تھے۔ پاگل خانہ کو دنیا کا برزخ سمجھنا چاہئے۔ ان پاگلوں کی باتیں کتنی دلچسپ تھیں:۔

عالم پاگل:۔

——— علامہ تفتازانی کے اجتہاد سے میں متفق نہیں ہوں، میں تو اس مسئلہ میں خطیب بغدادی کا ہم نوا ہوں، اور ہاں، تقلید، کا مسئلہ بالکل وجدانی ہے، ابن تیمیہ نے اس موضوع پر خوب بحث کی ہے، مگر میں ——— کیا ہوں، وہی، جو بہ یک وقت انسان بھی ہے اور حیوان بھی ——— ارے امیری تسبیح تو لاؤ، اُس کو میں چوموں گا، اس کو میں نے شہد میں ڈبویا تھا ——— لنگور اور بندر کے تعلقات کے بارے میں کیا رائے ہے مفتیان شہر کی ——— !

فلسفی پاگل:۔

——— علت اور معلول میں ہر حالت میں ربط ہوتا ہے، جوہر بغیر عرض کے قائم ہی نہیں رہ سکتا، سالمات کا تجزیہ محال ہے اور عدم ——— عدم کا کہیں وجود ہی نہیں، وجود نامعلوم کو لوگ غلطی سے عدم کہتے ہیں۔ ظلمت کیا ہے؟ نُور کی سلبی صفت ——— ! میں تو ان باتوں کو اُس وقت سے جانتا ہوں، جبکہ حلوائی جلیبیاں بنانا بھی نہیں جانتے تھے ——— ڈیکارٹ کے فلسفیانہ خیالات کا میں نے رد لکھا ہے ——— اور ابن رشد کا تو میں ازلی دشمن ہوں ——— ! دیکھو! درخت کی ڈالیاں ہل رہی ہیں، کس لئے؟ کائنات کے خوابیدہ جذبات کو پنکھا کرنے کے لئے ——— ارے میں! زندہ کیوں ہوں ——— صرف مچھروں کے فنا کرنے کے واسطے، مچھروں کی فنا میری بقا ہے ——— !

قمار باز پاگل:۔

چھکا پو ——— ! اچھا پانسو روپے لگا دیئے ——— دیکھو! تم نے کعبتین کے دانہ کو ٹھیک نہیں پھینکا ——— قسم خدا کی قاز کی شب دیگ تمہارے سر پر اُلٹ دوں گا، میں رکشا والا ہوں !

تاجر :۔

——— روئی کا بھاؤ گر گیا، ارے! د الی برادرس کو ابھی ٹیلیفون کر دو کہ شکر کے بوروں کا خریدنا موقوف کر دیں ——— اور ہاں! تجوری کی کنجی تو میرے پاس ہے، اور بنک کا سود تو اب تک نہیں آیا ——— پوریاں پانی میں تل کر لانا میں بھوکا ہوں ——— واہ! حلوائی کی دوکان اور دادا جی کی فاتحہ ——— میرے مُنہ میں کاغذ بھر دو، پرامیسری نوٹوں کے کاغذ ——— مگر نوٹوں کے نمبر پھٹے ہوئے نہ ہوں ———

عاشق پاگل:۔

——— دُنیا پس دیوانہ و دیوانہ بہ کارے ———

تم نے مجھے دھوکا دیا، محبت فریب ہی کا تو نام ہے ! یاد ہیں وہ چاندنی راتیں جب تم اپنے گداز زانو پر میرا سر رکھ کر اپنی حنائی اُنگلیوں سے میرے بالوں کے پیچ درست کرتی تھیں ——— ہائے! تمہارے رخساروں کی شہابی رنگت ——— وقت آگیا ہے کہ میں انگاروں کو کھایا کروں، اور پانی کی جگہ کھولتا ہوا پٹرول پیوں، محبت قربانی چاہتی ہے ———

فرید کو پاگل خانہ سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک پاگل جس کا دماغ کچھ ٹھیک ہو چلا تھا، کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہے ———

——— کیا لکھ رہے ہو شانتا رام ——— فرید نے دریافت کیا۔

——— خط لکھ رہا ہوں ——— پاگل نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

——— کس کے نام؟ ——— فرید نے پوچھا۔

——— خود اپنے نام ——— پاگل پنسل گھماتے ہوئے بولا۔

——— خط کا مضمون کیا ہے ——— فرید نے کہا۔

——— واہ! خوب کہی، خط کے مضمون کی مجھے کیا خبر، جب میں اس خط کو ڈاک میں ڈال دوں گا، اور یہ میرے پاس ڈاک خانہ سے باقاعدہ طور پر آئے گا، اُس وقت میں بتا سکوں گا کہ خط میں کیا لکھا ہے ———

——— پاگل نے جواب دیا۔ اور فرید نے اس پر قہقہہ لگایا ———

فرید کی یکایک گمشدگی نے اس کے دوستوں اور گھر والوں کو پریشان کر دیا۔ فرید کی بہت کچھ تلاش کی گئی، مگر پتہ نہ چلا، فرید کی بیوہ بہن کے دل پر تو قیامت بیت گئی، مگر لوگوں کی پریشانی سے واقعات اور حادثات بدلا نہیں کرتے، آنسوؤں کا سیلاب، انقلابات کے طوفان کو روک نہیں سکتا۔ رشیدہ کو بھی فرید کے قصبہ سے چلے جانے کی اطلاع ملی اور اس کے نازک دل پر چوٹ لگی، وہ اپنے دل کی بات کسی سے کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ یہ غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا، اس کے صبیح رخساروں میں زردی حل ہوئی جا رہی تھی اور وہ پھول جو اپنے شباب نمو پر تھا، کملاہٹ کی زد میں آچکا تھا۔

رشیدہ کا سن سولہ سال کے لگ بھگ تھا، کتابی چہرہ، ستواں ناک، سُرخ و سفید رنگ، ہر لباس اس کے بدن پر پھبتا تھا مگر سفید ساری میں تو وہ قیامت مجسم معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مُسکراہٹ پر دیکھنے والوں کو دھوکا ہوتا تھا کہ وہ کوئی گیت گنگنا رہی ہے ——— بچپن میں زینہ سے گر جانے کے سبب اُس کی پیشانی پر زخم کا نشان رہ گیا تھا، یہ نشان ہلال نما تھا ——— بدر اور ہلال

کا اجتماع ـــــ یا ـــــ ہلال در آغوش بدر ـــــ وہ شرمیلی تھی، اس نے
کبھی چُست صدری اور تنگ ویسٹ کوٹ نہیں پہنی، بڑھتے ہوئے شباب کا اظہار
اُسے ناپسند تھا ـــــ !

اکبر بہن کو غمزدہ دیکھ کر بہت پریشان تھا، اس نے محسوس کیا کہ رشیدہ
کی حالت روز بروز گرتی چلی جارہی ہے، کاش اکبر کو معلوم ہوتا کہ اُسی کی سازش نے
رشیدہ کی مسرتوں کو چھین لیا، اور جس گڑھے میں اس نے غریب فرید کو گرایا ہے
وہی گڑھا رشیدہ کی تمناؤں اور مسرتوں کا مدفن بن رہا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:۔

ـــــ غم بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے۔ ـــــ

مگر کسی ہمدرد سے دُکھ درد بیان کر دیا جائے تو تھوڑی دیر کے لئے طبیعت ہلکی ضرور
ہوجاتی ہے، لیکن رشیدہ کے دکھ درد کا سُننے والا بھی کوئی نہ تھا ـــــ !

اکبر بہن کی ہر نقل وحرکت پر گہری نظر رکھتا تھا، ایک دن اس نے دروازے
کے آئینوں سے دیکھا کہ رشیدہ نے اپنی صندوقچی سے ایک پرچہ نکالا اور اسے پڑھ کر
رونے لگی اور روتے روتے سوگئی۔ اکبر چپکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں پہنچا،
رشیدہ کے رخسار بھیگے ہوئے تھے اور وہ نیم غشی کی حالت میں تھی، پرچہ تکیہ پر پڑا ہوا
تھا، اس نے پرچہ اُٹھا کر پڑھا، پرچہ پڑھ کر وہ دبے پاؤں باہر آیا، اور مُنہ ہی مُنہ میں
کہنے لگا:۔

ـــــ فرید بالکل بے گناہ ہے ـــــ ! ہائیں! میں نے یہ کیا کیا،
اس غریب کی تباہی کا میں ذمہ دار ہوں، اور رشیدہ ـــــ آہ
مگر مجھے اپنے کئے کی تلافی کرنی ہوگی ـــــ مجھے فرید کو تلاش کرنا پڑیگا
میں اس سے اپنے گناہ کی معافی چاہوں گا ـــــ فرید بہت نیک
ہے وہ میرے گناہ کو ضرور معاف کر دے گا۔

اکبر نے فرید کی تلاش شروع کردی، ریلوے کی خفیہ پولیس میں اس کے کئی دوست
ملازم تھے، دو تین ہفتہ کی کوشش میں اُسے معلوم ہوگیا کہ فرید کے حلیہ کا کوئی
آدمی چند دن پہلے بے ٹکٹ سفر کرتے ہوئے گرفتار ہوا تھا اور عدالت میں اس
کا چالان کر دیا گیا، سراغ لگ چکا تھا، مزید تفتیش نے اس سلسلہ کی دوسری
کڑیوں کو بھی ملادیا۔ اکبر پاگل خانہ پہنچا، اپنی شخصی ضمانت اور مچلکہ پر فرید
کو پاگل خانہ سے حاصل کیا۔ اکبر نے فرید کے قدموں پر سر رکھ دیا:۔

ـــــ فرید مجھے معاف کردو، خدا کے لئے معاف کردو، میں مجرم
ہوں، تم سے عفو و درگزر کی بھیک مانگتا ہوں ـــــ

فرید اکبر کو گلے سے لگاتے ہوئے بولا:۔

ـــــ اکبر! یہ کیا کر رہے ہو ـــــ لاحول ولاقوۃ ـــــ!
وہ پیشانی جسے صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہئے، ایک ذلیل
انسان کے قدموں پر رکھتے ہو ـــــ ! کیسا گناہ، کیسی معافی ـــــ!

یہ تم کیا کہہ رہے ہو ـــــ !

اکبر نے تمام داستان دُہرادی کہ اس کے دل میں کس طرح بدگمانی پیدا ہوئی
تھی اور اس نے انتقام لینے کے لئے فرید کی بیوہ بہن کو بدنام کیا تھا پیکٹ
پر شعر لکھے جانے کے واقعہ کی بھی تفصیل بیان کی گئی ـــــ واقعات
سُن کر فرید مُسکرایا اور مُسکراہٹ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے
ـــــ بیوہ بہن کی بے گناہی آنسو بن کر ظاہر ہو رہی تھی ـــــ !

فرید کے مل جانے کی دوستوں اور عزیزوں کو بیحد خوشی ہوئی، اور
رشیدہ کی مسرت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا ـــــ ! اس کے کُمھلائے
ہوئے رخساروں میں وفور مسرت نے سُرخی بھردی تھی، وہ اندر کے بدلتے
ہی باہر بھی بدل گئی، مسکراہٹیں اس کے ہونٹوں کو چوم رہی تھیں ـــــ !

اس واقعہ کے دو سال بعد کشمیر کے باغیچہ میں فرید اور رشیدہ کو
ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا، رشیدہ کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سا ہلکا پھلکا ہینڈ بیگ
تھا، جس پر ـــــ

"بیگم فرید احمد"

لکھا ہوا تھا، رشیدہ نے پھول توڑتے ہوئے شعر گنگنایا:۔

جو میرے لئے منتظر جانب در تھی
اب تک وہی چشم نگراں ڈھونڈ رہا ہوں

فرید اس شعر پر چونکا ـــــ رشیدہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:۔
ـــــ گھبرائیے نہیں ـــــ پاگل خانہ جانے کے دن گزر گئے !
فرید نے قدرے جھینپ کر، رشیدہ کی طرف پھول پھینکا، اس پر رشیدہ بولی:۔

جلے ہوئے تو اینٹیں مارتے ہیں

فرید، رشیدہ کے قریب آیا ـــــ
گدگدی، قہقہے، شوخیاں ـــــ آغوش ـــــ !

بقیہ نمود بے بود:۔ صفحہ ۱۳۴

سمجھ لو کہ تمہارے جسم میں بھی یہی کمزوریاں سرایت کر جائینگی۔ اور تم
ایک ناکارہ انسان ہو کر رہ جاؤ گے۔ تمہارے لئے ترقی کی راہیں بند ہو جائیں گی۔
تم اپنے آس پاس کی چیزوں کو بھی کامیاب و بامراد دیکھو، یہاں تک کہ
کمرے میں تصویریں بھی ایسی لگاؤ جن سے طبیعت میں اُمنگ پیدا ہو، جوش و ولولہ
میں لہر دوڑے اور ارادوں میں پختگی آئے۔ بادشاہوں کی تصاویر کبھی نہ دیکھنے کی
کوشش کرو، ان سے مرعوبیت و محکومیت کی جڑ مضبوط ہوگی، اطاعت و بندگی
کی لہر دوڑے گی، اور فطری طور پر تم میں بزدلی پیدا ہوتی چلی جائے گی جس سے تم
نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگو گے۔"

سوزاک اور پیشاب کی خطرناک بیماریاں

وہ علاج جس نے امراض جنسی کے ماہرین ڈاکٹروں کو حیران کر دیا

ڈاکٹر پرائس اے مارو Dr. Price A. Marrow کا اندازہ ہے کہ اگر جنسی امراض کا خاتمہ ہو جائے تو دنیا سے پچاس فیصدی سے زائد امراض دُور ہو جائیں۔ یہ اندازہ بالکل درست ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جسقدر مریض ہیں ان میں سے نصف سے زائد جنسی امراض مثلاً سوزاک اور پیشاب کی دیگر بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ سوزاک سب سے نامراد مرض ہے۔ جو انسان کے جسم میں گھن لگا دیتی ہے۔ زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ نامردی کیطرف لیجا کر مریض کو زندہ درگور بنا دیتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نامراد مرض سے گٹھیا، دل اور گردے کی بیماریاں تشنج ایسے امراض بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

کئی سال کے تجربات کے بعد ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے سوزاک کا وہ علاج دریافت کیا ہے جس کی سو فیصدی کامیابی نے امراض جنسی کے ماہرین کو ششدر کر دیا ہے۔ سوزاک خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ نیا یا پُرانا مریض درد سے چلا رہا ہو۔ مواد آتا ہو۔ مریض کو عارضی آرام ہو کر ابھی اس کا اثر باقی ہو۔ غرضیکہ تمام حالات میں ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا طریقہ علاج بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ اس طریقہ علاج کو وسیع طور پر ہندوستان میں استعمال کیا گیا ہے۔ تو اس نامراد مرض کا قطعی طور پر نام و نشان مٹ جائے گا۔

سوزاک کا بہترین علاج؟

جس نے ہزاروں مریضوں کو دوزخ کی آگ سے بچایا

انسٹی ٹیوٹ کا طریقہ علاج دوائیوں پر مشتمل ہے۔ گونوجن نمبر ۱ و گونوجن نمبر ۲۔ گونوجن نمبر ۱ اندرونی استعمال کے لئے ہے اور گونوجن نمبر ۲ بیرونی طور پر پچکاری کے لئے۔ گونوجن نمبر ۱ کے استعمال سے سوزاک کے تمام عوارضات دُور ہو جاتے ہیں اور چوبیس گھنٹوں میں مریض محسوس کرنے لگتا ہے کہ اسے آرام ہو رہا ہے۔ مکمل کورس کے استعمال کے بعد مرض بالکل دُور ہو جاتا ہے۔ گونوجن نمبر ۲ بیرونی طور پر پچکاری کے لئے ہے۔ پچکاری سے زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ اور سوزاک کے جراثیم گونو کاکائی Gono Cocus Germs بالکل نابود ہو جاتے ہیں۔ مریض کی سہولت کے لئے شیشے کی پچکاری بھی ہمراہ بھیجی جاتی ہے۔ تاکہ علاج میں کسی قسم کی دِقت نہ ہو۔ مکمل کورس کی قیمت دس روپے۔ محصولڈاک الگ۔ یہ دونوں الگ الگ بھی منگوائی جاسکتی ہیں۔ اس حالت میں گونوجن نمبر ۱ قیمت چھ روپے۔ گونوجن نمبر ۲ پانچ روپے آٹھ آنے محصولڈاک الگ۔

گارنٹی { ہر ایک کورس کے ہمراہ ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے گارنٹی بھیجی جاتی ہے۔ جس کی رو سے فائدہ نہ ہونے کی صورت میں مکمل دام واپس کر دئے جاتے ہیں۔

ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۲/۴۱ فیروز شاہ مہتہ روڈ فورٹ ممبئی

عطیہ شجاع صاحبہ بنت ناصر نذیر
صاحب فراق دہلوی

غیر مطبوعہ



جلوۂ شام

از حضرت حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم جانشین خواجہ میر دردؒ

سرا میں چراغوں کو جلوا رہی ہوں — چھپر کھٹ پہ بستر کو بچھوا رہی ہوں
مسافر کو منزل پہ پہنچا رہی ہوں — تھکے ہاتھ پاؤں کو دبوا رہی ہوں

مجھے شام کہتے ہیں میں آ رہی ہوں!

تمنا ہے میری ہر اک دل کے اندر — مرا ذکر چھوٹے بڑوں میں ہے گھر گھر
بہم ہونگے اک جا پہ عشاق و دلبر — کھلیں گے گلے اور شکوے کے دفتر

مجھے شام کہتے ہیں میں آ رہی ہوں

نہا دھو کے جوبن کو اپنے نکھارا — نکالی گئی مانگ جوڑا سنوارا
بنا اور ٹھنا ہے ہر اک ماہ پارا — ادھر اور اُدھر سے نہ کیوں ہو اشارا

مجھے شام کہتے ہیں میں آ رہی ہوں

بسیروں کو باغوں میں آتی ہیں چڑیاں — درختوں پہ پنجہ جماتی ہیں چڑیاں !
مری مدح کا راگ گاتی ہیں چڑیاں — یہ پیغام میرا سناتی ہیں چڑیاں

مجھے شام کہتے ہیں میں آ رہی ہوں

میں جھانجھن کے جھنکار کے ساتھ آئی — میں ٹھوکر کے تکرار کے ساتھ آئی!
میں مضراب کے تار کے ساتھ آئی — میں گھنٹوں کے اور ہار کے ساتھ آئی

مجھے شام کہتے ہیں میں آ رہی ہوں

جو وحدت کے اسرار کے ساتھ آئی — حقیقت کے انوار کے ساتھ آئی !
مؤذن کی تکرار کے ساتھ آئی ! — میں روزہ کی افطار کے ساتھ آئی!

مجھے شام کہتے ہیں میں آ رہی ہوں

غزل

علم و دانش کے موتی

از جناب احسان دانش صاحب

بزم ان کے دوستوں سے وہ دی ہو وفا مجھے
اب خود پہ بھی نہیں ہے گمانِ وفا مجھے
آتی ہے دشمنوں سے بھی بوئے وفا مجھے

کہنے والے دیکھو مری بے پناہیاں
عالم ہے ناپسند تمہارے سوا مجھے

دنیا تھی عزیز سب سے سوا مگر
کیا کر دیا ہے تم نے یہ کیا ہو گیا مجھے

کرتی نہیں عبور تھی میری جستجو
آتی ہے کارواں کی صدا بار بار مجھے

وفا بھی تیری پڑا ہوں تو پھر ان کو پوچھ لوں
میں خود بھی سوچتا ہوں یہ کیا ہو گیا مجھے

یہ میری وفا ہے آپ کی جبیں پہ جبیں نہیں
مایوس کر رہا ہے وہی مدعا مجھے

جس دن سے عاشقی کی دریافت میں جھوم
آپ نے ذرا بھی تو ز اعتم ہوا مجھے

انگو کہ نوعمر کے حال رہا ہے یہ عمر بھر!
احسان ہے لوگ وقت پہ موت آئے گی مگر
دنیا کا مشورہ نہیں دیتی قضا مجھے!

سالِ نو

نغمۂ تازہ

از جناب
جی محمد عبدالغنی صاحب کپور مقبولِ ملت

الوداع اے سال ماضی، اے سالِ نو خوش آمدی
کاش ہو آمد تری سرمایۂ عیش و خوشی!!
ہاں، پلا پھر بھر کے اب جام پر جامِ شرابِ التفات
کاش ہو آمد تری اعلانِ پیغامِ سکوں
کاش مٹ جائے جہاں سے جنگ کا نام و نمود
ہوں نصیب اہلِ ایماں بر کتیں اس سال کی
کاش ہو وجہِ سکون و عافیت تیرا ورود،
ظلم و استبداد کا ہو جائے دامن تار تار
محو ہو سالی دور ہو، افراط ہو ہر بال کی،
مدتوں سے تھی تری جانب نگاہِ کائنات
اپنی قسمت پر ہو نازاں ہر غریب و کاشتکار
ہو زمانے کے موافق گردشِ لیل و نہار
ہر فضائے دھر پر چھائے مسرت کی گھٹا
ایسی نو مطمئن ہو پھر جہاں بے قرار
ہو جہاں رنگ و بو سرمایہ دارِ بہار
پھر پلٹ آئے الٰہی دورِ فصلِ ایکبار

خاص برائے سالنامہ
مشہور دہلی

خود بے بود

از:- ایم قربان فتوحوی

ذیل کے دلچسپ مقالے میں "احساس خودی" اور "فرض کی ادائیگی" پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس ضمن میں مقتدر لوگوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

"احساس خودی" صوفیانہ نقطۂ نظر سے کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو، مگر قوموں کے عروج میں اس کا زبردست ہاتھ ہے چونکہ یہ احساس مُسلم جماعت سے بتدریج رخصت ہو رہا تھا اسلئے علامہ اقبال مرحوم نے فلسفۂ خودی لکھ کر اس کی تلقین فرمائی۔

انھوں نے فرمایا کہ تم غلامی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے بلکہ دُنیا کو غلامی کی لعنت سے پاک کرنا تمھارا مقصود وحید ہے لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ دُنیا کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھا تو کیا دیکھا؟ اپنی آنکھ سے دیکھو ؎

نکردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم

فاضل مضمون نگار نے اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر توجہ دلائی ہے۔ اُمید ہے کہ ان کی محنت رائیگاں نہ جائیگی۔ ایڈیٹر

(※)

فطرت کے ودیعت کردہ عطیات میں سے خود اعتمادی بھی جزءِ لاینفک ہے جو ابتدا سے انتہا تک انسان میں حلول رہتی ہے اور بسا اوقات اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی سے متاثر ہو کر خود بخود ظہور پذیر ہوتی اور طرح طرح کی نیرنگیاں، گل افشانیاں اور گلکاریاں دکھلا کر ناواقف انسانوں کو محوِ حیرت بنا دیتی ہے۔

ہمارے سامنے زمانہ کی تاریخ شاہد ہے جب ہم قوموں، نسلوں اور جماعتوں کے تذکرے کا مطالعہ اور اُن کے کارنامے کا محاکمہ کرتے ہیں تو بے اختیار ہماری زبان سے ان کی فتحمندیوں پر مبارکباد نکل جاتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان عزیزانِ دھر میں کونسی ایسی خداداد صلاحیت موجود تھی جس کی وجہ سے بے شمار خوبیوں اور لاتعداد اوصاف سے متصف ہوئے حالانکہ ان کے ان اقدام لوگوں نے طرح طرح کے آوازے کسے، مضحکے اُڑائے۔ لیکن قابل تحسین اور لائق ستائش ہیں وہ ہستیاں جو ان تمام صعوبات و مشکلات کو قدموں سے روندتی اور پیروں سے ٹھکراتی، اپنی منزل کی طرف بڑھتی ہی چلی گئیں اور بالآخر فتح و ظفر کے زرّین سہرے ان کے سروں پر بندھ گئے۔

اب سب سے پہلے اس برّ اعظم کا نام لو جو علم و ادب، تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، وہ کون ہے؟ یورپ! پھر یہاں کے رہنمایانِ قوم و ملک کی زندگیوں کا جائزہ لو۔ اس بات ... پہلے مِلے گا۔ جو انگلستان کا ممتاز ترین فاتح سمجھا جاتا ہے۔ اس کی فتحیابی کی بنیاد صرف دو چیزوں پر رکھی گئی تھی، ایک احساس خودی، دوسری فرض کی ادائیگی۔

یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ جس وقت انگلستان پر دشمنوں کا زبردست حملہ ہوا تو اس کی تاب الفریڈ نہ لا سکا اور پسپا ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اُسوقت اسے کوئی بھی پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ تو ایک گڈریے نے بدقت تمام اپنے مکان میں امان دی۔ "ایک روز کا واقعہ ہے کہ گڈریے کی بیوی روٹیاں پکانے کی حالت میں کہیں باہر جانے لگی تو الفریڈ کو قریب دیکھ کر روٹیوں کے نہ جلنے دینے کی تاکید کر کے فوراً چلی گئی، الفریڈ نہایت بے پروائی سے دوسرے کام میں منہمک رہا اور روٹیوں کا خیال تک نہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ روٹیاں جل گئیں، واپسی کے بعد جب الفریڈ کی عدم توجہی دیکھی تو سخت برہم ہوئی اور اسکی غیر ذمہ داری کی طعن آمیز لہجہ میں ملامت کی۔"

اس کا اثر یہ ہوا کہ الفریڈ نے اپنی غیر ذمہ داری اور کمزوری پر نفس کو سخت ملامت کی اور فوراً اپنے فرائض سے بے پروائی کا خیال کر کے ایک تھوڑی سی فوج اکٹھا کی اور دشمنوں پر اس طرح دھاوا کیا کہ جس سے ان کے قدم نہ جم سکے اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنے ارادے سے باز آگئے، یہ تھا احساس اور اعتماد خودداری۔ جس کے بعد ... خون دوڑ گیا اور پھر اس طرح بہادرانہ

مقابلہ کیا جس کی نظیر انگلستان کی تاریخ میں ممتاز ہے۔
اب اس کے بعد چاسر اور وکلف کے حالات پر غور کرو اور ایک پلڑے میں
ان دو جانوں کو رکھو، اور دوسرے پلڑے میں یورپ کے عوام وخواص سے لیکر شاہانِ
وقت اور پیشوایانِ زماں جو مدّتِ مدید سے یورپ کے خوانِ نعمت کے مالک و مختار
بلا شرکتِ غیرے تھے اور جن کے ادنیٰ اشارہ اور معمولی ایما پر شہنشاہِ وقت کی گردنیں
جُھک جاتی تھیں، دیکھو کدھر کا پلڑا بھاری ہے۔ یہ دو شخص اپنی جانوں سے بے پروا
ہوکر شاہانِ وقت اور پیشوایانِ مذہب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں۔
جس سے عوام کے کان کھڑے ہوتے ہیں، اُن کے مُردہ دلوں میں حرکت ہوتی ہے
اور بالآخر مُہرِ سکوت ٹوٹتی ہے۔ اب دیکھو کہ ان کے پاس کونسا حربہ تھا، کن ہتھیاروں
کے یہ مالک تھے، جن کے بل بوتے اور سہارے پر اتنی زبردست قوت کشی کی تھی؟؟
وہی جذبۂ خود اعتمادی اور ذاتی اعتبار تھا، اپنے آپ پر بھروسہ اور اپنی ذات پر اعتماد
تھا۔ ان کے بعد ایراسمس کا نمبر ہے۔ ایراسمس ایک فلومنگ کا بچہ تھا۔
والدین کا سایۂ رحمت بچپن ہی میں اُٹھ چکا تھا اسلئے مجبوراً ایک گرجا میں پہنچا دیا گیا
یہاں بچپن کی زندگی تو نہایت بیباکی سے گذاری لیکن جب سنِ شعور کو پہنچا تو پھر ان
مذہب کے ٹھیکہ داروں کے اعمال وکردار اور حرکات وسکنات کا نہایت غور سے
مطالعہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کی تمام ریاکاریوں اور شعبدہ بازیوں سے اچھی
طرح واقف ہوگیا۔ مگر اسوقت یہ کسی اور دُھن میں تھا، وہاں سے نکلکر آکسفورڈ
پہنچا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔
اس دَور کو ختم کرنے کے بعد، بغیر کسی خوف وہراس کے اپنے آپکو ایک
قیامت خیز طوفان میں ڈالکر ان ظاہر پیشہ انسانوں کے خلاف آوازیں بلند کرتا ہے
کتابیں لکھتا ہے Praise of Folly نامی کتاب انھیں
انقلاب انگیزیوں سے پُر ہے، جس میں ان کی بدکاریوں کی پول کھولی ہے اور
ناجائز سختیوں کی قلعی صاف کی ہے، جن کے ہاتھوں میں دوزخ وجنت تھی اور جن کی
خوشنودی پر نجات ومُکتی کا انحصار تھا، یہ اظہارِ حقیقت دیکھکر ہر شخص، ان کے حالات
روزانہ کی زندگی کے معاملات پر نکتہ چینی کرنے لگا، چہار طرف چہ میگوئیاں ہونے
لگیں اس طرح عوام میں بیزاری پھیلی، دلوں میں نفرت کی آگ دہکنے لگی اور بخارات
نکلنے لگے۔

پھر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو! کہ اس نہادر انسان کے اختیار میں کونسی
فوج تھی، کتنی توپیں اور مشین گنیں تھیں اور کسقدر سامانِ جنگ اسکے قبضہ میں تھا؟
کچھ نہیں تھا، صرف اپنی ذات پر بھروسہ کرکے میدانِ جنگ میں کودتا ہے اور اپنے جوشِ
عمل سے یورپ کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوجاتا ہے، یہ کونسی قوت تھی؟ وہی
جذبۂ خود اعتباری، ولولۂ خود اعتمادی اور وہی استقلال وثابت قدمی تھی، اسے
اپنے آپ پر کامل بھروسہ اور اپنی قابلیت کا پورا احساس تھا۔
اسکے بعد نمایاں طور پر Martin Luther کا نام
ملیگا، تو تھر ایک معمولی کسان کا لڑکا تھا۔ اسلئے لڑکپن کے ایام تو نہایت بیچارگی
سے گذارے، جب بلوغ کو پہونچا تو احساس ہوا اور اس تحریک کی تکمیل کے لیے چشم دید
شہادت کو ضروری سمجھا اور اسکے لئے رُوم کا سفر اختیار کیا، جہاں اِن جنت فروشوں
کے آقائے نامدار رہا کرتے تھے، وہاں پہونچکر اس نے اچھی طرح ان کے ظاہر وباطن کا
معائنہ کیا اور واپسی کے بعد فوراً اعلان کردیا کہ "پوپ کو روپے دیکر گناہ سے نجات
پانا، ایک خیالی بات ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو تمام دولتمند، بے گناہ ہوجاتے مگر
ایسا نہیں ہے بلکہ روح کی پاکیزگی اور عبادت، اصل نجات ہے"
یہ ایسا عزم وہمت کا دھنی، اٹل اور مضبوط ارادے کا غنی تھا کہ اسکے
پائے استوار کو تلواروں کی باڑھ، گولیوں کی بوچھاڑ اور گولوں کی بارش، فوجوں کی
یورش، ذرہ برابر جنبش نہ دیسکی۔ آخر کیوں؟ اسلئے کہ اسے اپنی ذات پر اعتماد،
اپنی صلاحیت کا احساس اور انسان کی غیر محدود طاقت کا پورا پورا مشاہدہ تھا
جس نے ایک روز مُرادوں سے ہم آغوش کردیا۔
اسکے بعد ذرا آگے چلو اور پھر فرانس کی ساحرہ Jhon of Arc
کے جذب وکشش کا مطالعہ کرو (ساحرہ ہم نے اسلئے لکھا ہے کہ اسے الزام میں
اسے دہکتی ہوئی آگ میں ڈالدیا تھا) یہ عورت بھی ایک گڈریے کی بیٹی تھی اور کوئی
قدر وقیمت نہ رکھتی تھی۔ دُنیا کے معاملات، حکومت کے کاروبار اور دیگر واقعات
سے کوئی سروکار نہ تھا، اسے صرف روزی کمانے کی فکر اور شکم سیری کا خیال تھا اور
اسی خیال نے اسے صبح سے شام تک میدانوں اور چراگاہوں میں گھیر رکھا تھا۔
"ایک روز حسبِ معمول وہ ایک سُنسان اور اُجڑے مقام میں اپنی بھیڑوں کی رکھوالی
کررہی تھی کہ ملہمِ غیبی کی اسکے کان میں آواز آئی کہ "اُٹھ اور کمربستہ ہو!! اب وطن کو
تیری ضرورت ہے"

اس آواز نے اس کے دل ودماغ پر تیر ونشتر کا کام کیا اور وہاں سے دیوانہ وار
بلکہ صبا رفتار آئی اور مردانہ لباس پہنکر ایک چھوٹی سی فوج تیار کی اور پھر بے شمار
دشمن کے مقابلہ میں اس طرح آہنی ستون کی مانند کھڑی ہوگئی کہ مخالف کے دانت کھٹے
کردئے اور اُسے پیچھے ہٹ جانا پڑا، اس طرح اُس نے خدا کی امداد اور اپنی ذات پر بھروسہ
کرکے خود کو توپ وتفنگ کے مُنہ میں جھونک دیا اور یہ خیال بھی اپنے دل میں نہیں
پھٹکنے دیا کہ میں ایک نازک اور کمزور صنف ہوں، مجھ سے اور تلوار سے کیا مناسبت ہے
یہ تھی خداداد صلاحیت اور خدائی امداد۔

پھر نپولین بوناپارٹ کی زندگی کا جائزہ لو، یہ بھی کچھ حیثیت اور صاحب زر و جواہر نہ تھا بلکہ اس کا باپ بھی اوسط نہیں، ادنیٰ درجہ کا ایک غریب اور مفلس وکیل تھا، ابتدا میں اسے تعلیم کے واسطے ایک اسکول میں بٹھایا گیا، مگر اسکی میلان طبع نے اسے قبول نہ کیا۔ جس سے مجبور ہو کر اسکے باپ نے ایک فوجی اسکول میں داخل کر دیا، جہاں رہ کر اس نے نمایاں طور پر فوجی احکام اور اسکے اصول و قواعد سیکھے، اور جب فرانس کا بادشاہ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تو اسی نے اپنے تدبّر عملی سے زیادہ اپنے آپ پر پختہ بھروسہ کر کے صرف بغاوت و بے امنی کو نہیں بلکہ اپنے وطن کو بھی غیروں کے حملے سے بچا لیا اور اسکے بعد اتنی شاندار قیادت کی کہ جس کی نظیر یگانہ ہے، اور اسی کا صلہ ہے کہ آج دُنیا اسکو نپولین اعظم کے معزز نام سے یاد کرتی ہے،۔

اسکی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ اسکے نزدیک" ناکامی و نامُرادی، مایوسی و بُزدلی" بے معنیٰ اور مہمل الفاظ تھے، اور یہی وہ پختہ خیالی تھی کہ جس کی بدولت زندگی کے کم حصہ میں یورپ کے ایک بڑے حصہ کو مسخر کر لیا تھا یہی وہ کامل وثوق تھا کہ کامیابیاں اور فتحمندیاں اسکے قدموں سے ٹکراتی تھیں، اقدام سے پہلے اختتام اور مسافت سے پہلے منزل دکھائی دیتی تھی۔

اب حال کی مشاہیر کی نظر ثانی کرو! اور سب سے پہلے مصطفےٰ کمال کو دیکھو!! یہ کون تھا؟ ایک نادار اور مفلس باپ کا بیٹا، جسکے تنگی و ترشی گھٹی میں پڑی تھی، کبھی سیر ہو کر کھانا نصیب نہ ہوا تھا اور اسپر ستم یہ کہ صرف پانچ برس کی عمر میں باپ کی کفالت سر سے ہٹ گئی، تو ماموں نے پناہ دی۔ ماموں ایک دیہاتی دہقان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا جسکے سبب اسے چراگاہوں میں بکریوں اور بھیڑوں کے ساتھ رہنا پڑا، لیکن قسمت کی یاوری دیکھو! کہ ایک پڑوسی کو سپاہیانہ سج دھج میں ملبوس دیکھ کر دل میں لہر پیدا ہوئی شوق ہوا، تمنا بیدار ہوئی کہ "ہم بھی اسی کپڑے سے ملبوس ہوتے"

اس ارادے نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور سرپرستوں کے انکار کے باوجود اپنے آپکو ایک فوجی اسکول کے سپرد کر دیا، جہاں عرصہ تک آئین و قوانین کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس طرح رفتہ رفتہ فطری جوہر اور خداداد صلاحیت کھیلنے اور اُبھرنے لگی، یہاں تک کہ چند ہی سال کے بعد قابل رشک کامرانی حاصل ہوئی۔ ....

.... یہ جس وقت کالج کی قید و بند سے چھوٹ رہا تھا، اسوقت یورپ میں جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی تھی جس کی لپیٹ میں سارا یورپ آچکا تھا، اس کے آتشین شعلے ترکی پر بھی پڑے اور یہ بھی مجروح ہو گیا۔ اس زخم خوردہ کی مرہم پٹی کرنیوالا کمال ہی تھا اور اسی نے اپنی شاطرانہ چال سے مخالفوں کو شکست فاش دی۔ جس کے صلہ میں جنرل کی پوزیشن پر آیا اور بادشاہ کے خلعت سے نوازا گیا، لیکن فطرت انسانی کے مطابق دوسرے عہدیداروں سے رقیبانہ چشمک ہونے لگی اور بجائے پشت پناہی کے اس کی حوصلہ مندی کے خلاف باغیانہ الزام رکھا گیا اور بالاتفاق اسکے قتل کا حکم نافذ ہوا، لیکن مصطفےٰ کمال ارادے کا پکّا اور ہمت کا دھنی تھا کہ دشمنوں کا خوف، قانون کی دھمکی اور فضا کی ناہمواری اسکے عزم صمیم کو ہچکولے نہ دے سکی، اسے اپنی ذات، زور بازو اور اپنے مقاصد کی صداقت پر کامل اعتماد اور مستقل مزاجی پر پورا اعتبار تھا، اسے کامل یقین تھا کہ اس ڈگر کے راہی کو کبھی شکست و ہزیمت کا منحوس دن دیکھنا نصیب نہ ہوگا بلکہ فاتحانہ انداز اور شاہانہ چال سے راستے وسیع اور خلیجیں ناپید ہوتی چلی جائینگی اور بالآخر ایک روز یہ ہو کر رہا کہ اپنے تو اپنے بیگانے بھی آنکھیں چار نہ کر سکے،

یہ اس کی انتھک کوشش مکمّل محویت اور کامل استغراق ہی کے ثمرے تو تھے کہ ہر طرف دشمنوں کا انبوہ لرزہ خیز آندھیاں اور زہر آلود فضائیں منڈلا رہی تھیں مگر اسکے مقاصد کو مفقود تو کیا وقار کو ٹھیس بھی نہ لگا سکیں، ....

اس قوم کے مجاہد کا آخری پیغام جو اپنی چہیتی قوم کو دے گیا ہے، صرف سنہرے حرفوں سے لکھنے کا نہیں بلکہ عمل پیرا ہونے کا ہے۔ وہ کہتا ہے" زندگی حرکت کا نام ہے"۔ یعنی اسکے نزدیک محنت سے جی چُرانا، سختی سے بھاگنا اور ناکامی سے گھبرانا بے معنی ہے اور کشاکش میں رہنا عین حیات۔

اب اسکے بعد روس کے انقلاب انگیز اسٹالن پر نظر ڈالو۔ اسٹالن ایک جوتے بنانے والے کا لڑکا ہے، بچپن میں اسے مذہبی اور دینی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کیا گیا۔ لیکن یہ تعلیم اس کی بیباک طبیعت کو راس نہ آئی اور بجائے رہبانیت کے باغیانہ روش اختیار کی، اسٹالن مزدور پیشہ اور حقیر طبقہ کا ایک فرد تھا، اسلئے فطری طور پر ان سے ہمدردی اور اُنس، و محبت پیدا ہو گئی تھی" جنس باہم جنس پرواز" ان کی ہر تکلیف اپنی تکلیف اور ان کی ہر خوشی اپنی خوشی کا باعث سمجھتا تھا۔

شہنشاہِ روس جو زار کے نام سے لاکھوں انسانوں پر من مانی حکومت کر رہا تھا، ان کی کشتیِ حیات کا تنہا ناخدا سمجھا جاتا تھا اور ان کی زندگی اور موت کا واحد ذمہ دار ہو گیا تھا۔ جس کی کھیتیاں مزدوروں کے خون سے سینچی جا رہی تھیں۔ اس کی فلک بوس عمارتیں صرف انھیں کے دم قدم سے جگمگا رہی تھیں اور یہ بیچارے ایک جاپانی کھلونے کی طرح اسکے ہاتھوں میں ناچ رہے تھے، ان کی بے کسی و مظلومی دیکھکر اسٹالن تھرّا گیا اور اسکے رگ و پے میں انتقام کا خون جوش مارنے لگا، اس نے فوراً انھیں مزدوروں کی ایک جماعت تیار کی اور حکومت کے خلاف اپنے کو ڈال دیا۔ اب تمھیں بتلاؤ؟ آخر ان نادار مزدوروں کے پاس کیا دھرا تھا؟ کونسی قوت لاہوت

کے یہ مالک تھے، اور کیسے اسلحہ جات اُن کے اختیار میں تھے ؟؟ وہی فطرت کی دی ہوئی قوت اور بخشی ہوئی طاقت جس کو دوسرے الفاظ میں ذاتی اعتماد کہہ سکتے ہو۔ یہی ایک حربہ تھا اور اسٹالن کو بھی اسی فطری طاقت پر بھروسہ تھا، اپنے وجود پر اعتماد تھا، اور اپنی کوشش کی کامیابی پر اعتبار تھا اسے اچھی طرح یقین تھا کہ یہی ایک نازک دل، سخت سے سخت آہنی زنجیر کو ہلا سکتا ہے اور اپنے جوش عمل سے تمام دنیا پر چھا سکتا ہے، اسکے بلند حوصلے اور مستقل کوششیں کبھی بیکار نہ جائینگی اور یہی وہ عقاید کی پختگی اور یقین کی خوبی تھی کہ اپنے جوش عمل سے حکومتِ زار کو تہ و بالا کر دیا تھا، اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اور سمندر کی موجوں کی طرح پاش پاش کر دیا تھا جس سے مجبور ہو کر خود زار کو اپنی مسندِ حکمرانی خالی کر دینا پڑی اور عنانِ حکومت سونپ دینا پڑی تھی، جس کے بعد انھیں مظلوموں، مزدوروں اور کسانوں کی حکومت پورے روس پر کارفرما ہوئی اور جس کو آج اس جمہور کی دنیا میں دوسروں سے فوقیت اور برتری حاصل ہے، اس کی تمام فتحمندیوں اور کامیابیوں کا مدار صرف ذاتی اعتماد اور مضبوط ارادوں پر تھا۔۔

اسی طرح دیگر مشاہیر کو بھی قیاس کرو، اور اسی کسوٹی پر رکھ کر کسو اور پرکھو کہ ان کی غیر معمولی شہرت اور فتح و نصرت کا مدار کن چیزوں پر ہے ؟ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کی تمام پیشقدمی اور ہمہ گیری کی نیو انھیں خیالات کی بلندی اور پروازی پر رکھی ہے، انھیں اپنی اچھی صلاحیت اور غیر فانی استعداد کا پورا یقین ہے، انسان کی لامحدود طاقت اور فطرت کے انمول جوہر کا پورا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اس گوہر نایاب کو دُنیا کی تمام مصنوعی طاقتیں بھی ملکر چھیننا چاہیں تو نہیں چھین سکتی ہیں، انھیں دوسرے لوازمات سے زیادہ اعتبار، اپنے آپ پر ہے، اپنی ذات پر ہے۔ اور یہی وہ روشن چراغ ہے کہ جس کی رہنمائی میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

اپنے آپ پر بھروسہ ایک ایسا رہبر حیات ہے کہ جس کی قیادت میں ہر شخص بلا تفریق مذہب و ملت، ادنیٰ و اعلیٰ حاکم و محکوم اور امیر و غریب یکساں طور پر ترقی کی شاہراہ پر چل سکتا ہے، اس پر نہ راستے کے رہزن اور لٹیرے کا ہاتھ صاف ہو سکتا ہے اور نہ پولیس کا دن دہاڑے چھاپہ پڑ سکتا ہے۔ نیز یہ محض دنیوی جاہ و حشمت اور ترقی کا ایک آلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے اخلاق و تہذیب کا بلند معیار بھی حاصل ہو جاتا ہے اس میں خودداری کا وہ رقیق جذبہ جوش مار کر اُبلنے لگتا ہے، جس کا مظاہرہ دوسری طرح ممکن نہیں، انسان کو اپنی قیمت آپ لگانے کا موقع ملتا ہے، عزت و وقعت کا احساس ملتا ہے اور اس کی قدر ہوتی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اپنے پر اعتماد کرنا اور اپنا کام آپ کرنا، یہی خودداری کا مقصود بالذات اور انسان کی لاج ہے اسکے برخلاف انسان کا دوسروں کا محتاج ہونا، غیروں کا سہارا ڈھونڈنا اور کسی کا دستِ نگر ہونا صرف خودداری کی پامالی نہیں۔ بلکہ اخلاق کی پستی اور کمزوری ہے۔ جس سے انسانیت پر ایک بدنما دھبہ پڑتا ہے۔

کسی کا خود کو اپنی نظروں سے گرا دینا، اپنے وجود کی تحقیر کرنا، اور اپنی شخصیت کو خاکِ راہ سمجھنا گویا آپ اپنی توہین کرنا، اپنی کمزوری کا اعلان کرنا اور اپنے کو پستی و انحطاط کی طرف لیجا کر ذلت و خواری کی ناپاک گہرائیوں میں ڈال دینا ہے جن سے اُبھرنا محال ہی نہیں، غیر ممکن ہے۔ انھیں کمزوریوں سے انسان میں انتہا درجہ کی افسردگی، پژمُردگی، پست ہمتی اور بزدلی پیدا ہوتی ہے، دل کی شگفتگی اور طبیعت کا اٹھان ختم ہو جاتا ہے، جسم کی حرارت، برودت کے ہاتھوں بک جاتی ہے اور سر تا پا جمود و تعطل کا ایک چلتا پھرتا مجسمہ بن جاتا ہے۔

اب تمھارے سامنے تصویر کے دونوں رُخ آ گئے، اگر تمھیں آخری جھلک پسند ہے تو پھر تمھیں اس کاروباری دُنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، جاؤ! اور اپنی زندگی کی منزلیں کہیں اور بناؤ۔ اور اگر تمھیں اپنے وجود کو خوشگوار اور شاداب بنانا ہے، اپنی تخلیق کا جائزہ لینا ہے تو اُٹھو ! اور ایک سپاہی کی طرح مستعد ہو جاؤ! زندگی کی کشمکش میں حصہ لو، خیالات کو تپاؤ، سوزِ یقین سے گرماؤ اور میدانِ عمل میں اس طرح آؤ جس طرح سمندر کی موجیں، کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ساحل سے ٹکراتی ہیں اور پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ مگر ہمت نہیں ہارتیں، بلکہ اسکے بعد بھی مسلسل زوردار حملے کئے چلی جاتی ہیں۔ یہانتک کہ سخت سے سخت محلات اور آہنی در و دیوار کو جڑوں سمیت اُکھیڑ پھینکتی ہیں، تمھاری تخلیق کا مقصود بھی یہی ہے بلکہ تم خود ادنیٰ طور پر ایک خالق ہو، اپنی کامیابی و ناکامی پر نظر بس نہ جماؤ، صرف مقصد تخلیق کو جانو اور جد و جہد کئے چلے جاؤ۔ پھر دیکھو کہ تم میں کونسی صلاحیت نہیں ہے اور تم کس لائق نہیں ہو۔ تمھاری وہ غیر محدود طاقتیں جو خود تمھاری آنکھوں سے اوجھل ہیں، غیر محسوس ہیں، جن کا اندازہ کرنا تمھارے بس سے باہر ہے، خود بخود عُریانیت کا جامہ پہنکر منظرِ عام پر آ جائینگی۔ تم کبھی بھی حُزن و اضمحلال اور فکر و رنج کو جگہ نہ دو کہ جس سے تمھارے ہوش و حواس کھو جائیں اور اچھی صلاحیت بھٹک جائے، ایسا نہ ہونے دو، بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرو اور اپنے زور سے ان افکار و ترددات پر غلبہ حاصل کرو، فتح پاؤ، یہی تمھاری مردانگی اور شجاعت کا تقاضہ ہے۔ تم ہمیشہ اپنے دل و دماغ کو خوشی و مسرت سے لبریز، خیالات کو کامیابی سے معمور اور ارادوں کو عزم سے ہمکنار رکھو۔

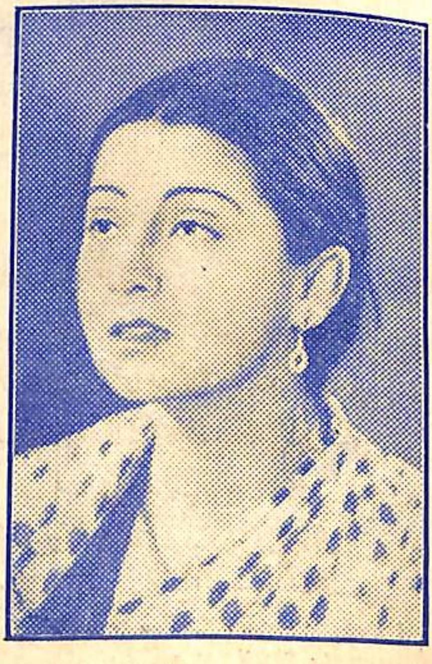
ماہر نفسیات کا مقولہ ہے کہ "انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے" اسلئے تم عموماً اچھوں کی صحبت اختیار کرو، کامیابوں کا ساتھ دو، اور بلند ارادوں کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کرو، تم ان لوگوں میں رہ کر کبھی بھی اپنے اوقات کو ضایع نہ کرو جو ہمت کے پست ارادے کے چھوٹے اور خیال کے متزلزل ہیں، اگر تم ایسا کرو گے تو



ھندوستان کی مایہ ناز فلم اسٹار وینا کماری لکھنوی



نتاآپٹے زمیندار میں



مس منورما زمیندار میں



مسٹر ظہور راجہ
ہندوستان کے ترقی پسند
ڈائرکٹر و پروڈیوسر



رادھا رانی فلم مزاق میں



سیٹھ دلسکھ ایم پنچولی
مالک پنچولی آرٹ پکچرز لاہور



مسٹر پی-بی زویری
مالک کیرتی پکچرز بمبئی

ریاستی پولیس کے کارنامے

ضابطہ کی کارروائی

از جناب سید حبیب الرحمٰن صاحب غزنوی

(✻)

والد مرحوم کی خدمات چونکہ افسران بالادست کے ذہن سے ابتک محو نہ ہوئی تھیں اسلئے میری درخواست پر فوراً ہی توجہ کی گئی۔ اور ایک چھوٹے سے قصبہ میں تھانیداری کی جگہ مجھے متعین کر دیا گیا۔ کسی زمانہ میں میرے والد بھی اس جگہ تھانیدار رہ چکے تھے۔ اور ایک عرصۂ دراز کے بعد آج میں بھی اسی جگہ تھانیدار بنا دیا گیا تھا۔ یوں تو میں تھانیدار بن چکا تھا مگر تھانیداری کے اصول اور دُنیا سازی کے فن سے ناآشنائے محض تھا اگر میں کانسٹبل سے نائک۔ نائک سے جمعدار۔ اور جمعدار سے تھانیداری کے عہدے پر ترقی کرتا تو خاصا تجربہ کار ہوتا۔ مگر یہاں تو چھوٹتے ہی تھانیداری مل گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ آئے دن میرے سامنے طرح طرح کی مشکلات درپیش ہوتیں۔ چند ایام گذرنے کے بعد بھی اگر میں کچھ سیکھ سکا تھا تو صرف "ضابطہ کی کارروائی" کرنا۔

تھانہ میں الہٰی بخش نامی ایک کانسٹبل بہت پُرانا تھا۔ تھا تو وہ کانسٹبل! مگر بلحاظ تجربہ کاری کے ایک تھانیدار سے کسی طرح کم نہ تھا۔ میں شہر کا باشندہ۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں بہت جلد اُکتا گیا۔ مگر خدا بھلا کرے اس الہٰی بخش کا کہ اس نے بہت جلد میرے مزاج کی افتاد کو پہچان لیا۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو سکا اس نے اس چھوٹے سے گاؤں میں بھی میری دلچسپی کے بہت سے سامان جمع کر دئے۔ الہٰی بخش کی عمر پچاس برس کے قریب ہو گئی۔ وہ اپنی لمبی داڑھی پر اکثر خضاب لگایا کرتا۔ شام کو جب تھانہ میں نیم تلے کرسی ڈالکر بیٹھتا اسوقت الہٰی بخش مجھے بہت سی نصیحتیں کرتا۔ اپنے تجربات بیان کرتا۔ اپنے ماتحتوں سے کس طرح پیش آنا۔ اور عوام پر کس طرح اپنا سکہ جمانا۔ یہ تمام گُر، وہ مجھے سکھاتا۔

یہ الہٰی بخش ہی کی عیاریاں تھیں کہ روزانہ کوئی نہ کوئی میری مٹھی گرم کر دیتا۔ میرا کام تو صرف اسقدر تھا کہ میں اپنی جیب بھر لوں۔ باقی تمام مراحل خود الہٰی بخش ہی طے کر لیا کرتا۔ چھوٹا سا گاؤں تو تھا ہی۔ اسلئے عموماً ہم لوگ صبح سے شام تک یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ الہٰی بخش بسا اوقات اپنے کوارٹر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا ہوا حقہ پیتا رہتا۔ اور کانسٹبلوں کو جمع کر کے گپ شپ لڑایا کرتا۔ اور اگر کبھی کوئی قسمت کا مارا غریب فریادی اس طرف چلا آتا تو پھر الہٰی بخش کی زد سے اسکا بچکر نکل جانا محال تھا۔ یہ سال خوردہ بوڑھا اُسے کچھ ایسی پٹی پڑھاتا کہ وہ غریب اسپر فوراً ہی ایمان لے آتا۔

حسب دستور ایک روز صبح میں آفس کے برآمدہ میں بیٹھا ہوا حالات پر غور کر رہا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ سے میری مٹھی گرم نہ ہوئی تھی۔ چائے کی ٹرے اور سگریٹ کی ڈبیا سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ میرے چہرہ پر افسردگی اور غم کے آثار ہویدا تھے۔ الہٰی بخش بھی سامنے ایک کونے میں بیٹھا ہوا حقے کے کش لگا رہا تھا۔ میں اپنی پوزیشن کے لحاظ سے ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا کہ کوئی میرے اندرونی خیالات اور جذبات سے واقف نہ ہو سکے مگر توبہ کیجئے! الہٰی بخش سے ایسی باتیں چھپانا کوئی آسان کام نہ تھا یکایک اس نے کہا:۔

سرکار ــــ آج کچھ مغموم معلوم ہوتے ہیں آپ ــ؟"

"نہیں تو ــ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ غم کس بات کا ــ؟"

اجی سرکار ــ آپ ہم سے کیا چھپائینگے ــ؟

آخر کوئی بات بھی تو ہو ــ!

"اجی آپ فکر نہ کریں ــ یہ دوکانداری تو اسی طرح چلتی ہے ــ بارہ مہینے یکساں نہیں ہوتے ــ"

"الہٰی بخش ــ" میں نے ذرا رعب گانٹھتے ہوئے کہا" معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میرے متعلق کوئی غلط رائے قائم کی ہے"

"حضور ــ گستاخی معاف ــ" اس نے ذرا لجاجت سے کہا" آپ پہلے تھانیدار نہیں ہیں جن سے میرا واسطہ پڑا ہو۔ اجی ہم تو اب اس فن کے گھاگھ بن چکے ہیں ــ لیکن ایک بات ضرور عرض کروں گا حضور ــ اور وہ یہ کہ آپ کوئی بھی بات مجھ سے چھپائینگے تو اس میں میرا کوئی نقصان نہ ہوگا ــ البتہ آپ سراسر گھاٹے میں رہینگے"۔

جب میں نے غور کیا تو الہٰی بخش کی باتیں مجھے واقعی صحیح معلوم ہوئیں۔ آخرکار

میں نے ذرا نرمی سے کہا

"نہیں نہیں الٰہی بخش ___ میں تم سے کوئی راز چھپانا نہیں چاہتا ___ تم نے جو کچھ سمجھا ہے ٹھیک سمجھا ہے"

میرے اعترافِ شکست پر اس کی باچھیں کھل گئیں ۔ اور وہ خوشی میں حقے کے جلد جلد کش لگانے لگا۔

حسبِ معمول ایک روز تھانہ میں بیٹھا ہوا الٰہی بخش سے گفتگو کر رہا تھا کہ وہ بیک تھانہ کے پھاٹک کی طرف دیکھ کر کچھ خاموش سا ہو گیا۔ میں نے جو مُڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بنیا گھٹنوں سے اوپر تک میلی کچیلی دھوتی پہنے حواس باختہ چلا آرہا ہے۔ جب وہ قریب آیا تو الٰہی بخش نے پوچھا

"کہو لالہ ___ آج صبح صبح کس طرف راستہ بھولے ___ ؟"

"اجی سرکار ___ دُہائی ہے" وہ فوراً ہی چلانے لگا "میں تو مر گیا۔ برباد ہو گیا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا ___ حضور میری مدد کیجئے ___"

"آخر بات کیا ہے ___ ؟" الٰہی بخش نے ذرا سنجیدگی سے سوال کیا۔

"اجی غریب پرور ___ یہ دیکھئے" اس نے ایک کاغذ کا پرزہ دیتے ہوئے کہا "حضور ___ آج جو میں سو کر اٹھا تو یہ کاغذ دروازہ پر چپکا ہوا ملا ___ اشتہار ہے حضور اشتہار ___ جھنڈا سنگھ ڈاکو کا اشتہار ___ اس میں لکھا ہے کہ پانچ ہزار روپیہ آج شب کو ٹیلہ پر رکھ دینا ___ ورنہ ___ ورنہ ڈاکہ پڑے گا ___ میں لٹ جاؤں گا سرکار ___ برباد ہو جاؤں گا ___ غریب بنیا ہوں ___ پانچ ہزار روپے تو کبھی میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے ___ بچائیے سرکار بچائیے ___"

اسی طرح چلاتے چلاتے ایک کہرام مچا دیا۔ مجھے اس غریب کی حالت پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ الٰہی بخش نے مجھے اشارہ سے خاموش رہنے کو کہا۔ اور بنئے کو اس طرح ڈانٹنا شروع کیا۔

"ابے سرکار کے بچے ___ چلّاتا کیوں ہے ___ کہیں تہذیب بھی سیکھی ہے یا نہیں ___ یہ تھانہ ہے تھانہ ___ تیری سسرال نہیں ؟"

بنیا غریب سہم گیا۔ پھر الٰہی بخش نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

"اجی سرکار ___ یہ کمبخت جھوٹا معلوم ہوتا ہے ___ کہیں اس طرح بھی ڈاکے پڑا کرتے ہیں ___ آخر انگریزی عملداری ہے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے ___ !"

پھر وہ بنئے کو ایک طرف لے گیا۔ دونوں کچھ دیر تک آپس میں کانا پھوسی کرتے رہے۔ جب وہ دوبارہ میرے قریب آئے تو بنئے نے نہایت لجاجت سے ۲۵ ___ ۲۵ روپے کے نوٹوں کی ۴ گڈیاں میرے قریب رکھ دیں۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ کیا ___ ؟"

"سرکار ___" الٰہی بخش نے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ لے لیجئے ___ بیچارہ بہت بھلا آدمی ہے ___ ہمیں اس کی ضرور حفاظت کرنا چاہئے ___ یہ آپ کو اور بھی خوش کرے گا ___"

"اجی ___ غریب پرور ___" بنیا کہنے لگا "آپ کی تو ہم پر دیا ہونی چاہئے ___ مائی باپ ! اگر اس مرتبہ جان بچی تو میں آپ کو خوش کر دوں گا ___ !"

میں نفسِ واقعہ سمجھ چکا تھا۔ لیکن روپیہ لینے میں مجھے کچھ جھجھک سی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر الٰہی بخش نے وہ روپیہ اُٹھا لیا اور بنئے کو طرح طرح سے تسلیاں دیکر چلتا کیا۔ مجھے اس کی حیرت انگیز ترکیبوں پر تعجب ہو رہا تھا۔ مگر اس کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔

بنئے کی آہ و زاری دیکھ کر میرا راجپوتی خون جوش میں آ گیا تھا مزید برآں سَو روپیہ کی یکمشت رقم نے اور بھی گرمی پیدا کر دی۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں کوئی نمایاں کام کر کے افسرانِ بالادست کی نگاہوں میں سُرخرو ہونا بھی چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے شام ہوتے ہی تھانے میں دھوم مچا دی۔ قریب قریب سبھی کو تیاری کا حکم دیدیا میری ایک گھوڑی تھی جس کا نام اس کی سُرعتِ رفتار کی مناسبت سے میں نے بجلی رکھا تھا اس پر بھی زین کس دیا گیا۔ میں نے اپنی ریوالور اچھی طرح جانچ لی۔ تمام نوجوان کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔ انھیں میں نے ایک ایک رائفل اور کرچ بھی دیدی تھی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ مگر الٰہی بخش نہایت اطمینان سے ایک کونے میں بیٹھا ہوا اپنی ڈاڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی مشہور غزل کا ایک آدھ شعر بھی گنگنانے لگتا۔ چونکہ مہم بلحاظ اپنی نوعیت کے کافی حوصلہ شکن تھی اسلئے میں نے اپنی معیت میں صرف نوجوانوں ہی کو لیا تھا اور الٰہی بخش کو بوڑھا ہونے کے باعث نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن جب تمام تیاریاں مکمل ہو چکیں۔ تو الٰہی بخش چپکے سے میرے قریب آیا اور کہنے لگا :۔

"یوں تو حضور مائی باپ ہیں ___ مگر میں نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ___ پولیس کی پگڑی سر پر رکھے تیس سال گذر چکے ہیں ___ فی الحقیقت آپ بڑے سیدھے سادے آدمی ہیں ___ مجھے آپ پر بہت پیار آتا ہے ___ سرکار ! میرا بھی ایک جوان بیٹا ہے۔ بالکل آپکی شکل و شباہت کا .... !"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو ___ ؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے حضور ___ ! کہ آپ جوان آدمی ہیں" اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا "آگے پیچھے سوچ سمجھ کر کام کرنا ٹھیک ہے ۔ آپ ...... !"

"میں تمہارا مطلب ابتک نہیں سمجھا الٰہی بخش" میں نے پھر قطع کلام کرکے کہا "ذرا صاف صاف کہو۔"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں سرکار — اکہ جھنڈا سنگھ ڈاکو آواز پر گولی مارتا ہے — ذرا ہوشیار رہیئے گا"

یہ کہکروہ تو چلدیا۔ لیکن معلوم نہیں اس کی بات میں کیا جادو تھا کہ یکایک میرا جسم لرزنے لگا۔ میری تمام گرمی کافور ہوگئی۔ ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ دل دھڑکنے لگا رہ رہ کر الٰہی بخش کی آواز میرے کانوں میں گونجتی تھی۔ مجھے اپنی جلد بازی پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ واقعی میں نے سخت حماقت کی تھی کہ الٰہی بخش ایسے معمر اور تجربہ کار پولیسمین سے مشورہ کئے بغیر ہی سب کو تیاری کا حکم دیدیا۔ اور ایک ہولناک خطرے کو غیر اہم سمجھ کر خود کو مصیبت میں مبتلا کر لیا۔ سب سے بڑی حماقت تو میں نے یہ کی تھی کہ الٰہی بخش کو بوڑھا سمجھ کر قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ حالانکہ اب یہ حقیقت مجھے معلوم ہوگئی تھی کہ الٰہی بخش کے بغیر یہ مہم سر نہیں کیجا سکتی۔ کیونکہ دنیا کے نشیب و فراز کو جتنا وہ سمجھ سکتا تھا اس سے نصف بھی ہم نہیں سمجھ سکتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ جھنڈا سنگھ کے ڈاکے کو میں نے شمہ برابر بھی اہمیت نہ دی تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری حیثیت اس قصبہ میں ہنوز نووارد کی سی تھی۔ جھنڈا سنگھ کے کارنامے اور اُس کی خوں آشامیوں کے قصے میں نے اب تک نہیں سُنے تھے۔ لیکن اب الٰہی بخش کی زبانی جھنڈا سنگھ کے متعلق صرف ایک ہی بات سنکر میرا راجپوتی خون جو بلاوجہ جوش میں آگیا تھا بتدریج سرد اور منجمد ہونے لگا۔ مگر پولیس کے تمام جوانوں کو میں تیاری کا حکم دیچکا تھا اور سب ہی قریب قریب تیار ہوچکے تھے۔ اندریں صورت اگر مہم ملتوی کردوں تو یہ بھی گویا بہت بڑی بزدلی کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے عزم بالجزم کر لیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مہم پر ضرور جائیں گے۔ مگر ہاں — الٰہی بخش کو ساتھ لینا ہی ہوگا — پکا آم اور پُرانا چاول بڑے کام کا ہوتا ہے —!

میں نے دیکھا کہ "الٰہی بخش" اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا حقہ پینے میں مشغول ہے۔

میں نے اسے اپنے قریب بُلا کر کہا:۔

"میاں الٰہی بخش — تمھیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا —!"

"کیا مجھے حضور —؟" اس نے ذرا حیرت سے کہا "میں بڈھا آدمی وہاں کیا کرسکوں گا —؟ وہاں تو جوانو ......!"

"تمھیں ضرور چلنا ہوگا — تیار ہو جاؤ —!

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف گیا۔ اور چند ہی منٹوں میں کیل کانٹوں سے لیس ہوکر آگیا۔ ہم تقریبًا نو بجے شب کو روانہ ہوئے۔ چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ ہمارے گھوڑے آہستہ آہستہ چلے جارہے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب گنّوں کے کھیت تھے ہم تقریبًا ۴ فرلانگ شہر سے آگے بڑھے تھے کہ ایک پُلیا کے قریب پہنچکر الٰہی بخش نے کہا:۔

"بس — رُک جاؤ —!"

میں نے بجلی کو روک کر کہا:۔

"میاں الٰہی بخش —! ہم یہاں رُک کر کیا کرینگے؟

"سرکار — ہم یہیں مورچہ جمائینگے — یہی جگہ مناسب ہے۔"

میری حالت تو مُردہ بدست زندہ کی سی تھی۔ آج الٰہی بخش ہمارا قائد و رہبر بنا ہوا تھا۔ اور ہمیں سوائے اس تجربہ کار بوڑھے کی باتوں پر عمل کئے کوئی چارہ نہ تھا لامحالہ ہم ٹھیر گئے۔ گھوڑے قریب ہی گنّے کے ایک کھیت میں اس طرح باندھے گئے کہ سڑک سے نظر نہ آسکیں۔ ابھی ہم انھیں امور سے فارغ ہوکر سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ "الٰہی بخش" بول اُٹھا:۔

"سرکار — ہوشیار ہو جائیے — ڈاکو سر پر آگئے ہیں — میں ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سُن رہا ہوں —!"

میں نے فوراً ہی اپنا ریوالور سنبھالا اور یہ یقین کرکے کہ اس میں گولیاں بھری ہوئی ہیں آنے والے ہولناک خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا لیکن میں نے دیکھا کہ الٰہی بخش چپکے سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ سڑک سے اُتر ایک طرف جارہا تھا۔ میں نے ذرا آہستہ سے کہا:۔

"کہاں جارہے ہو الٰہی بخش —؟"

"حضور — میں تو اس چھوٹی سی پُلیا کے نیچے چھپ رہا ہوں —!

یہ کہکر وہ نہایت سرعت کے ساتھ اس چھوٹی سی پُلیا میں چلا گیا۔ ایمانی بات تو یہ ہے کہ الٰہی بخش کے اس طرز عمل نے میری "ترکی تمام" کر دی تھی۔ تاہم مقابلہ کی ہمت مجھ میں ضرور تھی۔ لیکن غضب تو یہ ہوا کہ الٰہی بخش کے جاتے ہی میرے تمام مایۂ ناز جوان بھی اُسی کی تقلید کرتے ہوئے سڑک سے نیچے اُتر گئے۔ اور یکے بعد دیگرے سبھی اس مختصر سے غار میں داخل ہوگئے۔ اب میری ہمت بھی جواب دے رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ڈاکوؤں سے دو، دو ہاتھ کرنے کے تمام ولولے خاک بسر ہو رہے تھے۔ ڈاکوؤں کے گھوڑوں کی آوازیں جسقدر قریب ہوتی جارہی تھیں اسیقدر میرے حواس گم ہوتے جارہے تھے۔ آخر بوجہ مجبوری میں بھی سڑک سے نیچے اُتر آیا۔ اور پُلیا کے قریب پہنچ کر کہا:۔

"میاں الٰہی بخش — ہمیں بھی اندر لے لو —!"

"اجی سرکار — اب اس پُلیا میں جگہ ہی کہاں ہے —؟ لیکن خیر — آ جائیے —!"

پُلیا واقعی چھوٹی سی تھی۔ اور پھر دس قوی ہیکل جوان اس میں پہلے ہی سے دبکے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں واقعی میرے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ مگر الٰہی بخش نے میری تھانیداری کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اندر آنے کی اجازت دیدی اور میں بھی موقع غنیمت جانکر جلد ہی اس میں جا چھپا۔

بمشکل ۵ منٹ گذرے ہونگے کہ ڈاکو آ پہنچے۔ ان کے صبا رفتار گھوڑے جسوقت پلیا پر سے گذرنے لگے۔ اسوقت یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا ہمارے دل۔ ہمارے حوصلے اور ہمارے عزائم ان کی ٹاپوں میں کچلے جا رہے ہیں۔ جب یہ آٹھ دس گھوڑے گذر چکے تو میں باہر نکلنے لگا۔ مگر الٰہی بخش نے یہ کہکر مجھے روک لیا کہ ذرا صبر کیجئے — ان لوگوں کو واپس چلے جانے دیجئے۔"

گاؤں کوئی زیادہ دُور نہ تھا۔ ڈاکوؤں نے وہاں پہنچتے ہی قیامت برپا کردی یکے بعد دیگرے بندوقوں کے فائر ہونے لگے۔ اور ساتھ ہی لوگوں کی دردناک چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ الٰہی بخش نے کہا۔

"دیکھا حضور — ڈاکہ پڑ رہا ہے — اگر اسوقت ہم وہاں ہوتے تو —؟"

کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد ڈاکو واپس لوٹے۔ اور اسی طرح گھوڑے دوڑاتے ہوئے پُلیا سے گذر گئے۔ الٰہی بخش نے کہا:۔

"چلو — اب خطرہ دور ہو گیا —! معاً ہم سب باہر نکل آئے۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہئے الٰہی بخش —؟" میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کیجئے —" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا" میں سب ٹھیک کئے دیتا ہوں"

یہ کہکر اس نے اس طرح احکامات دئے:۔

"دیکھو منگل سنگھ — تم گاؤں کے مشرقی سرے پر جاؤ — اور وہاں بندوق کے چند فائر کرو — اور دیکھو رگھبیر سنگھ! تم اور سردار خاں گاؤں کے اس کنارے پہنچ جاؤ جہاں کالی دیوی کا مندر ہے اور وہیں سے اپنی بندوقیں ہوا میں داغدو! اور سنو — حسنات خاں اور راجپال تم اس پُلیا سے تقریباً ایک فرلانگ دُور پہنچکر بندوقوں کی آواز کردو —!

غرضیکہ اسی طرح اس نے تمام [illegible]

گریبان پکڑکر اس زور کا جھٹکا دیا کہ وردی دامن تک پھٹ گئی۔ اسی طرح اس نے میری آستینوں اور پشت کی جانب بھی چند ناہموار چاک لگائے۔ میں الٰہی بخش کی ان حرکات سے حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ چونکہ اس کی قابلیت پر مجھے پورا پورا اعتماد تھا اسلئے خاموشی سے میں اس طرح اپنی دُرگت دیکھا کیا۔ جب ان امور سے وہ فارغ ہوا تو کہنے لگا " ذرا آنکھیں بند کر لیجئے" میں نے اسکے کہنے پر جیسے ہی آنکھیں بند کیں کہ اس نے مٹی اُڑانا شروع کی۔ یہاں تک کہ میرے سر کے بال اور تمام وردی خاک آلود ہو گئی۔ پھر جسقدر میری پیٹی میں کارتوس تھے اس نے وہ سبھی خالی کر ڈالے۔ ساتھ ہی منگل سنگھ، رگھبیر سنگھ، سردار خاں اور حسنات وغیرہ کی بندوقوں کے آواز بھی ہونے لگے۔ اب الٰہی بخش نے کہا" چلئے سرکار — شکار مار لیا"

"آخر کونسا شکار مار لیا" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"حضور! یہ تو میں گاؤں میں پہنچکر بتاؤنگا"

ہم گاؤں پہنچے۔ غریب بنیا زار زار رو رہا تھا۔ ڈاکو تقریباً بارہ ہزار کا مال لوٹ کر چمپت ہو گئے تھے۔ اس کا ایک ملازم ہلاک ہوا تھا اور دو افراد زخمی ہو گئے تھے۔ الٰہی بخش نے پہنچتے ہی لوگوں سے کہنا شروع کیا:۔

"پُلیا کے قریب ہی جھنڈا سنگھ سے ہماری مُٹھ بھیڑ ہو گئی تھی — تھانیدار صاحب نے مردانہ وار مقابلہ کیا — مگر — کیا کیا جائے — ہماری گولیاں عین وقت پر ختم ہو گئیں —!"

"واقعی — ہم نے گولیوں کی آوازیں تو سُنی تھیں" مجمع میں سے ایک شخص نے کہا۔

"ارے بھئی کیا بتائیں —" الٰہی بخش نے کہا" بس یہ سمجھو کہ ڈاکوؤں کی قسمت میں آج مرنا نہیں لکھا تھا — ورنہ ....؟"

غرضیکہ اسی طرح الٰہی بخش نے چند باتیں بنا کر تھانے کا راستہ لیا۔ ساتھ میں ہم بھی روانہ ہوئے۔ ایک کانسٹبل کو اسی وقت ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کو اطلاع دینے روانہ کر دیا۔

علی الصبح ڈی۔ ایس۔ پی صاحب مع اسٹاف کے موٹر میں تشریف لائے ہم اُن کے ساتھ موقع واردات پر پہنچے۔ صاحب بہادر نہایت عقلمند آدمی تھے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر الٰہی بخش کے چہرے پر کوئی بات بھی نہ تھی۔ الٰہی بخش نے وہاں پہنچکر اس طرح رپٹ لکھوائی:۔

"پُلیا کے قریب جھنڈا سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ وہ لوگ تقریباً [illegible] آدمی! بہت دیر تک دونوں جانب سے

گولیاں چلتی رہیں۔ مگر عین وقت پر ہماری گولیاں ختم ہوگئیں۔ آخر کار ہم نے دست بدست جنگ شروع کردی۔ ہمارا ایک ایک جوان ۵ ـ ۵ اور ۶ ـ ۶ ڈاکوؤں سے لپٹ گیا۔ تھانیدار صاحب نے تو نہایت جوانمردی دکھلائی۔ تقریباً ۸ ـ ۱۰ ڈاکوؤں سے وہ تنہا لڑ رہے تھے۔ ان کی تمام وردی ریزہ ریزہ ہوگئی۔ چونکہ مقابلہ ۸ کا ۲۰ سے ناممکن تھا اسلئے وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل بھاگے۔ اور ہم تھک کر اسقدر چُور ہوگئے تھے کہ ان کا تعاقب بھی نہیں کر سکے،،

صاحب بہادر نے ہمیں بہت شاباشی دی۔ اور رپٹ میں میری ترقی کی سفارش بھی لکھدی " ضابطہ کی کارروائی " ختم کرکے جب ہم تھانہ پہنچے تو الٰہی بخش نے چا بنا کر صاحب کے سامنے پیش کی۔ صاحب بہادر ہماری کارگذاری پر بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے چا پیتے ہوئے کہا:۔

" ویل الٰہی بخش ـــ تمہاری رپٹ بہت اچھی ہے ـــ ہم بہت خوش ہوا ـــ مگر " ضابطہ کی کارروائی " تو اب ہوچکی ـــ اچھا اب سچ سچ تمام واقعات ہمیں سُنا دو ـــ !

یہ سنتے ہی میرے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ میری خوشی اور مسرت کے تمام فلک بوس قلعے گویا یکایک منہدم ہوگئے۔ مگر الٰہی بخش کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ بلکہ اس نے نہایت لاپرواہی سے کہا:۔

" اجی سرکار ـــ کہاں کا مقابلہ ـــ اور کہاں کی بات ـــ اجی ہم تو اس پُلیا میں چھپے بیٹھے تھے ـــ !

" پھر ـــ ! " صاحب نے مسکرا کر سوال کیا۔

" پھر کیا ـــ ؟ " الٰہی بخش نے کہا " جب ڈاکو لوٹ مار کر کے واپس چلدئے تو ہم وردیاں پھاڑ کر بندوقوں کے فیر کرتے ہوئے گاؤں چلے آئے "

صاحب نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہا:۔

" تم بہت ہوشیار آدمی ہو ـــ اگر اسوقت ہم ہوتا تو ہم بھی یہی کرتا "

جذباتِ حقی

از جناب محمد عتیق الرحمٰن صاحب حقی اِلٰہ دہلوی (انسپکٹر ایکسائز چیبوہ)

اُن کی نظر بھی برہم، لب پر کچھ ہنسی بھی!
رکھوں گا یاد ساقی، یہ تیری برہمی بھی!
بے التفاتیاں تو حد سے گزر چکی ہیں!
نازو نیاز میری مستی سے ہیں نمایاں
آتا ہے لبوں پہ ہلکا سا اک تبسم؟
آئے نہیں وہ اب تک، کیا بات ہو الٰہی
ہاں بن سنانے والے، تو آپ ہی سمجھ لے!
رہتا ہے عیش پر تو معترض ہمیشہ
تقدیر جسم الفت، شاید یہی تجمل
منحصر کسی کی اک جنبش نظر پر
ہے ہوش کوئی، میری ہی اک نظر میں
دنیا کو جب کو دیکھو تمہارا ہی آئینہ ہے
گلشن میں جب تک ہے انش جنوں میں
ہو آگ اک فزوں تر، [illegible]
کیوں ہے نیاز مند، مخلص سے بے نیازی
میں کیا بتاؤں کہ مجھکو غم ہی پسند آیا
ورنہ ازل میں حقی، موجود تھی خوشی بھی!

ہے ساتھ ساتھ غم کے حاصل مجھے خوشی بھی!
میں تو گزار دوں گا بے کیف زندگی بھی
نظریں مری طرف ہیں کچھ التفات کی بھی
ہوں تشنہ خودی بھی، محروم بیخودی بھی!
اپنے وہ کم نظر ہیں کچھ اپنے بر ہی بھی!
آئی تھی جو زباں پر وہ بات دل میں ہی تھی!
میری ہی چوٹ دل پر ہے کبھی لگی تھی؟
واعظ تجھے قسم ہے ٹھہرے یہیں آج چلی تھی!
وجہ سکون دل ہے اب ان کی بے رخی بھی
نرغہ دل ہی تو دل بھی، دل کی شگفتگی بھی
عاشق کیا مجھی پر الزام ہے خودی بھی!
کانٹا بھی، رنگ و بو بھی اور پھول کی کلی بھی
آغاز عاشقی بھی، انجام عاشقی بھی!
آئین بندگی میں پائی کبھی کمی بھی؟!

رباعیات

ہر بزم میں اک حسنِ ادب پیدا کر
ہر رنج میں اک رنگِ طرب پیدا کر
ماضی سے بہرحال یہ حال اچھا ہو
جینا ہو تو جینے کا سبب پیدا کر
شفیع دکنی

ماحول بنا اور سکوں خیز بنا
اپنے لئے سب کچھ طرب انگیز بنا
جینا ہی تو آئینِ گنہگاری سیکھ
ہر سانس کو رنگین و دل آویز بنا
حمید دہلوی

بیزار ہیں کیوں تجھ سے زمانے والے؟
اے شاہد و مے سے لو لگانے والے
اللہ بتوں کو تجھ پہ مفتوں کر دے
منہ پھیر کے اے حرم سے جانے والے
جوش ملیح آبادی

دکھ درد میں اوروں کا جو غمخوار نہ ہو
بے یار و مددگار کا جو یار نہ ہو
جنت تو ملے اسکو مگر اے اخگر
جنت میں خدا کا اسے دیدار نہ ہو
اخگر مرحوم

رُخِ میکدۂ ازل سے موڑا ہم نے
وہ جامِ الست آہ توڑا ہم نے
بے پیرِ مغاں ہے دورِ بادہ بے کیف
افسوس مے کہن کو چھوڑا ہم نے
محمود اسرائیلی

گو گر رہی ہے تیزی سے ترقی دُنیا
اور قابلِ صد رشک ہے اب بھی دُنیا
جس روز کہ تکمیل ترقی ہو گی!
اللہ یہ اس روز بھی ہو گی دنیا؟
وقار واثقی

اے روشنیٔ چشم آفتاب و قمر!
سرچشمۂ نور خالقِ اہلِ بصر!
دیکھوں میں تجھے اس نظر سے دیکھوں
جیسا اپنی نظر سے آپ اوجھل ہو نظر
محمود اسرائیلی

پُر کیف سماں ہے بیخودی ہے ساقی
آنکھوں میں محبت کی نمی ہے ساقی!
ہر جرعہ میں لے رہا ہے کروٹ اک دل
ہر جام میں اک زندگی ہے ساقی
اظہار ملیح آبادی

کیوں بات بناتے ہیں سخن کے بندے
بھولیں گے چمن کو نہ چمن کے بندے
ہر چند ہوں آزار و الم اے ماہر
خوش اپنے وطن سے ہیں وطن کے بندے
ماہر اکبر آبادی

یہ سچ ہے کہ زینت ہے چمن کی تجھ سے
بازی ہی لگی چرخِ کہن کی تجھ سے
کر حوصلہ کچھ اور وطن کے حامی!
واللہ! حفاظت ہے وطن کی تجھ سے
ماہر اکبر آبادی

گردوں پہ ہے اس ظلم کی تصویر ابتک
ہوتی ہے اُسی شام کی تشہیر ابتک
یہ بدر نہیں کاہکشاں کے نزدیک
نیزے پہ الم ہے سرِ شبیر ابتک
حمید دہلوی

نامردی کا مکمّل سائنٹفک علاج

وہ طریقہ علاج جسے دُنیا کے بیس ہزار ڈاکٹروں اور ماہرین نے تسلیم کیا ہے

کھوئی ہوئی طاقت اور قوّتِ مردمی کے حصول کی گارنٹی

سالہا سال کی ریسرچ کے بعد مشہور عالم انجمن ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین نے طاقت مردمی کے حصول کے لئے وہ طریقہ علاج تجویز کیا ہے جس نے طبی دُنیا میں ایک نئی روشنی پیدا کر دی ہے۔ اس طریقۂ علاج کو دنیا کے بیس ہزار سے زائد ڈاکٹروں نے تسلیم کیا ہے اور انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے گارنٹی کی گئی ہے۔ کہ مریض کو مکمل صحت اور از سرِ نو جوانی صرف اسی طریقہ علاج سے مل سکتی ہے۔

ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا یہ طریقہ علاج سائنٹفک اصول پر مبنی ہے۔ ہزاروں اشخاص جو بچپن کی غلط کاریوں اور جوانی کی بداعتدالیوں سے نامرد ہو چکے تھے۔ یا نامردی کی منزل کیطرف جا رہے تھے۔ اس طریقۂ علاج سے مکمل صحتیاب ہو کر از سرِ نو مسرت اور جوانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کا دعویٰ ہے کہ اس علاج سے ساٹھ سال کا بوڑھا بھی قوتِ مردمی کے لحاظ سے پچیس تیس سال کا جوان بن سکتا ہے۔

طریقہ علاج:- نامردی کا علاج مندرجہ ذیل چار ادویات سے کیا جاتا ہے:-

برنول ایکس } اسے پہلے ہفتہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے بڑھی ہوئی حس دُور ہو کر خون کا دورہ نارمل حالت پر آجاتا ہے قبض، بدہضمی دور ہو جاتی ہے، جلق کی عادت چھُٹ جاتی ہے اور جسم مزید علاج کیلئے تیار ہو جاتا ہے، یہ دوائی مسکن ہے۔ اور بیخوابی اور چڑچڑاپن دُور کرتی ہے۔

سیمینول } دوسرے ہفتہ سیمینول استعمال کیا جاتا ہے۔ منی کی تمام شکائتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ مادہ تولید کا پتلا پن، جریان، احتلام، سرعت انزال، جراثیم، منی کی کمزوری وغیرہ دور ہو کر منی اور پیشاب کی ایک سو بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں۔

وِنے ٹون گولڈ } اسے تیسرے اور چوتھے ہفتہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر قسم کی کمزوری دُور ہو کر طاقت مردمی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے ۲۴ قسم نامردی کے روگ دور ہو جاتے ہیں۔ رگ رگ میں جوانمردی اور طاقت آجاتی ہے۔ اعضا رئیسہ از سرِ نو جوان ہو جاتے ہیں۔ نیا خون پیدا ہو کر چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے، قوتِ حافظہ، قوتِ بصارت بڑھ جاتی ہے۔ اسے استعمال کرنیکے بعد تمام عمر قوتِ مردمی کیلئے کسی دوا کی ضرورت نہیں رہتی۔

گلینس طلاء } اسے بھی تیسرے اور چوتھے ہفتہ بیرونی مالش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عضو کی کجی لاغری، ڈھیلا پن، سُستی، رگوں کا پھُولنا سب شکائتیں دُور ہو کر قدرتی سختی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام گندہ مادہ پسینہ کے ذریعہ خارج ہو کر عضو اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔

اوپر کی چار ادویات نامردی کا مکمل علاج ہیں۔ ان کے استعمال سے نہ صرف نامردی اور کمزوری دُور ہو جاتی ہے۔ بلکہ ایسی طاقت اور جوانی پیدا ہو جاتی ہے جو ہمیشہ کیلئے زندگی کو پُر مسرت بنائے رکھتی ہے۔ مکمل کورس قیمت بارہ روپے۔ محصولڈاک مکمل کورس منگوانے پر نہیں لیا جاتا ہے۔ یہ دوائیں حسبِ ضرورت الگ الگ بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔ قیمت برنول ایکس دو روپے، سیمینول ڈو روپے آٹھ آنے، وِنے ٹون گولڈ چھ روپے، گلینس طلاء فی شیشی چار روپے محصولڈاک علیحدہ۔

خط و کتابت ہر ایک زبان میں کیجا سکتی ہے

ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۱۴۲ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ فورٹ بمبئی

فردوسِ خیال!

از جناب رفیق غازی صاحب سیالکوٹی

"فردوس خیال" کے عنوان سے ذیل کا دلچسپ مضمون محترم رفیق غازی صاحب سیالکوٹی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ غازی صاحب موصوف کو قدرت نے ذوقِ سلیم کی وافر دولت عطا کی ہے اس لئے وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں خامہ کے مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔
انشا میں فارسی ترکیبیں جو حُسن پیدا کرتی ہیں وہ اربابِ ادب سے پوشیدہ نہیں اور غازی صاحب کے ہاں بکثرت ان کا استعمال ہے پس "فردوس خیال" ہر لحاظ سے انشا کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ نفسِ مضمون کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ غازی صاحب نے خلوت میں جلوت کا رنگ خوب بھرا ہے یعنی غالب مرحوم کے اس شعر کی تشریح کردی ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

(ایڈیٹر)

اس عالمِ اسباب میں انسان ہر قدم پر غیر متوقع حوادث سے دوچار ہوتا ہے جن میں بعض تو ایسے غیر محسوس ہوتے ہیں جو ہمیں کم متاثر کرتے ہیں۔ مگر بعض حوادث کا تأثر اس درجہ شدید رونما ہوتا ہے جو ہماری زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری زندگی انہی غیر متوقع حوادث سے عبارت ہے۔ مثال کے طور پر والد صاحب کے حینِ حیات میں زندگی کے جس راستے پر میں گامزن تھا اس کی خلد بر در فضاؤں اور آرام طراز راحتوں نے کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ میں زندگی کے تاریک گوشوں کو جھانک کر ہی دیکھ سکتا یا اتنا سمجھ سکتا کہ جوم کا یہ راستہ کہیں مجھے ترکستان نہ لے جائے۔ عیش و تنعم کی رنگین بہاریں میری پرورش میں صرف ہوتی جارہی تھیں۔ اور میں سرشارِ انبساط اوقات کے جھولے میں جھول رہا تھا۔ اس وقت میں سمجھ رہا تھا کہ یہ لمحاتِ عیش غیر فانی ہیں۔ طلعتِ فخر و ناز میرے لئے مقرر ہو چکی ہے۔ زندگی کی راحتیں ہمیشہ کے لئے مجھ سے وابستہ ہو چکی ہیں۔ مگر والد مرحوم کے قلب کی حرکتیں سکون آشنا ہوتے ہی میرے شبستانِ حیات کی تمام قندیلیں بجھ گئیں۔ زندگی کے راستے پر رات کی بھیانک تاریکی مسلط ہوگئی۔ میں اس فوری انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شفیق باپ کی موت نے زندگی کا رُخ بدل ڈالا۔ اب جو غور کیا تو حقیقت کو ریگزارِ سراب کی موجوں کا رقص پایا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ زندگی پریشانیوں کے مجموعے کا نام ہے اور بس۔ مجھ پر ذمہ داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پہلے تو یہ الجھاؤ احساسِ درد کی تخلیق کا باعث بنتے رہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ طبیعت مانوس ہوتی چلی گئی۔ اس حالت میں بھی ماضی کے رنگین نقوش میری آنکھوں میں کیف پیدا کردیتے۔ اور دل درد کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ جی میں چاہتا کہ حلقۂ احباب میں گزری ہوئی دلچسپیوں کی کہانی کہتا رہوں۔ اور وہ مجھے مستقبل کی کامگار امیدوں سے بہلاتے رہیں۔ لیکن حالات میری امیدوں کے خلاف بدلتے ہی چلے گئے اور میری پریشانیاں شاہینِ وقت کے پروں پر بلند ہوتی رہیں۔ نجی اُلجھنوں کے سلجھاؤ کی تدابیر میں کسی قاتل کو بے گناہ ثابت کرنے والے وکیل کی طرح گھنٹوں بحرِ فکر میں غرق رہتا۔ یہ استغراق میری تعلیمی سرگرمیوں پر بُری طرح اثر انداز ہوا۔ حالات نے مساعدت نہ کی اور وقت گزرتا چلا گیا۔

(۲)

زندگی میں بعض واقعات کچھ اس طرح غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کا اثر انسانی زندگی پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اور بعض حالات میں زندگی خود بخود اپنا راستہ بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ جولائی کا تابستانی موسم خلافِ معمول حدت آفریں تھا۔ مہرِ نیمروز پوری تمازت کے ساتھ دمک رہا تھا۔ میں ایک نجی کام سے فارغ ہو کر لاہور چھاؤنی سے گھر کی طرف سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا۔ گرمی کی شدت سے میرا جسم پسینہ میں تربتر ہوگیا۔ پریشان خیالی میں چلچلاتی ہوئی دھوپ گویا آگ پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ میں نے اس خیال سے سائیکل کی رفتار تیز کردی کہ ہوا کے تیز جھونکے شاید کچھ تسکین کی صورت پیدا کردیں۔ تھوڑی دور تک تو یہ کیفیت طاری رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ گرم ہوا کی شدت نے احساس میں نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔ اور میرا سر چکرانے لگا۔ شاید میں نے رفتار کا غلط پہلو اختیار کرلیا۔ اتنا یاد ہے کہ سامنے سے ایک موٹر آرہا تھا جس سے میرا تصادم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین پستی سے بلندی کی طرف اُٹھی اور آسمان اوپر سے نیچے کو آرہا۔ موٹر کی گڑگڑاہٹ نے کسی خوفناک اور مہلک زلزلے کا تصور پیدا کردیا۔ سائیکل ہوا میں بلند ہوگیا۔ اور میں نہ جانے کہاں ــــــ مجھے کچھ علم

نہیں کہ میرا کیا حشر ہوا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میں بیگانۂ ہوش تھا۔

(۳)

ڈاکٹر کارل ولیکلنڈ کا قول ہے کہ زندگی کے راستے میں موت ایک معمولی سا سانحہ ہے جس سے روح ایک حالت سے دوسری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اسی انتقالِ روح کا نام موت ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط مجھے اس سے بحث نہیں! البتہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک سنہری پلنگ پر پڑا فردوسی اثمار سے لدے ہوئے اشجار کو دیکھ رہا تھا۔ معاً میرے دل میں حیات بعد الموت کا خیال پیدا ہوا۔ اور میں یہ سوچنے لگا کہ یہ منظرِ حسین جنت ہی سے متعلق ہو سکتا ہے لیکن محاسبۂ اعمال سے پہلے یہ ابدی راحت کیا معنی۔ شاید قیامت کے انتظار میں یہ وقفہ راحت ہر روح کو مقدر ہوتا ہے تو پھر یہ جنت نہیں اور اگر فی الواقعہ جنت ہے تو خدمتگذار حوروں کا وجود لازمی ہے۔ اسی اثنا میں پشت کی طرف سے نسیم کی ہلکی جنبش محسوس ہوئی جس نے قلب و روح میں شگفتگی پیدا کر دی۔ اور ایسا محسوس ہوا جیسے کسی انسانی تنفس کے تحرک نے شمیم کو گدگدا دیا ہے۔ فضا میں توج کی رفتارِ قلب کی حرکت کا پتہ دے رہی تھی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اپنے ذہنی تصور کی تصدیق کے لئے میں نے پہلو بدلا۔ اور بیشتر اس کے کہ میں کسی وجود کی موجودگی کا اظہار کروں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرا نرم و گداز منقوش پلنگ فی الواقعہ ایک خوبصورت و دلکش باغ میں تھا۔ باغ کی مصفا روشیں۔ پھولوں کے قطعے۔ اشجار کی ترتیب۔ اور کنجوں کی تراش انسانی ہاتھ کی مرصع کاری کا پتہ دے رہی تھی۔ نوشگفتہ پھول۔ بند غنچے۔ طباشیری لبتہ اور منور شگفتہ کلیاں جا بجا دعوت کیف و رنگ دے رہی تھیں۔ مگر بغور دیکھنے پر شاخِ گلبن پر بھورے رنگ کے جوان اور سیاہ رو کانٹے بہ افراط نظر پڑے جنہیں دیکھ کر مجھے مایوسی کا احساس ہونے لگا۔ اگر یہ جگہ فی الواقعہ فردوس ہے یا عالم بالا سے متعلق ہے تو فطرت کی صناعی کا منشا، جمال دوام اور ابدی نفاست ہی ہونا چاہئے۔ پھولوں کا وجود تو خیر جنت نگاہ ہے ہی۔ مگر خلش نگاہ کانٹوں کو کیوں پیدا کیا گیا۔ سامان مدافعت و حفاظت کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں آزار کا احتمال ہو۔ ؏

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

شاید یہ جگہ موعودہ جنت نہ ہو بلکہ جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہے میرے ذہنی تصور کی تخلیق ہو لیکن جب میری انگلیوں نے آنکھوں کو مس کیا تو یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کیونکہ ذہن بقائے جسد کا قائل ہو چکا تھا۔ باغ کے وسط میں ایک ہشت پہلو حوض تھا جو فوارے کے سیمیں پانی سے لبریز تھا۔ اس میں ننھی ننھی یاقوت رنگ اور زمرد فام مچھلیاں تیرتی پھر رہی تھیں۔ میری نگاہیں فوارے کے پانی کی افتاد کے ساتھ چھوٹی چھوٹی لہروں پر رقص کرنے لگیں۔ جذبات میں انگڑائی کی کیفیت پیدا ہوئی اور دماغ دل کی طرح دھڑکنے لگا۔ دل نے کہا ؏

ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو؟

کیا ہو یہی کہ اس نامکمل نقش کی تکمیل ہو جائے۔ منظرِ پیش بیں گویائی کا رنگ بھر جائے اور فضا نغموں سے گونج اٹھے۔ شمیم روح نواز میں روحِ ناطقہ پیدا ہو جائے۔ دل میں رفتہ رفتہ آرزو کی خلش پرورش پانے لگی۔ اسی اثنا میں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مطرب کے زخمہ نے سازِ خاموش کی تارِ دل کو چھیڑ دیا ہو اور کسی کے نطق کی رعنائیاں مجھے خواب سے بیدار کر رہی ہوں "اصغر صاحب! کیسی طبیعت ہے؟" نسیم کی ایک موج منشائے سماعت سے ٹکرا کر رہ گئی۔ پہلو بدل کر دیکھا تو ایک حور کو مصروفِ خدمت پایا، جس کے مرمریں ہاتھ میں جالیدار جھالر کا پنکھا حرکت کر رہا تھا۔ اتصالِ نگاہ نے یہ حرکت بند کر دی۔ "میں کہاں ہوں —— آپ کون ہیں —— یہ جگہ ——" میں کچھ نہ کہہ سکا "نہ گھبرائیے۔ ضعف تو نہیں" اپنے مضطرب کلمات کے جواب میں شاید میں یہی سمجھ سکا۔ اور میری نگاہیں محرابِ جمال کا بوسہ لے کر سجدہ ریز ہو گئیں۔

(۴)

میں ہمہ تن تماشا بنا محوِ تماشہ تھا کہ نرگسِ ناز آفریں جمائیاں لیتی ہوئی بصد تمکنت و ناز اٹھی۔ سنبل مارِ پیچیدہ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگی۔ شاخیں فرطِ مسرت سے مستانہ وار جھومنے لگیں۔ گلہائے رنگین بصد رعنائی و دلربائی و فورِ انبساط میں ایک دوسرے کا منہ چومنے لگے۔ ننھی کلی سہانے روپ میں لپٹی ہوئی شاخوں کا جھولا جھلانے لگی۔ اور اپنے عریاں جوبن اور نیم نگاہی سے کائناتِ چمن کو مسحور کر دیا۔ لالے نے قبائے رنگیں کو پھاڑ ڈالا۔ طیورِ نغمہ ریز نے بصدائے دلآویز نغمہ سرائی شروع کی۔ لمحہ بہ لمحہ بادِ شمیم ہلکے ہلکے سروں میں گاتی ہوئی آتی اور گلہائے رنگین اور شاخہائے باردار سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی نکل جاتی۔ میں حیران تھا کہ کائناتِ چمن میں یہ فوری انقلاب کیوں؟ چند لمحات کے بعد سبکرو عنبر آگیں جھونکوں کے ساتھ ساتھ کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ جذبِ سماعت ہوئی بالکل میرے دل کی دھڑکن کی طرح۔ جوں جوں آواز نزدیک آتی دل کی دھڑکن اور تیز ہوتی جاتی۔ میں سراپا گوش بنا بیٹھا تھا کہ ایک حور تمثال شیریں مقال سفید حریری لباس میں ملبوس میرے سامنے ایک موجِ برقِ تپاں کی طرح آ کھڑی ہوئی۔ نزاکت پاؤں میں بکھری جا رہی تھی۔ سادگی بہ ہزار بانکپن قربان ہو گئی۔ شاخوں نے جھک جھک کر پاؤں چومے۔ پھولوں نے ہنس ہنس کر جوانی لٹا دی۔ غمزہ و ادا میں پلی ہوئی نرگس آنکھ کے ایک ایک اشارے پر قربان ہو گئی۔ کلیوں نے حسن و جمال کی متاعِ بیش بہا کو نچھاور کر دیا۔ گویا حسن دلفریب کا ایک مرمریں مجسمہ تھا جو بہ ہزار ناز و انداز میرے سامنے آ کھڑا ہوا جس کی ہر ادا پر قدرت کی ہزار رنگینیاں قربان ہو رہی تھیں۔ اس لعبتِ چین، نازک پتلی کے حسن و جمال کے مقابلے میں گلرخانِ فرخار کی صباحت اور ماہ سیمایانِ فرنگ

ملاحت ہیچ تھی۔ وہ بتِ طناز، سراپا ناز ہلال آسا جھکی۔ سلام کیا اور ایک امتیازی فخر و ناز سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کی نرگسی آنکھیں تابندہ ستاروں کی جھلملاتی روشنی کی طرح تمتما رہی تھیں گویا نور کا میخانہ تھا جو حلقۂ چشم سے اُبل رہا تھا۔ عنبر بار زلفیں رُخِ تاباں کے اردگرد مارِ سیہ کی طرح لہرا رہی تھیں۔ پھر بصد ناز و ادا پوچھا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے اپنے مسلوب قوار پر غلبہ پاتے ہوئے کہا۔ "خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔"

"شکر الحمد للہ۔" اس ماہ کامل نے کہا۔ اور ساتھ ہی عقیق گوں لبوں پر مسکراہٹ کی ایک بے پایاں لہر دوڑ گئی۔ گویا کائناتِ چمن کی ساری رنگینی سمٹ کر اُس کے لبوں میں آ گئی تھی۔ اس کے گوہر وش دانتوں کی سپیدی اس کی رعنائی و زیبائی کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اس نے اپنے دستِ سیمیں کو بڑھایا اور میرے بازو کو تھامتے ہوئے کہا۔ "چلئے کچھ ناشتہ کر لیجئے۔"

میں اُٹھا اور اس سحرِ مجسم کے ساتھ ہو لیا۔ اس کے قرب سے میں راحت سرمدی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے نگاہ اُٹھائی اور اپنے سامنے ایک سربفلک عالیشان عمارت کو کھڑے دیکھا۔ چند قدم چلنے کے بعد صدر دروازے کی راہ سے اندر داخل ہوئے۔ عالیشان کمرے تعیش و آرام کے جملہ سامان سے مزین تھے۔ جابجا صوفے اور مونڈھے جمے ہوئے، مخملیں فرش پر چاندنیاں بچھی ہوئی کہ آنکھیں دیکھ کر خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ یہ سب سامان زیب و زینت مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن جب میں نے اس عابد فریب، عدوئے صبر و شکیب کے حسین چہرے پر نگاہیں مرکوز کیں تو دیکھا کہ اس کا دل عشرتِ ذہنی اور تعیش جسمانی سے سیر معلوم ہوتا تھا۔ مختلف کمروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچے جو شاندار میز کرسیوں سے آراستہ تھا۔ بڑی میز کئی رنگارنگ کھانوں سے مزین تھی۔ میں حیرت و استعجاب میں غرق ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک خادمہ چلمچی لے کر آگے بڑھی اور میرے ہاتھ دھلائے۔ میں نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ نوالہ مُنہ میں ڈالا تو اس میں اس قدر تلخی تھی کہ میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ کھانے کو سونگھا تو اس میں سے گناہ کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے خیال کیا۔ "جنت اور گناہ دو متضاد چیزیں ہیں۔" خوف نے مجھ پر اختلاجی کیفیت طاری کر دی۔ میرے اعضا مسلوب اور دماغ ماؤف ہو چکا تھا اس نے میری کیفیت دیکھی تو کہا۔

"کیوں اصغر صاحب! آپ نے کھانے سے ہاتھ کیوں اُٹھا لیا؟"

میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں اور یہ سب کچھ کیا ہے؟"

اس حورِ طلعت نے حیران کن نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"آپ گھبرا کیوں گئے؟" یہ کہتے ہوئے محبوبانہ اور دلربایانہ انداز سے اُٹھی اور ہر چیز کو جالِ مبین کا فریفتہ اور شیدا بناتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور کھڑکی کھول اس میں کھڑی ہو گئی۔ میں بھی اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب میں نے کھڑکی میں سے مخلوق خدا کو اِدھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھا۔ وہ حور شمائل اک قریب جو بغور میرے چہرے کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف استفسارانہ نگاہیں اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "میں تو عالم علوی میں تھا۔ یہ کونسی جگہ ہے اور آپ کون؟"

وہ میرے اور قریب آ گئی۔ اس کے تنفس سے مجھ پر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔

"آپ دنیائے فانی میں ہیں اور آپ اس جگہ عالم بیہوشی میں لائے گئے تھے۔"

اس نے یہ کہا اور میری آنکھوں کے سامنے وہی موٹر کے حادثے کا نقشہ پھر گیا۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

وہ زاہد فریب صوفے پر غمزدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ گویا میرے ان الفاظ نے اس کے سازِ دل کی خاموش تاروں کو مضراب آشنا کر دیا تھا جس میں سے سوز و کرب میں ڈوبے ہوئے نغمے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے تھے۔ وہ بتِ زہد شکن، جو چند منٹ پیشتر ایک شگفتہ پھول کی طرح لہلہا رہی تھی غم و اندوہ کا ایک مجسمہ بن کر رہ گئی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"آپ نے پوچھا ہے میں کون ہوں؟" اگر آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں کون ہوں تو شاید آپ کو افسوس ہو گا۔ لیکن چونکہ آپ نے پوچھا ہے اس لئے بتائے دیتی ہوں۔

"میں ایک مغنیہ ہوں، سوسائٹی کا ایک بدترین اور قابل نفرت عضو۔ شاید آپ میری ظاہری ہیئت سے دھوکہ کھا رہے ہوں۔ بہرکیف جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حقیقت ہے لیکن تلخ جس کی تلخی نے میری زندگی کو بے لطف اور بے ربط بنا دیا ہے۔" —— وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "آپ نے ایسی زندگی کیوں اختیار کی؟"

اس نے ایک آہ سرد بھری اور کہا۔ "یہ ایک طویل اور اندوہناک داستان ہے جس کا انجام خدا جانے کس قدر دردناک اور بھیانک ہو گا!" اس نے یہ کہا ہی تھا کہ دوسرے کمرے میں زور کا دھماکا ہوا۔ ہم دوڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ نوجوان مسلوب الاعضا اور پژمردہ رُو فرش پر پڑا تھا۔ اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے مُنہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ طلعت نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"اصغر! یہ ہے میری برباد شدہ زندگی کا بھیانک عکس —— میری خوں آشام آرزوؤں کا ڈراؤنا افسانہ اور تلخ حقیقت کا اندوہناک باب میری پژمردہ تمناؤں کی روئداد الم ——!"

یہ کہتے کہتے وہ غش کھا گئی اور طلعت کی روح فرسا اور سوز و کرب میں لپٹی ہوئی کہانی کا دلدوز انجام میری آنکھوں کے سامنے رقصاں تھا۔ ؎

تیری زندگی کا حاصل غم و رنج و یاس و حرماں
تیری ابتدا یہی تھی تیری انتہا یہی ہے

دامن گلچیں!

از ادارہ "مشہور"

دامن گلچیں "مشہور" کا ایک خاص موضوع ہے اور اس نے اپنی سنجیدہ ظرافت سے حجرہ نشین زُہاد کے لب پر بھی مسکراہٹ پیدا کر دی ہے۔ معانی آفرینی اس مضمون کی جان ہے، اس لئے بے صبری کے ساتھ ہر مہینے اس کا انتظار رہتا ہے۔ اس کے رائیٹر ابو الجمیل حکیم مقرب حسین صاحب مقرب دہلوی ہیں۔ جو مجھے ایک حقیقی بھائی کی طرح عزیز ہیں "مشہور" کو ان کی لٹریری خدمات پر فخر ہے

(ایڈیٹر)

ہمیں گندم نہ ملنے کا تو کوئی افسوس نہیں ہے، مگر فکر یہ ہے کہ گندمی رنگ کی بہار بھی ختم ہو رہی ہے اور کم بخت باجرئی رنگ پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہو رہا ہے۔ یہ رنگ دیہاتی حُسن کا آئینہ دار ہے۔ اور اتنا پختہ ہے کہ اڑنے کا نام تک نہیں جانتا، مرزا غالبؔ مرحوم نے خدا جانے کس دُھن میں یہ شعر کہا تھا ؎

ہو کے عاشق وُہ پری رو اور قاتل بن گیا،
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ کھاتا جائے ہے

خدا جانے شہر والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ باجرہ پر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں حالانکہ باجرہ ایک ایسی لطیف غذا ہے جو مستقلاً کھائی جائے تو قوتِ پرواز پیدا کر دیتی ہے۔

اِس نئی تحقیق پر آپ متبسم نہ ہوں۔ باجرہ پرندوں کی مرغوب غذا بھی ہے، ہو سکتا ہے کہ باجرہ کے تیل میں پٹرول کی خاصیت ہو۔ دلّی کے کبوتر بازوں سے استفسار فرمائیے تو وہ شاید اِس مسئلہ پر کافی روشنی ڈال سکیں، مگر یہ ہم تجربہ کی بات کہتے ہیں کہ اختتام جنگ تک اگر آپ باجرہ کھاتے رہیں تو مجسم ایروپلین بن جائیں گے۔

"گیہوں نہیں ملتا" یہ برکات جنگ کے قصیدہ کا مطلع ہے اور اتنا مقبول ہے کہ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کیا؟ یہ آپ کا مقولہ نہ تھا کہ گیہوں کی روٹی کو فولاد کا پیٹ چاہیئے، جس کا مقصد یہ ہوا کہ ٹینک بن جائیے تب گیہوں کھائیے، سالہا سال سے آپ گیہوں کھا رہے ہیں، مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ آپ کے ہاتھ فولادی ہو گئے ہوں اور آپ نے ہٹلر سے پنجہ لڑایا ہو۔ بلکہ الٹا اثر ہوا۔ عشق و محبت کی پینگیں بڑھی اور ہر گلی کوچہ سے یہ آواز آتی ؎

ایک میں نہیں ہوں شیفتہ رنگِ گندمی
اوپر سے ہوتی آتی ہے آدم کو دیکھئے

اچھا "انقلاب زندہ باد" کے نعرے وہ آپ ہی تو ہیں جو لگاتے رہتے ہیں۔ پھر جس کی آمد کے منتظر تھے وہ آ گیا۔ یعنی جو لوگ گیہوں کھایا کرتے تھے، اب وہ جوار، مکئی، باجرہ کھا رہے ہیں۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔

"گندم اگر بہم نرسد بھُس غنیمت است" ہے تو درست مگر قباحت یہ ہے کہ باجرہ کھا کر آپنے ادائے شکر کی کوشش کی تو ساری عمر باجرہ کھانا پڑے گا، کیونکہ اللہ میاں کی عادت ہے کہ وہ ادائے شکر پر شکرانہ والی شئے کی ریل پیل کر دیا کرتے ہیں۔

ایک ادیب کا مبلغ علم ملاحظہ ہو:-

وہ ایک مجلس ادب میں لفظ "ندوی" کی تحقیق میں یوں گل افشانی فرما رہے تھے،

"ندوی" ندویہ سے ترکیب پائی ہوئی ایک اضافی صفت ہے۔ روز و شب اس کی مثالیں آپ کی نظر سے گذرتی رہتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ "ندویہ" کیا بلا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ایک خاندان کا نام معلوم ہوتا ہے۔ جیسے سہروردیہ۔ قادریہ چشتیہ۔ نقشبندیہ وغیرہ وغیرہ۔ پھر جس طرح ان خاندانوں کے متوسلین اپنے آپ کو سہروردی۔ قادری۔ چشتی، نقشبندی لکھتے ہیں۔ اسی طرح ندویہ خاندان کے لوگ خود کو ندوی لکھتے ہیں،

سبحان اللہ۔ اس نادر تحقیق پر ادیب صاحب کا منہ

چوم لیا جائے اور حضراتِ صوفیہ کو مبارکباد دینی چاہیئے کہ آپ کے
چار سلسلوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔

نیز سلسلہ عالیہ ندویہ کے موجودہ پیر طریقت حضرت مولانا
مولوی سید سلیمان صاحب ندوی سے ہم التماس کریں گے کہ وہ
دار المصنفین اعظم گڈھ کے لئے ان ادیب صاحب کی نادر معلومات
سے فائدہ اٹھائیں۔

ایک محترمہ صاحبہ لکھتی ہیں:۔
ذرا آپ مردوں کی ہٹ دھرمی ملاحظہ کیجئے کہ خود تو پبلک
جلسوں میں انگریزی کی ٹانگ توڑتے رہتے ہیں اور ہم عورتوں کو یہ
تاکید ہے کہ قال اللہ و قال الرسول کے سوا کچھ زبان سے نہ نکالیں
گویا انگریزی زبان عورتوں کے لئے شجر ممنوعہ ہے۔

میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کسی غیر زبان کی تحصیل کوئی گناہ
ہے۔ ان مردوں کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں کہ ایک ہی چیز اپنے لئے
حلال اور ہمارے لئے حرام ہے

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہیں
مجھ سے کہتے ہیں کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

پردہ کی بحث تو اب پرانی ہو چکی ہے اور عورتوں نے اس
معاملہ میں مردوں کو شہ مات دے دی ہے۔ اب وہ کھلے بندوں سنیما ہاؤس
کلب گھر۔ دفاتر وغیرہ میں جاتی ہیں اور آزادی کے ساتھ اپنے کام
خود کرتی ہیں۔ کیونکہ اپنا کام آپ ہی خوب ہوتا ہے۔

محترمہ۔ آپ کے خط کا آخری فقرہ بہت ہی خوبصورت
اور وزن دار ہے، انا الحق کا دعوا کرنے والا منصور حلاج ایک مرتبہ
نماز پڑھ رہا تھا، کسی نے کہا تم تو خدا ہو، اپنی نماز آپ پڑھ رہے
ہو، یہ کیا بات ہے۔ منصور نے کہا، بے وقوف؟ اپنا کام آپ ہی
خوب ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح آپ نے بھی فرمایا، مگر منصور کا یہ جواب حقیقت
سے کوسوں دور تھا۔ آپ فطرت کا وہ سربمہر لفافہ ہیں جسے ملفوف
ہی رہنا چاہئے۔

شعراء نے کلی کی تعریف پھول سے زیادہ کی ہے۔ بے حجاب
حسن کی قدر نہیں ہوتی۔ جس پہیلی کی بوجھ پیچ در پیچ نہ ہو اس کے
حل کرنے میں کوئی لطف نہیں۔ اگر طبیب نسخہ میں "شب در آبگرم
تر داشتہ صبح صاف کردہ بنوشد" کی بجائے رات کو گرم پانی
میں بھگو کر صبح چھان کر پی لیں۔ لکھ دیا کریں تو نسخہ کی اہمیت جاتی
رہے۔ پس جس قدر آپ کھلینگی فطرت کی صناعی کا خون ہو جائے
گا۔ اور آپ ایک معمولی چیز بن کر رہ جائینگی۔ اب رہا تقسیم کار کا سوال
وہ ازل سے منقسم ہو چکا ہے۔ کہ مرد کمائے اور آپ اس کمائی کو حسنِ
انتظام کے ساتھ صرف کریں۔

جب سے چینیوں اور جاپانیوں کی لڑائی شروع ہوئی
ہے۔ تعجب نہیں کہ جاپانی زیادہ مقدار میں چینی (قند) کھاتے
ہو۔ اور اس خیال سے کھاتے ہوں کہ مخالف کا نام اس میں شامل
ہے، ممکن ہے کہ وہ اور زیادہ برافروختہ ہو جس طرح ہمارے ہاں
کے بچے اپنے مخالف بچوں کو یہ کہکر جلاتے ہیں:۔

"جلے کو جلائیں گے۔ نون مرچ لگا کر کھائیں گے"

مگر یہ تو ایک لفظی خیال آرائی ہے۔ البتہ جو بات قابل غور
ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں چینی کا بھاؤ بہت تیز ہے۔ اور
وہ کنٹرول کے ذریعہ سے مل تو جاتی ہے مگر بڑی دقتوں کے ساتھ۔

کیا؟ ہم لوگ ایسا نہیں کر سکتے کہ چینیوں کی ہمدردی
میں چینی کھانا چھوڑ دیں۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ زیادہ مٹھاس
کھانے سے جو احتراق خون کی شکایت ہو جاتی ہے نہ ہوگی اور کچھ عرصہ
کے بعد شاید چینی عام طور پر سستے نرخ سے ملنے لگے۔

لفظ "بالا" فارسی ہے اور اس کے معنے اُردو میں "اونچا"
کے ہیں۔ اگرچہ اُردو میں لفظ "بلند" بھی بولتے ہیں مگر بلند بھی فارسی ہے اور
اُردو والوں نے زبردستی ہتھیا لیا ہے۔ بہرحال جب لفظ "بالا" میں یائے
نسبتی لگا کر "بالائی" کر دیا جائے تو پھر اس کی اونچائی ناپی نہیں جاسکتی
بلکہ کھائی جاتی ہے۔

بالائی آمدنی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ناجائز طریقہ سے پیدا کیجائے
اور شیر فروش کی نذر کر دی جائے۔۔۔۔۔ یعنی حق بحق دار رسید۔

مگر واضح ہو کہ اس آمدنی کے ذرائع ہر کس و ناکس کے لئے نہیں ہیں
یہ اونچی آمدنی اونچی قسمت والوں کے لئے ہے ع

ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

ہم جیسے لٹریری خدمت کرنے والوں کے مقدر میں کہاں۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر ٹیگور بحیثیت نغمہ نگار

انگریزی سے ترجمہ

از جناب قیصر عثمانی صاحب پبلسٹی آفیسر
فضلی برادرس لمیٹڈ بمبئی

موجودہ بنگلہ ادبیات میں شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے بلند پایہ گیت بلاشبہ ایک انقلابی حیثیت کے حامل ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ٹیگور کی شاعرانہ عظمت کے ظہور میں آنے سے قبل بنگال میں عمومی طور پر جو گیت رائج تھے وہ یا تو باول Bawl بھتیالی Bhatiali اور کیرتن Kirtan تھے یا کلاسیکل گانے جو اسوقت صرف جاہل اُستادوں کے لئے مہر بہ لب خزانہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان دنوں خیالات کی پُرکاری اور بلندی سے بنگلہ گیتوں کو کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف ایک معمولی گیت کو موسیقی کے پلیٹ میں لے آنا ہی تکمیل فن کا ثبوت سمجھا جاتا تھا اور یہ موسیقی میں تبدیل کئے ہوئے گیت یا تو محض دیہات کی فضا اور ماحول کی تصویر کشی کرتے تھے۔ یا پھر صرف وہ کلاسیکل موسیقی کی حیثیت رکھتے تھے۔

بنگلہ گیتوں میں ڈاکٹر ٹیگور کے گیت بلاشبہ دَورِ نہفت کا آغاز کرتے ہیں اور اس ادبی انقلاب کی بنگلہ میں وہی حیثیت ہے جو انگریزی ادبیات میں Morality Plays (اخلاقی ڈرامہ) سے Regular Drama کے آغاز و تخلیق کی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ کلاسیکل گانوں میں "دھنیں" ہمیشہ "بول" پر فوقیت رکھتی ہیں۔ مگر شاید ٹیگور ہی وہ پہلا مغنی شاعر ہے جس نے اس دیرینہ و غیر منصفانہ روایت کو اپنے ہاں برقرار نہیں رکھا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک مقالہ The origin and usefulness of music. میں دھن اور بول پر گہری روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کلاسیکل گانوں میں جہاں ایک طرف گرامر اور سائنس Grammer & Science کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا تو دوسری جانب انمیں جذبات کی شدت اور فطرت کا بھی بہت کچھ فقدان تھا۔ یہ ڈاکٹر ٹیگور ہی کا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی نت نئی اختراع اور جولانیِ طبع سے کام لیکر بنگلہ گیتوں میں ایک نئی رُوح پھونکدی ہے۔ اور اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دھنوں کے ساتھ خیالات کا جو صحیح امتزاج ہوا ہے وہ بنگلہ گیتوں کی تاثیر میں خاص طور پر اضافہ کرتا ہے۔ ٹیگور کے گیتوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوگا کہ ان گیتوں میں جذبات کی اثر آفرینی کے ساتھ موسیقی کی لطیف لہریں کس طرح شامل کی گئی ہیں۔ نیز ٹیگور کے گیت کسی ایک خاص فرقہ ملک، مذہب یا جماعت کا راگ نہیں الاپتے بلکہ وہ صحیح معنوں میں انسان کی مختلف حسیات وکیفیات اور زندگی کے نشیب و فراز کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں ٹیگور کا ایک گیت انسان کی اندرونی دنیا کو محیط ہوتا ہے اور اس گیت میں موسیقی ترنم اور خیالات کی گہرائی تال اور سُر سے ہمیشہ دست بدست نظر آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور نے شاعر مغنی کی حیثیت سے بنگلہ گیتوں کی دنیا ہی بدل دی ہے۔ ان کے گیت ہمیشہ "آفاقیت" کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

اب آئیے ہم ڈاکٹر ٹیگور کے گیتوں کو کئی حیثیتوں میں تقسیم کر کے دیکھیں کہ انھوں نے اپنے گیتوں کو کس طرح لازوال بنانے کی کوشش کی ہے۔

موسمی گیت:۔ ڈاکٹر ٹیگور نے جب کبھی کسی خاص موسم پر کوئی گیت لکھا ہے تو وہاں اُنھوں نے کلاسیکل گانوں ہی کی خصوصیتوں کو برقرار رکھا ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ موسمی گیتوں میں راگ راگنی سُننے والوں پر جو گہرا اثر طاری کرتے ہیں اس سے احتراز کرنا کسی حال میں درست نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ٹیگور نے صرف موسمی گیتوں ہی کے سلسلہ میں راگ راگنی کو بول پر فوقیت دی ہے۔

یوں تو ٹیگور نے مختلف موسموں پر گیت لکھے ہیں لیکن جو بات ان کے برسات کے گیتوں میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ ان گیتوں میں ڈاکٹر ٹیگور نے اپنے قلب کی گہرائی کے پیدا شدہ جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان گیتوں میں ایک قسم کی الوہیت سی پائی جاتی ہے۔

قومی گیت:۔ رابندر ناتھ ٹیگور صرف ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک سچے دیش بھگت بھی تھے۔ چنانچہ ان کے قومی گیت ہمیشہ ان کی حب الوطنی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ نیز ٹیگور نے اس قسم کے گیتوں کے ذریعہ وہم پرستی اور تنگ نظری کو دُور کرتے ہوئے انسانی فطرت میں خودی اور حریت کا مادہ پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

محبت کے گیت:۔ ٹیگور کے محبت کے گیت بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان گیتوں میں انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک محبت زدہ انسان کی نو بنو کیفیات کو منتقل کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے وصل کی مسرت جدائی کا غم اور عاشق کی حسرت وغیرہ کو پیش کرنے میں صرف الفاظ سے ہی مدد نہیں اُٹھائی ہے

بقیہ صـ

عیدِ شباب

یونانی علم الاصنام کا افسانۂ محبت — خاص رسالہ سالنامہ مشہور دہلی

اثر:- ادیب اریب محترم جناب رشید احمد صاحب صحرائی

(*)

پیش لفظ- اگرچہ شکستِ عہد کی الزامی حیثیت مجھ ایسے ہدف حوادث کو طلجانی چنداں بعید از قیاس نہ تھی اور وقت کے بیرحم ہاتھوں نے اس باب میں مجھے مجبور و معذور بنانے میں کوئی لمحہ ضائع نہ کیا۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے اس قابل ہو سکا ہوں کہ معزز قارئینِ "مشہور" کی خدمت میں "آوارہ بربط نواز" کے بعد قسط دوم کے طور پر برادر محترم حضرت رشید احمد صاحب صحرائی کا دوسرا افسانہ "عید شباب" پیش کردوں۔

برادر محترم کی صحت کے انحطاط کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ سعی کی تھی کہ انھیں مکمل آرام و سکون پہنچانے کی غرض سے اپنے پاس رکھوں۔ چنانچہ میں نے ان کی آوارگی کو پابہ زنجیر کرلیا۔ مگر کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ۱۴؍ اگست سے وہ مفقود الخبر ہیں۔ ان کے اس طرح چلے جانے سے مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ زندگی کے بیشتر حوادث نے انھیں بہت حد تک احساسی مرض میں مبتلا کرکے مایوس بنادیا تھا۔ اور یہی قنوطیت ہے۔ جو انھیں محتاج خدمت ہونے کے باوجود کہیں قیام کرنے نہیں دیتی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ کونسے حالات تھے، جن سے متاثر ہوکر انھوں نے ترک سکونت کا ارادہ کیا اور مجھے نہ صرف ان کے قرب و صحبت بلکہ ذوقِ خدمت کی تکمیل کے خاطر خواہ موقع سے محروم ہوجانا پڑا۔ ان کی خدمت میں مودبانہ گذارش ہے۔ کہ جس وقت بھی میری یہ تحریر ان کی نظر سے گذرے وہ واپس تشریف لے آئیں۔ یا کم از کم اپنے قیام و مقام سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ میری متجسّسانہ پریشانیاں دُور ہوں۔ موجودہ دورِ فراق میں، ان کی یاد کا ہر لمحہ میری آنکھوں کو اشک ریز بنائے ہوئے ہے۔ *

ح یونان کے عہدِ عتیق کو جسے برادر محترم نے اپنے افسانہ میں پیش کیا ہے۔ ہیروئیک (HEROIC) دَور کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ زمانہ قبل از تاریخ میں یونانیوں کے اصل حالات کا بیّن طور پر پتہ نہیں چلتا۔ ہماری معلومات کے ماخذ محض شعرائے یونان ورولا کے قصص و رزمیہ منظومات ہیں۔ جن کا بڑا حصہ لاریب محض مبالغہ ہے۔ ان رزمیہ قصص و منظومات کی اہمیت اس اعتبار سے نہیں کہ ان سے کسی حقیقی یا فرضی جنگ کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ تاریخ عالم میں اس لئے اہم تصور کئے گئے ہیں۔ کہ وہ زمانہ قبل از تاریخ کے یونانیوں کی معاشرت۔ سیاست۔ اور خیالات و عقائد کے آئینہ بردار ہیں جس طرح مہابھارت اور رامائن ہندوستان کے ہیروئیک عہد کے ہندو سماجک حالات اور ہندو تصورات کے حامل ہیں۔ اسی طرح ایلیڈ اور اوڈیسی کو یونانیوں کے نزدیک اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یونانی ان روایات کو اپنے شاندار ترین ماضی کے کارنامے یقین کرتے ہیں۔ ان سے نہ صرف جنگوں کا حال معلوم ہوتا ہے بلکہ یونانیوں کی سوشل لائف کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ولادتِ مسیح سے ایک ہزار سال قبل یونان کے اندر آزاد شہری ریاستوں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ شہروں اور ریاستوں کے بانی مصری فنیقی۔ اور ایجین ہیروز تھے ہر شہری ریاست آزاد۔ خود مختار اور بالکل مستقل تھی۔ شہری ریاستوں کی حاکمیت اور خارجی و داخلی آزادی ہر طرح مکمل تھی۔

سوسائٹی "پاٹری آرکل" (آبائی) تھی۔ جس میں خاندان باپ۔ عائلہ کے جملہ اندرونی معاملات میں اس کا حاکم مطلق اور دولتی ریاست میں اس کا نمائندہ ہوتا تھا۔ خاندان کی جائداد۔ عزّت اور سرداری باپ سے اسکے بڑے بیٹے کو منتقل ہوا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی "تھیوکریٹک گورنمنٹ" یعنی "خدائی حکومت" بھی پائی جاتی ہے۔ جس کے معنی خدا کے خلیفہ یا نائب کی حکومت کے ہیں۔ اس کے ماتحت بادشاہ اپنے آپ کو مامور من اللہ تصور کرتا ہے۔ بادشاہ زمین پر جوپیٹر کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ یہی نہیں۔ بلکہ بادشاہ اپنے آپ کو جوپیٹر دیوتا کا بیٹا سمجھتے جوپیٹر، یونانی دیوتاؤں کا خداوند اور شہنشاہِ اعظم تھا۔ یونانی بادشاہ اپنے آپکو صرف جوپیٹر کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ قانوناً ان کے اختیارات لامحدود تھے مگر عملاً اور حقیقتاً ان کی طاقت محدود تھی۔ وہ رسماً مجبور تھے۔ کہ ریاست کی دو جمہوری مجلسوں کے مشورے سے کام کریں۔ پہلی مجلس امراء کی تھی جو "باؤلی" یا "مجلس اشراف" کہلاتی تھی۔ دوسری مجلس تمام آزاد لوگوں کی تھی جو "آگورہ" یعنی "مجلس عوام" کہلاتی تھی۔

اس زمانہ میں اہلِ یونان تین بڑی جماعتوں میں منقسم تھے (۱) طبقہ

* برادر محترم کی اس ادبی کاوش کی ستائش و توصیف تو میرے امکان سے باہر ہے۔ علم دوست اور ادب نواز ارباب ذوق خود فیصلہ کرینگے۔ میں "پس منظر" کی وضاحت و صراحت کے [illegible]

امرا (۲) طبقۂ عوام اور (۳) طبقۂ غلام ـــــ امرا بادشاہوں کے بعد دوسرے درجے میں تھے۔ افسانے کی دو شخصیتیں لاؤمیڈن اور میلوڈس اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی جائدادوں اور غلاموں کے مالک تھے۔ جنگی سردار اور رہبر (لیڈر) سمجھے جاتے تھے۔ طبقۂ عوام آزاد مگر غریب لوگوں سے مرکب تھا۔ ان کے پاس زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات تھے۔ جنہیں وہ خود کاشت کرتے تھے۔ انہیں ریاست کی سیاسی مجلس عوام میں ووٹ دینے کا حق تھا۔ اور طبقۂ غلام میں وہ لوگ شمار ہوتے تھے۔ جو جنگوں سے قید ہو کر آئے تھے۔ امرا کے گھروں میں رہتے تھے۔ اور امرا کی املاک میں ان کا شمار تھا۔

غریبوں کی حالت اس عہد میں اچھی نہیں تھی۔ لوگ عسکری امرا کے رحم و کرم پر تھے۔ اور اکثر جنگوں میں یہی کام آتے تھے۔ قتل و غارت اور جنگ و جدل کی کثرت تھی۔ رسوم و اوہام کی پابندی عام تھی۔ سحر و افسوں پر اعتقاد عام تھا۔ ہر جنگ کو کسی نہ کسی دیوتا کے عتاب سے منسوب کیا جاتا ـــــ رب الارباب زیس ـــــ یعنی جوپیٹر کی سالگرہ کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا۔ تجارت تمام تر اہل فنیقیہ کے ہاتھوں میں تھی۔ اکثر اشیا مشرق سے درآمد ہوتی تھیں۔

یونان میں علم و تہذیب کی درآمد "ام التہذیب" مصر سے ہوئی۔ حال کے اکتشافات اور علمی تحقیقات سے یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ اہل یونان "ایرین" نہیں بلکہ "سامی الاصل" تھے۔ یا کم سے کم ایک مخلوط نسل سے تھے۔ جن کی تہذیب میں "سامی"۔ "ایرین" اور مخصوص "یونانی" عناصر مل جلکر ایک کل کی صورت اختیار کر چکے تھے۔

اس پس منظر کے بعد میرے واجب التعظیم بزرگ بھائی حضرت رشید احمد صحرائی کا افسانۂ ذیل ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے یونانیوں کے اصنام پرستی اور حسن و عشق کی کیفیات کو اپنے مخصوص اندازِ نگارش میں پیش کرتے ہوئے قدیم یونانیوں کے اس خیال کو ـــــ کہ حسن دیوتاؤں کا ایک خاص عطیہ ہے اور صرف وہی "حسن" قابل ستائش اور منتقل ہونے کے قابل ہے جسے جذباتِ تفاخر اور غرور کی علامات نے بگاڑ نہ دیا ہو۔ ان کے نظریۂ کمال کے مطابق "حسن" بہترین اندرونی صفات کا مظہر ہونا چاہیئے۔ دلکش سوز و تاثر کے ساتھ نباہنے کی سعی کی ہے۔

(غلام نبی طارق کاشمیری)

ـــــــ (۱) ـــــــ

یونانی علم الاصنام میں عید کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ آج بھی تاریخ یونان کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ یونانیوں کے دورِ عروج میں دیوتاؤں کی یادگاریں منائی جاتی تھیں۔ اور ان تقریبات کو عید کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ زیس کے فرزند شہنشاہ ہیروڈیس کے عہدِ حکومت میں جوپیٹر دیوتا کی سالگرہ کا جشن "عید مقدس" کے نام سے متواتر ایک ماہ تک بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا۔ اس موقع پر یونان کی کنواریاں اپنے لئے خاوند منتخب کر لیتی تھیں۔ بادشاہ سے لیکر رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد تک کے لئے "عید مقدس" کے جشن خاص کی شرکت ضروری تھی۔ اور اسے مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کیا جاتا۔ وہ متنفس جو کسی وجہ سے شریک جشن نہ ہو سکتا۔ نہ صرف بدبخت ہی سمجھا جاتا۔ بلکہ فی الحقیقت اسے بدبخت بنا دیا جاتا۔ عوام اُسے دیوتا کا معتوب جان کر اپنے خاندان۔ اپنی برادری۔ اور اپنے شہر سے بدر کر دیتے۔ اس غریب کے سایے کو بھی منحوس جانتے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ بچے سے لیکر بوڑھے تک شاہی جشن میں شریک ہوتے۔ معبدوں میں دُعائیں مانگی جاتیں۔ اور جا بجا عود و لوبان کی منقلیں دہکا کر رکھدی جاتیں۔

ولادتِ مسیح سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ عید مقدس کے موقعہ پر عروس البلادِ یونان (ایتھنس) کے معبد اعظم میں ایک اطالوی بربط نواز نوجوان دیکھا گیا۔ جس کے حیات افروز نغموں نے جوپیٹر پیکرِ سنگین میں تاثراتِ حیات پیدا کر دئے۔ قدیم کتاب "حکمت قدما" کی روایت کے مطابق جوپیٹر نے خوش ہو کر نوجوان کو ٹیتھونس یعنی "آسودگی" کا نام دیا۔ اور اسے مُنہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ نوجوان نے دوامِ شباب و بقائے حیات کی آرزو کی اور سر دربار اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ اسپر جوپیٹر کے سنگین پیکر سے آواز آئی:-

"اور فنیس نے ہزاروں سال پہلے یہی آرزو کی تھی جسے ہم نے شرفِ قبولیت بخشا تھا۔ اور یہ نعمت اسے عطا کر دی تھی۔ اور فنیس نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد آبِ حیات کا مرکب تیار کیا۔ مگر ہم نے یہ دیکھکر کہ انسان شر و فساد اور جرم و معصیت کا پُتلا ہے۔ اس مشتِ خاک کو "دوامِ حیات" دینا جرم و گناہ پر مُہرِ دوام ثبت کرنا ہے۔ اس سے یہ جوہر چھین کر خداوندِ شر ٹائیفون دیوتا کی تحویل میں دیدیا۔ جو آج تک عفریتوں کے جنگل میں محفوظ ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے تمھیں سرزمینِ یونان کی ایک ایسی دوشیزہ کو بس میں کرنا ہوگا جس کی مجلا پیشانی پر نقش اختر ثبت ہوگا۔ اسے اپنی محبت کے دام میں اسیر کرنے کے بعد اس کی رضا کے مطابق ساحر لاؤمیڈن سے عفریتوں کے جنگل کا نقشہ حاصل کرنا ہوگا۔ جب تم وہاں پہنچ جاؤ۔ تو اس دوشیزہ کو ٹائیفون دیوتا پر قربان کرنا ہوگا۔ قربانی لئے بغیر ٹائیفون ہرگز ہرگز آبِ حیات حوالے نہ کریگا ـــــ جاؤ۔ اگر انسانی قوتوں نے تمھارا ساتھ دیا۔ اور تم حصول دوام کے راستے پر ثابت قدمی سے گامزن رہے تو کامیاب ہوگے"

ٹیتھونس نے سربسجود ہو کر تکمیل آرزو کا حتمی وعدہ کیا۔ اور معبد سے اُمیدوں کی دُنیا لئے ہوئے نکل گیا۔

ـــــــ (۲) ـــــــ

ٹیتھونس کے بربط کی تاروں نے سرزمینِ یونان کے ذرّے ذرّے کو

مجبور رقص کر دیا۔ اس کے نغموں نے جبال راسیات کو سرشار وجدان وعرفان بنایا آخر کار پرتھینان کے معبد رفیع میں اُسے منروا نامی دوشیزہ مل گئی۔ جو جمالیات کا حسین مرقع تھی یا زیادہ موزوں الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ زہرہ جبین منروا ٹیتھونس کے بربط کی روح طراز تاروں سے طلوع ہونے والی ماہ پارہ تھی: جسے اسیر دام محبت بنانے میں اس نے روحِ شباب صرف کر دی۔ تالیف قلوب نے رفتہ رفتہ منازل محبت کو طے کرنا شروع کیا۔ اور ملاقاتوں کے تواتر نے دونوں کو ایکدوسرے کا منظورِ نظر بنا دیا۔ اُن کے دل کیفیاتِ محبت سے سرشار۔ ان کی نگاہیں خمارِ دیدار سے بیمار۔ ان کے سر سودائے عشق کے مایہ دار اور ان کی روحیں نشاطِ اتصال سے بہرہ یاب تھیں۔ ٹیتھونس منروا کے بغیر اور منروا ٹیتھونس کے بغیر اپنی زندگی کے لمحات کو بے کیف وخلش آفریں جانتی۔ دونوں کا مسلک حیات ع

عشق یک بیں در تماشائے دوئی است ؎ کے مصداق تھا۔ بہت ہی تھوڑے عرصے میں وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے۔ کائناتِ شوق کی صورت گری ان کا شعارِ حیات تھا۔ منروا کی فطرت اسرارِ حیات کی وہ لوح تھی جس کا گہرا مطالعہ ٹیتھونس کو ثباتِ زندگی کا راز دار بنا رہا تھا۔ اس کا بربط روز بروز مترنم ہوتا جاتا تھا۔ نہایت قلیل عرصہ میں ٹیتھونس نے بربط نوازی کے ذریعہ ایتھنس اور اس کے مضافات میں غیر فانی شہرت حاصل کر لی۔ منروا سے دل بستگی کے بعد وہ محافل سرود و نغمہ کی شرکت سے عمداً گریز کرتا۔ مگر منروا کے ایماء سے وہ جس عشرت کدے میں ترنم بار و نغمہ طراز ہوتا۔ وہاں کے ذرّے ذرّے سے باج داد و خراجِ تحسین حاصل کرتا۔

ایتھنس کی متمول شخصیتیں ہمیشہ اس کی منت گذار رہتیں۔ بادہ کش میلوڈس متمول ترین انسان تھا۔ ہیروڈیس کے دربار میں وہ ایک اعلیٰ عہدہ پر متمکن ہونے کے علاوہ پبلک میں بیحد ہر دلعزیز تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علم خطابت ونفس میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ وہ اکثر اپنے سُنہری اور منقوش رتھ پر سوار ہو کر ارسطاس میں ٹیتھونس سے ملاقات کی غرض سے آیا کرتا۔ وہ ٹیتھونس کو اَڈونیس دیوتا کا مثیل جانتا۔ اس اعتبار سے اس کا دل سے احترام کرتا تھا۔

—————— (۳) ——————

ارسطاس —— سبزہ در بر و چمن بکنار۔ ایک قصبہ تھا۔ ایتھنس سے چھ میل مشرق کی طرف۔ شاہراہ ہیرس ہر دو کے اتصال کا ذریعہ تھی۔ جس کا ہر ذرہ ٹیتھونس کے نغموں سے مانوس اور منروا کے جمال دلفریب سے کیف افروز تنویر تھا۔ وہ دونوں —— ٹیتھونس اور منروا —— اپنی زندگی کے مسرور و رنگین لمحات۔ سبزہ پوش مغربی پہاڑیوں کے دامن میں بہنے والی ندی کے کنارے سیر وتفریح۔ سرود و نغمہ اور راز و نیازِ حسن و عشق میں بسر کرتے۔

ایک روز —— ٹیتھونس اور منروا سبک خرام ندی کے کنارے فرشِ زمردیں پر مصروفِ ترنم تھی کہ آسمان پر ابر تیرے منروا کے پریشان گیسوؤں

کی طرح چھا گیا۔ اور آہستہ آہستہ برسنے لگا۔ شام اپنی ملاحت نواز جوانیوں کے ساتھ جلوہ بار تھی۔ ندی کا پانی گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ تقاطرِ باراں مسلسل دل کے اضطراب کی طرح بڑھنے لگا۔ منروا ایک گھنے درخت کے سایہ میں پناہ گیر ہوئی۔ اور ٹیتھونس چند قدم دور ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر گانے لگا ؎

کسی کے انداز کافری پر نمودِ رنگِ شباب توبہ
ہمارے دل کا خدا ہی حافظ عذاب ہے عذاب توبہ
یہ حُسن کی تمکنت قیامت، وفا سے توبہ جفا پہ مائل
ابھی تو ہے خیر سے لڑکپن، مگر جب آیا شباب توبہ

باد و باراں اپنا ارغنوں بجا کر اس کی ہمنوائی کر رہے تھے۔ جب اس نے کہا

جوانیاں سی برس رہی ہیں، شباب جلوے دکھا رہا ہے

اچانک بجلی کوندی۔ منروا مسکرا دی۔ ٹیتھونس نے ساز کو خاموش کر دیا اور منروا سے مخاطب ہو کر بولا "تم بھیگ تو نہیں رہیں منروا —— !" منروا نے والہانہ انداز میں جواب دیا۔ "ہاں —— نغموں کے تقاطر میں بھیگ تو رہی ہوں —— میری آرزوئیں —— تمہارے بھیگے ہوئے ساز کی طرح سرور و کیف میں تر ہو رہی ہیں" ٹیتھونس کی کیوں کا جواب منروا نے بیباک شوخی سے دیا —— "اسلئے کہ مجھے تمہارے تقرب کا سایہ میسر نہیں" ٹیتھونس نے باطنی اضطراب کو دباتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں منروا! ایسا نہ کہو میں تم سے الگ نہیں رہ سکتا۔ میرے نغموں کا تحرک اور بربط کا زخمہ تم ہو۔ تمہارا جمال ہے" اس کی نگاہیں ساز کی تاروں کا جائزہ لے رہی تھیں "اگر وطن کی محبت اور عزیزانِ وطن کی کشش نے مراجعت پر مجبور کر دیا تو کیا کرو گے" منروا کے عقب سے ایک آواز بلند ہوئی۔ مگر ٹیتھونس نے آواز کے مخرج کو پہچانے بغیر جواب دیا۔ "تمہارے مستقر کو اپنا وطن جانتا ہوں۔ آوارہ محبت غریب الوطن کو دیارِ لیلےٰ سے بڑھ کر کوئی وطن عزیز نہیں ؎

بالذتِ آوارگیٔ وادیٔ عشقت
غربت زدگاں را نشود میل وطن ہا

منروا نے گھوم کر دیکھا تو میلوڈس کو مسکراتے ہوئے پایا۔ اس نے شوخی سے کہا۔ "جناب —! بے بس صید پر چھپ کر وار کرنا اصول صید افگنی کے خلاف ہے"

میلوڈس ہنستا ہوا سامنے آ گیا۔ اور منروا کی بات کا جواب دئے بغیر ٹیتھونس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ٹیتھونس متحیر ہو کر بولا۔

"معزز میلوڈس! اس طوفانی شام میں آپنے کیوں تکلیف فرمائی"

میلوڈس:۔ عید مقدس کا شاہی جشن تمہاری شرکت کے بغیر نامکمل رہا جاتا ہے۔ اور تم نے تو شرکت کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ یاد ہے؟

ٹیتھونس:۔ کب؟

میلوڈس:۔ بھول گئے! مجھے یقین تھا۔ کہ تم کسی ساحرہ کی زلفوں کے اسیر ہو کر

سب کچھ بھول جاؤ گے۔

منروا:۔ الفاظ کی تلخی سے گھبرا کر بول اٹھی "معزز سردار! گناہ کسی کا اور ملزم کوئی یونانی حکومت کے آئین کا مدار اسی اصول پر ہے؟"

میلوڈس نے ندامت محسوس کرتے ہوئے کسیقدر طنز سے جواب دیا:۔ محترم منروا! حکومت کا آئین تو اس اصول کا پابند نہیں۔ البتہ آئینِ عشق اور قانونِ محبت میں یہی اصول کارفرما ہے۔ گستاخی معاف"

ٹیتھونس نے ختم مبحث کی خاطر عذر خواہی کے طور پر کہا "مگر سردار! میرے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے شکستِ عہد پر مجبور رہنے دو۔

میلوڈس نے مربیانہ لہجے میں اظہار ہمدردی کرتے ہوئے جواب دیا:۔ میں ان کیفیات کو خوب سمجھتا ہوں۔ مگر شاہی حکم سے سرتابی جانتے ہو کتنا بڑا گناہ ہے۔؟ — نتائج پر غور کرو۔ مجھے تمہاری زندگی عزیز نہ ہوتی تو اس بارانی شام کی رنگین کیفیات میں تمہاری خلوتوں کو پامال نہ کرتا۔ یہ انگڑائی لیتی ہوئی گھٹائیں — یہ بادہ بار تقاطر — مجھ جیسے بادہ کش کے لئے پیامِ کیف ہے اور میں یہ کیف چھوڑ کر شاہی حکم کی تعمیل میں آیا ہوں"۔

منروا کسی قدر چین بجبیں ہو کر بولی "آپ میرے ہاتھ سے ساغر چھین کر لیجانا چاہتے ہیں سردار!"

میلوڈس نے تسلی آمیز لہجہ میں جواب دیا "نہیں بھولی منروا! ایسا نہ کہو — میرا رتھ خداوند ٹیتھونس کی مراجعت کے لئے ہر وقت تیار رہیگا — میں تمہارے جذبات محبت کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا۔ اور منروا! نارمن کے عشرتکدے میں شہنشاہ معظم کا نزول اجلال نہ ہوتا تو میں محترم ٹیتھونس کو اس کی منشاء کے خلاف ہرگز مجبور شرکت نہ کرتا"

منروا نے مطمئن ہوتے ہوئے ٹیتھونس سے کہا "ٹیتھونس! جاؤ مگر لب ساغر کو بوسہ نہ دینا مبادا بیگانہ ہو کر — بربط کو لغزش کھا جانے پر مجبور کر دو۔

ٹیتھونس نے تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا "نہیں منروا ایسا نہ ہوگا، میں یہ ہوشربا شراب پی کر اپنے کیف مستقل کو ضائع نہیں کرنا چاہتا"

میلوڈس ایک خاص کیف کو مدنظر رکھتے ہوئے بولا "لیکن ٹیتھونس! آج بنتِ عنب کا شاہی رقص تمہارے نغموں کو مزید رنگین بنا دیگا۔ جو ساغر سامنے آئے اسے قبول کر لینا۔ یونان کی بیش بہا کشید شاہی ساغروں میں ڈھالی جائیگی جس کا ہر قطرہ سرور و کیف کی ایک مرقص دنیا لئے ہوئے ہوگا! دیکھنا اس سے محروم نہ رہنا۔

منروا نے تنبیہ کرتے ہوئے ٹیتھونس سے کہا "ٹیتھونس! میں چند ساعتوں کے لئے تصدیعۂ فراق برداشت کر لوں گی۔ مگر دیوتاؤں کی ناراضگی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ خبردار — ان شکست انجام ساغروں کو کبھی لب آشنا نہ کرنا اور اس اتر جانے والے نشے سے ہرگز ہرگز غشائے ادراک و شعور کو ملوث نہ ہونے دینا"

ٹیتھونس نے مسکراتے ہوئے منروا کی تابندہ پیشانی پر بوسہ دیکر جواب دیا "میری بھولی منروا! مجھ پر اعتماد کرو۔ تمہاری نگاہوں نے جسے مست بنا رکھا ہو وہ سرورِ مستعار کو کبھی قبول نہیں کر سکتا؎

جامی از شوقِ تو شد مست، نہ مے دیدہ نہ جام
بزمِ عشق است، چہ جائے مے و جام است اینجا

ٹیتھونس نے نارمن کے عشرتکدے میں داخل ہوتے ہی ہر نگاہ کو متوجہ کر لیا۔ اُس کے نغموں نے ہر دل میں نشاط و گداز کی لہریں پیدا کر دیں۔ شاہ ہیروڈیس نے اُسے قریب بُلا کر اس کے بربط کی تاروں پر ایک بوسہ ثبت کیا۔ یہ ایک امتیاز تھا۔ جس کا منشا یہ تھا۔ کہ مملکتِ یونان کے بربط نوازوں میں ٹیتھونس کو امتیازی حیثیت دی گئی۔ اور اسے شاہی بربط نواز تسلیم کر لیا گیا۔ یہ اس کے تکمیل فن کی دلیل تھی۔ ماہرین موسیقی نے "نالۂ فراق" اور "نگاہِ لوئین" اس کے دو گیت بیحد پسند کئے۔

(۴)

"سید القریہ کی زندگی ہماری عزیز ترین متاع ہے"

"اور متاع کا چھن جانا انتہائے بدقسمتی ہے"

"ایسا ہونا دیوتاؤں کی رنجش کا موجب ہے"

"ساحر کو موت نہیں آیا کرتی"

"کیوں؟"

"اسلئے کہ وہ دیوتاؤں کی منشاء کو جانتا ہے۔ اپنے افسون کے بل پر انھیں خوش کر لیتا ہے"

"ارسطاس کی محافظت کے لئے اُس نے کئی قربانیاں دی ہیں"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے"

"خداوند کے حضور میں دُعا"

ارسطاس کے چند گڈریے صنوبر زار کے گھنے سائے میں بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ اس بات سے لاعلم تھے۔ کہ ساحر لاوڈیڈن جسے وہ اپنا رئیس قریہ اور مقدس بزرگ سمجھتے تھے۔ اپنی بیش قیمت دوا کے اثر سے مہلک مرض کے اندفاع میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بہت قلیل مدت میں اس نے دوبارہ زندگی حاصل کر لی تھی۔ اب وہ اپنا بیشتر وقت خدمتِ خلق اللہ میں بسر کرتا تاہم منروا کی غیر متوقع آزادی سے خوف زدہ سا رہنے لگا۔

منروا اکثر اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتی۔ اس نے کئی بار منروا سے اس کی غیر حاضری کے متعلق استفسار کیا۔ مگر وہ ہمیشہ غیر مطمئن انداز میں ٹال دیتی رہی ایک روز اس نے اپنی لائبریری میں جا کر ایک قدیم کاسۂ سر پر سحر کیا۔

اور نہ جانے وہ انسانی کھوپڑی کے ساتھ کب تک مصروف عمل رہا۔ لیکن جب وہ قریب شام باہر نکلا تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس نے گھر کی خادمہ لیوتی کو بلا کر حکم دیا۔ "منروا کو بلاؤ لیوتی! میں اس سے ٹیتھونس کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں"

لیوتی نے کچھ اس طرح جیسے اسے بہت دنوں کی دماغ میں کھولنے والی بات کہنے کا موقع مل گیا ہو گھبرا کر جواب دیا "آقا! صاحبزادی تو اس آوارہ بربط نواز کا سایہ بنتی چلی جاتی ہے۔ اور وہ بھی یہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔"

ساحر نے بہت کچھ ضبط کرتے ہوئے کہا "ہاں۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں لیوتی! تم اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ خداوند کی منشا اپنی تکمیل چاہتی ہے"

لیوتی کے جاتے ہی اس نے مضطربانہ ٹہلتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میری بیٹی منروا کی قربانی کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتا"

"آب حیات انسانی تصرف میں آ جائیگا" — انسانی تصرف میں — آبحیات — کیا یہ ممکن ہے — ؟" وہ پُرجوش لہجے میں بولا "نہیں ہرگز نہیں۔ میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔" وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اور پھر یک لخت فکرمندانہ انداز میں بولا "ٹیتھونس کو یہیں ختم کر دینا چاہیئے — ہاں — مجھے اپنے تیار کئے ہوئے زہروں کا جائزہ لینا چاہیئے۔" یہ کہکر وہ کسی ضروری کام میں منہمک ہو گیا۔

۵

لیوتی ندی کے کنارے پہنچی جہاں منروا ٹیتھونس کی آغوش میں شباب کا گیت بنی ہوئی تھی۔ اور ٹیتھونس اس سازِ پُر زندگی کے دوام کا گیت گا رہا تھا۔

باپ کا پیغام جذبِ سماعت کرتے ہی وہ گھر پہنچکر باپ کے روبرو پیش ہوئی۔ ساحر اسے دیکھتے ہی اپنے دلی جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا — "منروا! میری نگاہیں تمھاری تلاش میں حروفِ سحر و افسون بن جاتی ہیں مگر تم — آخر ماہ کے چاند کی طرح — بہت دیر سے طلوع ہوتی ہو۔" منروا کو خاموش دیکھکر اس نے ذرا کرخت لہجہ میں سوال کیا — "اور — وہ مہمان — کبتک قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟" منروا نے حیران ہو کر پوچھا "مہمان"؟ ساحر نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا "ہاں — وہی آوارہ چھوکرا۔ ٹیتھونس!" منروا نے لہجے کی تلخی کو برداشت کرتے ہوئے کسی قدر تحمل کے ساتھ جواب دیا "میں نہیں جانتی۔ اور نہ یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔"

اس کے باپ نے غصّے میں اسی کے چند الفاظ دہرا دئے۔ "تم نہیں جانتیں؟"

منروا نے باپ کی خفگی کا احساس کرتے ہوئے گفتگو کا پہلو بدلنے کی سعی کی اور ان سب باتوں کو جو وہ ٹیتھونس کے باب میں کہنا چاہتی تھی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "بابا۔ وہ اپنے ساز پر نہایت دلکش گیت گاتا ہے" ساحر نے اسیرِ قفس شیر کی طرح ٹہلتے ہوئے جواب دیا "میں جانتا ہوں — جس طرح مکس تارِ عنکبوت میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے بربط کی تاروں میں تمھارا بھولا بھالا دل بھی گرفتار ہو چکا ہے — وہ تمھیں اپنے دامِ محبت میں اسیر کر چکا ہے — تم سائے کی طرح اس کا ساتھ دو گی۔"

وہ خیالات کی رو میں بہا چلا جا رہا تھا۔ منروا سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ کہ پھر ساحر نے کسی فکر میں غرق ہو کر اس انداز میں جیسے وہ اپنے دل سے باتیں کر رہا ہے کہا۔ "عفریتوں کا جنگل — قربانی —؟ — کس کی —؟" اس کا چہرہ یک لخت تمتما اُٹھا۔ وفورِ غیض سے اسکی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ گرج کر بولا — "منروا! اسے فی الفور میرے کاشانے سے نکل جانے کا حکم دو۔ اور ساتھ ہی کان کھول کر کہدو — کہ وہ ارسطاس کی سرزمین سے دُور نکل جائے۔ ورنہ میں اسے یہیں بھسم کر دوں گا"

منروا کی آنکھیں زیادہ کھُل گئیں۔ تحکم کی اس شدت کو وہ برداشت نہ کر سکی۔ اور تڑپ کر بولی "ایسا نہ کہو پاپا! — میں اس سے — محبت کرتی ہوں۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔ اگر میری موت کے آرزومند ہو تو اسے ابھی نکالدو۔"

ان الفاظ سے ساحر لاؤمیڈن بیحد متاثر ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یکدم سینکڑوں تیر اسکے دل میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اس نے منروا سے ناصحانہ طور پر کہا — "بھولی منروا! مجھے اس غیر معقول آوارہ مزاج چھوکرے کے کردار و اعمال ناقابلِ اعتماد سے نظر آتے ہیں۔" منروا نے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "اہرمنی صحبتوں میں اس کی شرکت۔ ناشناس بربری اجتماعات میں اس کی نغمہ طرازی۔ قریہ کی کنواریوں سے چھیڑ چھاڑ۔ اور ہم لوگوں سے اپنے حسب و نسب کا اخفا۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک وہ ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ جس کا کوئی حل نہیں — اور سچ پوچھو تو اس کے کردار و اعمال کے مظاہر حکیم اور فیلیس کے وضع کردہ اصولِ اخلاق کے منافی ہیں۔

منروا نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے آپنے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔" لاؤمیڈن نے اپنے خیالات پر یقین کرتے ہوئے جواب دیا "خداوند کی برکتوں کا سایہ جب میرے شاملِ حال ہے منروا! تو میری سعی بھی نامشکور نہ ہو گی — میں نے ابھی ابھی کیلس کے کاسۂ سر میں اس کی حقیقت کو دیکھ لیا ہے۔ میں اسکے مقاصد سے آگاہ ہوں۔" منروا نے اسے فی الفور تغافل بیانی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "پھر آپ اسے معمہ اور چیستان کیوں بتا رہے ہیں — وہ دیوتا کا منظورِ نظر ہے۔" لاؤمیڈن نے اسی انداز میں جواب دیا۔ "خوفناک حد تک سنو منروا وہ جس مقصد کے لئے چلا تھا۔ اسے فراموش کئے ہوئے ہے۔" اس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "خداوند جوپیٹر کا پرستار اور تلعب کا تمکار — جو فرض کو نہیں پہچانتا وہ دیوتاؤں کا محبوب و منظورِ نظر نہیں ہو سکتا۔"

منزوا اس معمہ کو نہ سمجھ سکی۔ اس نے عجز فہم کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا" میں عجز فہم کے اعتراف پر مجبور ہوں پاپا!" لاؤمیڈن نے مربیانہ انداز میں راز کی نقاب کشائی کرتے ہوئے جواب دیا" ٹھیک ہے ـــ تم کیا جانو ـــ محبت کے پردے میں دشنہ دست قاتل اور خونی کے ارادوں کو ـــ ٹیتھونس وہی بربط نواز نوجوان ہے۔ جو دیوتا کی منشا پاکر آبِ بقا کے حصول کے لئے تمہارے خون سے ہولی کھیلنے پر آمادہ ہے۔ اور اسی مقصد کے لئے تم سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ غرض پرست چھوکرا ـــ!" لاؤمیڈن کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا۔ منزوا نے مزید وضاحت کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب دیا "تمہارا ارسطاس چھوڑنا تمہاری زندگی کے لئے مخدوش ہے اور اس وقت ـــ وہ فرض سے غافل ہے۔ اُسے فطرتِ حُسن کو مغلوب کرنے کا سودا ہوگیا ہے اس گناہ کا بدلہ اور اس جرم کی سزا اسے ضرور بھگتنی پڑے گی۔ اُس عاقبت نااندیش نے حرص و آزِ گیتی کا شکار ہوکر زندگی کا دوام کھو دیا ـــ"

منزوا نے اس کے خطرات و خوشات کی تردید کرتے ہوئے کہا" وہ میرا دیوانہ ہے۔ اس سے اس قسم کے اقدام کی توقع فضول ہے" لاؤمیڈن نے جواب دیا " اگر ایسا ہو تو آبِ حیات ہمیشہ کے لئے انسانی دسترس سے نکل جائیگا۔ اور میرے نزدیک ایسا ہونا ہی بہتر ہے" منزوا نے جذباتِ محبت سے مغلوب ہوکر جواب دیا" ہمیں کسی آبِ حیات کی ضرورت نہیں" لاؤمیڈن نے پھر کہا "تمہیں ضرورت نہیں۔ مگر اسے تو ہے ـــ مجھے اس کی زندگی کا بہت جلد خاتمہ کر دینا ہوگا ـــ میں خداوند جوپیٹر سے اس کی موت کے لئے دعا کروں گا" منزوا اس خوفناک عزم سے کانپ اُٹھی اس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "مگر مجھے اس کی موت گوارا نہیں"

یہ کہتے ہی وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس کی خوشیاں دم توڑنے لگیں اور اب منزوا اپنی زندگی کے شکستہ غرفے میں سے مستقبل کے میدان کا نظارہ کر رہی تھی۔ باپ کی یاس آفریں تقریر نے منزوا کے مطلع حیات کو دھندلا بنا دیا۔ اور وہ ایک شدید اضمحلال و ماندگی کی آماجگاہ بن گئی۔

۶

ٹیتھونس ـــ خداوند جوپیٹر کے فیضان سے بہرہ یاب تھا پھر اگر اس کی تربیت میں مذاقِ موسیقی کو اعلیٰ ترین منصب ملا تو کیا عجب ـــ اسکے گانے کا یہ عالم تھا۔ کہ جسوقت وہ گنگنانے لگتا تو معلوم ہوتا۔ کہ فرشِ مخمل پر موتی رُل رہے ہیں۔ اور موتیوں کے رُلنے میں جو خاص کیفیت دمک کی نظر آتی ہے وہی عالم ٹیتھونس کی گٹکری سے پیدا ہوتا تھا۔ اس قسم کی تربیت نے اس کی سیرت کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ کہ اسکے لئے کسی ایسی شے کا سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جو نغمہ و موسیقی سے متعلق نہ ہو۔ وہ مادی دُنیا کا تصور بھی اگر کر سکتا تھا تو صرف موسیقی کے ذریعے سے ـــ نسیم سے جنبش میں آجانے والی پتیوں کی ہم آہنگی چشمے کی روانی کا راگ۔ ہوا کی زمزمہ سرائی۔ اور برگ زار پر بوندوں کے بول ـــ غرض ہر وہ پیدا و پنہاں ترنم آفرینی کو اس طرح سُنتا اور سمجھتا تھا۔ گویا یہ اسکی زبان ہے۔

منزوا ـــ ہرچند اس فن میں کامل تھی۔ لیکن آخر اس کے تاثر کی بیتاب ہوگئی تھی۔ کہ جب ٹیتھونس گانے لگتا تو اس خوف سے کہ کہیں وہ خود بھی اپنے نغمے کے ساتھ نہ اُڑ جائے۔ اس کا شانہ پکڑ لیتی۔ فن موسیقی کے ماہر آتے تھے۔ اور اس کے پہلے ہی بول کے ساتھ اپنے سازوں کو توڑ دیتے تھے۔ کہ ان کے تاروں میں اسکا نغمہ سما نہ سکتا تھا۔

ٹیتھونس کا نغمۂ شباب اب اپنے انتہائی نقطے پر پہنچ رہا تھا۔ مملکتِ یونان میں کوئی ساز ایسا نہ تھا۔ جو اس کا ساتھ دے سکتا۔ اب اس کا فن مکمل و مجلّا ہوگیا تھا۔ لیکن اس تکمیل و جلا میں اس کا پورا شباب صرف ہو جاتا تھا۔ اس کے گانے میں خواب قطعاً اضطراری ہوتا تھا۔ منزوا اب محسوس کرنے لگی تھی۔ کہ ایک دن ٹیتھونس کا نغمہ ہی اسکے سازِ ہستی کی شکست بن جائیگا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیتھونس حُسن کی قاتلانہ یورش سے مامون رہا۔ حُسن نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اپنے جارحانہ اقدام سے قلمرو عشق پر پورا قبضہ اور مکمل اقتدار حاصل کر کے رہے گا۔ چنانچہ دوشیزگانِ یونان نے ٹیتھونس کو صیدِ حُسن سمجھکر دام پھیلائے۔ مگر منزوا نے اپنی محبت کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہ چلنے دی۔ وہ اپنے مرکزِ محبت کی مدافعت کے لئے ہر جائز و ناجائز اقدام پر آمادہ تھی۔

باپ کی تادیب نے اُسے اور چوکنا کر دیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ ٹیتھونس اُس کے دامِ محبت میں پوری طرح اسیر ہو چکا ہے۔ اور محبت کے لمحاتِ شیریں اس کی زندگی میں دوام کی اُمید پیدا کرنے کے محرک ثابت ہو رہے تھے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھی۔ کہ شباب ـــ زندگی کے عروج کا نام ہے جس کا زمانہ جلد گذر جانے والا ہے۔ اس کے بعد اسے زندگی کی تلخکامیوں سے دوچار ہونا پڑیگا اور وداعِ حُسن کے بعد موت کی آرزو میں زندہ رہنا محبت پرست دلوں کیلئے اجیرن ہو جائے گا۔ وہ اپنی موجودہ حالت کا استمراری استقرار چاہتی تھی۔

کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ وہ اپنی زندگی کی قربانی دیکر کیوں ٹیتھونس کو بقائے حیات کی شراب سے سرشار کر دے۔ مگر اسے یہ بھی گوارا نہ تھا۔ وہ ٹیتھونس کے شباب کا دوام دوسروں کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے دینے پر تیار نہ تھی۔ اس خیال کے زیر اثر اسے یہی مناسب معلوم ہوا۔ کہ وہ دونوں طبعی موت مر جائیں۔ وہ یہ بھی خیال کرتی ممکن ہے رنگ و روپ میں فرق نہ آئے۔ مگر جذبات و حسیات میں مُردنی پیدا ہو جائے گویا سینوں میں دھڑکنیں مضمحل ہو جائینگی۔ اس حسین و معطر لفافے کی مانند ہونگی جس میں جلے ہوئے مکتوب کی راکھ بھر کر سر راہ

پھینک دیا گیا ہو۔

کچھ عرصہ سے وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ٹیتھونس کی بذلہ سنجیاں اب سنجیدگی و متانت سے بدل رہی ہیں۔ اس کے قویٰ میں اضمحلال شروع ہو گیا۔ اور حُسن کی ملیح صباحتوں پر زعفرانی رنگ نمودار ہوتا جا رہا ہے۔ اسکے حیات پرور ساز کی مترنم تاریں ہر لرزش کے ساتھ اہتزاز و مزاح کی جگہ رومان آفریں نغمے برسانے لگیں۔ نغمے نہیں بلکہ وہ نالے جن کا انجذاب جراحت خواہ رگوں میں درد و کرب کی لہریں پیدا کر دیتا ہے۔ ٹیتھونس کا نہاں خانۂ دل جو خداوند جوپیٹر کی مقدس و مطہر جلوہ گاہ تھا۔ اب مخلوق پرستی کا بتکدہ بن گیا تھا ۔۔۔ بتکدہ ۔ جس میں یونانی مرمریں اصنام اپنی تمام رنگین خباثتوں اور مسکر معصیتوں کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ منروا کی حسین تصویر اس کی پلکوں آنکھوں میں مخمور پتلیوں کی طرح رقصاں رہنے لگی اور یہی وجہ تھی کہ وہ منروا کو اپنا مرکزِ محبت قرار دیکھا تھا۔ لیکن دل سرحدِ قناعت سے گزر کر حرص و آز کی دلدل میں پھنس رہا تھا۔

— ۷ —

فرض کا احساس حُسن کے سیلاب میں خاشاک بنکر بہہ گیا۔ اب اسکا مطمح نظر یہی رہنے لگا۔ کہ گلشنِ حُسن کی نوشگفتہ کلیاں چُنتا پھرے۔ اور اسی شغل میں اپنا پورا شباب صرف کر دے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ یونان کے زمردین پہاڑی ساحلوں پر صدف چینی کو اپنا شعارِ حیات بنالے۔ اور حُسن پراگندہ نقاب اس کے ساز کے سامنے سرنگوں رہے۔ وہ چاہتا تھا کہ یونانی عشرتکدوں کی رقاصہ لڑکیاں اس سے معاشقہ پیدا کرنے کی آرزو مند رہا کریں۔ اور اسی مقصد کے لئے وہ ہر ممکن سعی عمل میں لائیں۔ ٹیتھونس بھی ان بجلیوں کی چکا چوند میں اپنی شاہراہ زندگی تلاش کرتا ۔۔۔ مگر ان حالات کے باوجود وہ اپنے مرکزِ محبت سے دُور نہ جا سکا۔ بلکہ ندی کے کنارے پہروں تفکرات میں غرق رہتا۔ کچھ سوچتا۔ اور پہروں سوچتا رہتا۔

ایک روز وہ اسی عالمِ محویت میں تھا۔ کہ منروا نے اس کے سلسلۂ خیال کو برہم کرتے ہوئے کہا" تغافل کی نیند کتنی انقلاب پرور ہوتی ہے ٹیتھونس! تمہاری اُداسیاں میری پریشانی کا باعث بنتی چلی جاتی ہیں" ٹیتھونس نے چونک کر جواب دیا " میں سویا ہوا نہ تھا" منروا نے پوچھا۔ " تفکرات میں کھوئے ہوئے تھے کیا؟" ٹیتھونس نے جواب دیا " نہیں منروا! میں کھلی ہوئی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا" منروا نے دل ہی دل میں اس کی باتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے طنزاً کہا۔۔ " خواب ۔۔۔ بھٹکے ہوئے آہو کی طرح ۔۔۔ تھکے ماندے مسافر کی طرح ۔۔۔ جو راستہ کھو کر منزل کے خواب دیکھا کرتا ہے" ٹیتھونس نے مخمور لہجے میں جواب دیا " تم بھولتی ہو منروا میں جاگ رہا تھا" منروا نے اس کی اُداسیوں کو فنا کرنے کے لئے انداز گفتگو میں شوخی پیدا کرتے ہوئے کہا" جاگ رہے تھے تو پھر میری آہٹ پا کر تم نے میری موجودگی کو محسوس کیوں نہیں کیا"

ٹیتھونس نے مسکرا کر جواب دیا" یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے قدموں کی آہٹ تو فرشتوں کی سماعت بھی جذب نہیں کر سکتی"

منروا نے حیران ہو کر پوچھا" یہ تم نے کیا کہدیا" ٹیتھونس نے جواب دیا " کیا کہدیا! مجھے ثقل سماعت کا عارضہ تو نہیں" منروا نے تردید کرتے ہوئے کہا " دیکھو! میں تمہاری آنکھوں میں شوخ پتلیوں کے تحرک کی آواز سن رہی ہوں۔ اور میں اگر ہمہ تن توجہ بن جاؤں تو فضا کا تموّج تمہاری سماعت کے غشائے طبلی سے لمس آشنا ہو کر جو محسوسات پیدا کرے گا۔ میں اس لطیف تحرک کو سُن سکتی ہوں"

ٹیتھونس نے کسی قدر متانت سے جواب دیا" یہ تعلّی رہنے دو۔ اور مجھے خیالات کی بلندیوں پر پرواز کرنے دو"

منروا اپنے جذبات کی فراوانی سے بے قابو ہو گئی۔ اور بولی:۔

منروا ۔۔۔ " خیالات! ۔۔۔ جرم و معصیت کے خیالات! ٹیتھونس! فرض سے تغافل ایک ایسا جرم ہے جسے دیوتا کبھی معاف نہیں کر سکتے"

ٹیتھونس ۔۔۔ اس وعظ کی ضرورت؟

منروا ۔۔۔ اپنے آپ سے پوچھو۔ اپنے کردار و اعمال سے پوچھو!

ٹیتھونس ۔ میرے کردار و اعمال نے تمہارے محسوسات کو کبھی مجروح کرنے کی سعی نہیں کی۔ منروا تم بھول رہی ہو۔ عشرت اوہام نے تمہیں بہکانے کی کوشش کی ہے۔ یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو"

منروا ۔۔۔ جو مجھے آج سے بہت عرصہ پہلے کرنی چاہئے تھیں"

ٹیتھونس ۔ منروا۔ آج تم ایک معمہ بنتی چلی جا رہی ہو۔ میں تمہاری ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر میں جسقدر تمہاری باتوں کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اسیقدر تم مجھے الجھنوں میں ڈال رہی ہو"

منروا ۔۔۔ " کاش میں غفلت کی یہ عنکبوتی تاریں کچھ عرصہ پہلے توڑنے کی سعی کرتی۔ میری محبت سے کوئی خاص غرض وابستہ نہیں"

ٹیتھونس ۔ لیکن منروا۔ ! غور تو کرو۔ میں نے تمہاری محبت کے سامنے دنیا کی حسین سے حسین دوشیزہ کو ٹھکرا دیا۔ عشرتکدوں کی مترنم فضاؤں میں چھلکنے والے سنہری ساغروں پر لات ماردی۔ شخصی عظمت و شہرت کا حصول کھو دیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیوتاؤں کی ناراضگی قبول کر لی۔ مگر تمہاری جدائی گوارا نہ کی۔ اسپر بھی تم مجھے فرض ناشناسی کا الزام دے رہی ہو۔ میں نے فرض کی تعمیل و تکمیل میں ہر انسانی تدبیر پر ذاتی ایثار کو ترجیح دی۔ اپنی رنگین خواہشات کا خون کرنا گوارا نہ کیا"

منزوا نے ایک لفظ پکڑ لیا اور کہا "فرض کی تعمیل —— خوب! یہ بتاؤ۔ ترک وطن کا اصلی سبب یہی تھا۔ ملک کی معصوم کنواریوں کی عصمت سے کھیلنے کے لئے وطن سے دام بردوش نکلے تھے۔ یا کیا ——

ٹیتھونس نے قطع کلامی کرتے ہوئے چمک کر کہا "ٹھیرو منزوا۔! کوئی الزام عائد کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر غور کر لو۔ تم تعینات کی حدود سے نکلی جا رہی ہو۔"

منزوا —— "میں یہ جان گئی ہوں۔ کہ تم میرے حُسنِ صورت کے شیدائی ہو اور میرا مکمل شباب جذب کر لینے کے بعد کسی اور آستانے پر جبینِ نیاز جھکا دوگے"

ٹیتھونس نے اس طرح جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہو رہا ہے نمناک آنکھوں کو ملتے ہوئے جواب دیا "نہیں۔ نہیں منزوا۔! جوپیٹر کے لئے —— اپنے خیالات کی عصمت کا آئینہ نہ توڑو۔ خداوند کے لئے علوِ عظمت کی قسم!

—— مجھے تم سے محبت ہے —— تم میرے مقاصد سے روشناس نہیں ہو۔ تم میرے فرائض کی تقدیس سے آگاہ نہیں ہو۔"

منزوا نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "تم میرے لئے آج تک ایک راز بنے رہے ہو۔ مگر اب اس کا انکشاف چاہتی ہوں۔ اور تم جانتے ہو۔ کوئی راز ہمیشہ راز نہیں رہا کرتا۔"

ٹیتھونس نے ایک مغموم انگڑائی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے احساسات کو بیدار کر دیا۔ میں سو رہا تھا۔ تم نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا منزوا۔!

میں عہد فراموش ہوں —— تمھارے لئے نہیں۔ دیوتاؤں کے اعتبار سے —— ابتک ٹائیفون نے مجھے تغافل کی ملتہب منقل میں جھونک رکھا تھا آج تم نے مجھے اس جہنم سے نکال لیا —— میں اپنے مقدس فرض کو فراموش کر چکا تھا۔"

منزوا نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "تمھارے فرائض کی تقدیس کو میں اچھی طرح جانتی ہوں اور خوب سمجھتی ہوں۔"

ٹیتھونس نے مغموم ہو کر جواب دیا۔ "کاش تم جان سکتیں میری ماہوش منزوا۔! اب میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکتا۔ مجھے جانا چاہیئے —— رخصت دو —— اور ہمیشہ کے لئے رخصت ——" وہ آنسوؤں کی زبان سے کہے جا رہا تھا۔ "تمھاری قلبی جراحتوں کا ذمہ دار ہوں۔ میں دُعا کرونگا خداوند صبر کے مرہم سے ان جراحتوں کو مندمل کر دے۔"

منزوا نے ناموافق حالات کے مضر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے رنج کے ساتھ جواب دیا "میرے دل کے بلوری مندر پر کلوخ اندازی کے بعد الزامِ شکست سے بچنے کے لئے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے ہو۔ میں ایسا نہ ہونے دونگی اپنا گلشنِ شباب تاراج ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

ٹیتھونس کے چہرہ پر غم و رنج کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کے پرندے پھڑپھڑانے لگے۔ اس کی زبان پر دیوانگی رقص کرنے لگی اس کا دل دھڑک دھڑک کر الفراق کا نغمہ الاپنے لگا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ ڈوبتے سورج کی زرد اور سُرمئی روشنی پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا —— کیا کہوں۔ آہ! حسین منزوا۔!

دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے

وہ دیکھو —— ندی کے اس پار —— نشیبی نخلستان کی سنسان تاریکیاں مجھے دعوتِ جذب و عمل دے رہی ہیں۔ اور اس طرف —— صنوبر زار کے سُنہری سایے۔ مجھے وداعی پیام دینے کے لئے بڑھ رہے ہیں —— نوجوان گڈریوں کی صدائے نَے میرے لئے ترانۂ عزیمت بن رہی ہے —— اور شیبِ ارسطاس —— دیوتاؤں کا عتاب متشکل —— وہ دیکھو —— خداوند کے جلال نے تناور اشجار میں لرزہ پیدا کر دیا ہے۔ مہیب صورتیں میری طرف —— جہنم کے شعلوں کی طرح بڑھ رہی ہیں —— وہ مجھے نہ چھوڑینگی —— منزوا! میری منزوا —— مجھے ——"

وہ خاموش ہو گیا۔ تصورات متشکل نے اسکے حواس کو مختل کر دیا۔ اور منزوا کی کیف پرور آغوش میں گر کر بیگانۂ ہوش ہو گیا۔

منزوا میں تاثرات کی قبولیت اس سے کہیں زیادہ تھی لیکن اس موقعہ پر اس نے ہوش کا دامن نہ چھوڑا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ محبت اس کے نصاب اعصاب پر نشہ کی طرح چھا گئی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ ٹیتھونس کی جوانی میں اپنے شباب کی رعنائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے جذب ہو جائے اور انجذاب کی ان کیفیات میں کبھی زوال نہ آئے۔ وہ یکلخت خیالات کے بھنور سے نکلی اور اُسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگی۔ سبک خرام ندی کے سرد و شیریں پانی کے چند چھینٹوں نے ٹیتھونس کے حواس کا جمود توڑ دیا۔

—— (۸) ——

آج عیدِ مقدس کا یوم العقیدۃ ہے۔ پرتھنان کے معبد رفیع میں خلافِ معمول چہل پہل ہے۔ معبد کی دیواریں سامانِ تزئین سے مرصع ہو رہی ہیں دیوتاؤں کے پیکر پھولوں سے لدے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ عود و عنبر کی دودی لہریں فضا میں عطریت بساتی پھرتی ہیں۔ عقیدتمندان مشتری مُہر بلب فرش پا انداز پر بیٹھے ہیں۔ مقتدائے اعظم کتاب در دست مجسمۂ مشتری کے عقب سے نمودار ہوا۔ اور مخصوص رسومات ادا کرنے لگا۔

اسی اثناء میں باب صدر کیطرف نگاہیں اُٹھیں۔ ٹیتھونس بربط اٹھائے ہوئے خاموش بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ مشتری کے قریب پہنچکر رکا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر کچھ زیر لب گنگناتا رہا۔ اور پھر خاموش بیٹھ گیا۔ لوگ اسکے نغموں کے لئے

(بقیہ صفحہ ۹۲)

دو ٹکڑے

ادب لطیف کی قینچی نے "مشہور" کے سالنامے کے لئے جو پوشاک قطع کی ہے اس کے یہ دو ٹکڑے بھی ہمنے رائیگاں نہیں جانے دئے۔ بلا مبالغہ ان ٹکڑوں کی چمک پر آفتاب و مہتاب کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اسلئے ناسخ مرحوم کا یہ شعر کچھ مبالغہ آمیز نہیں ؎

کی جو خیاطِ ازل نے تری پوشاک درست + بچ رہے قطع میں یہ شمس و قمر دو ٹکڑے

اگر آپ کا کاشانۂ دل ان ٹکڑوں کی ضو فشانی سے منور ہو جائے تو صوفی پربھنی اور جعفر ملیح آبادی کا شکریہ ادا کیجئے۔ ایڈیٹر

از جناب کبیر احمد خاں صاحب صوفی پربھنی (دکن)

پہلا ٹکڑا

وہی عیش، عیش ہے جس کی بنیاد جگر کے ٹکڑوں پر رکھی جائے جسکی رنگت میں دل کا خون شریک ہو۔ اور جسے زندگی کا بہترین سرمایہ لُٹا کر حاصل کیا گیا ہو۔

عیش، حُسن سے استفادہ کرنیکا نام نہیں۔ بلکہ حُسن کو حُسن بنانے اور اسکی عظمت بڑھانیکا نام ہے۔ کلی کو مَسل کر چکنا چُور کر ڈالنے میں مسرت نہیں ہے۔ وہ تو ایک وحشیانہ خواہش کو پورا کرنا ہے۔ مسرت کلی کو پھول اور پھول کو شگفتہ سے شگفتہ تر دیکھنے میں ہے۔ کنیوں کو بالعموم مُرجھائی ہوئی کلوں کو ـــ بازار سے خریدکر یا باغبان کی نظر سے بچا کر مَسل دینا، اور برباد کر ڈالنا، کوئی بڑائی اور بہادری نہیں ہے۔ بہادر اور جواں مرد وہی ہے، جو دنیا کی نظروں کے سامنے ان کلیوں کی آبیاری کرے۔ دیکھ بھال کرے، خدمت کرے، انھیں اپنے گوشۂ دل میں جگہ دے اور انھیں دن بدن شگفتہ سے شگفتہ تر، حسین سے حسین تر، بناتا چلا جائے۔

عیش! حُسن کی تخریب کا نام نہیں، وہ حُسن کی افزائش میں مضمر ہے۔ پھول کی پتیوں کو الگ الگ کرکے بکھیرنا عیش منانا نہیں۔ اسے کانٹوں سے پاک کرنے ہی میں مسرت مل سکتی ہے۔

وہ عیش عیش ہی نہیں۔ جس میں زیاں ہو۔ نقصان ہو کسی قسم کا بھی، کسی کا بھی۔

عیش تعبیر ہے زندگی کی اہم ترین اور بیش بہا لمحات کی۔

عیش تعبیر ہے ان اجزا کا جو زندگی کا ماحصل ہیں۔

عیش نام ہے زندگی کے مکمل ترین دور کا۔

عیش وہ سرچشمۂ فیض ہے جہاں حاجتمند مخلوق نجات پاتی ہے، آلام سے، مصائب سے، رنج سے، الم سے، غم سے۔

عیش مجموعہ نہیں ہے بربادیوں کا۔ بربادی صحت کی، وقت کی، دولت کی، عظمت کی، اپنی، دوسروں کی، حال و مستقبل کی،

عیش لُٹ جانیکا نام نہیں، بلکہ خوشیوں کے خزانے لُٹانے کا۔ ؎

از جناب جعفر صاحب ملیح آبادی

دوسرا ٹکڑا

"ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم"

میں بھیک مانگنے نکلی، گدائی کا ٹھیکرا لئے ہوئے ـــ اِس دروازے پر گئی اُس دروازے پر گئی، کسی نے دھتکار دیا کسی نے دیکھا اور مُنہ پھیر لیا ـــ کسی رحمدل نے کوڑیاں ٹھیکرے میں ڈالدیں، کسی نے پیسہ، اور کسی نیک بخت بی بی نے باسی روٹی کے ٹکڑے۔

میں دن بھر بھیک مانگتی رہی، شام ہوتے ہوتے میرا پیالہ بھر گیا، اور میں جلدی جلدی قدم بڑھائے ہوئے اپنی جھونپڑی کی طرف روانہ ہو گئی، جو دریا کے اس پار جنگل کے کنارے واقع تھی ـــ،

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی، اور میں چاہتی تھی کہ چراغ جلے تک جھونپڑی پہنچ جاؤں ـــ کہ دریا کے موڑ پر مجھے ایک نوجوان مِلا، جو سادہ لباس میں بھی بادشاہ معلوم ہوتا تھا وہ راستہ روک کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور مجھ سے نرمی کے ساتھ مگر تحکمانہ لہجے میں پوچھا "اے لڑکی! تیرے اس ٹھیکرے میں کیا ہے؟"

میں نے اپنا سر جھکا کر ٹھیکرا، اس کی طرف بڑھا دیا، اور زبان سے کچھ نہ کہا اور مؤدب کھڑی ہو گئی، اس نے میرے بھیک کے ٹھیکرے کو حقارت کیساتھ دیکھا، دریا کی طرف نگاہ کی، کچھ زیر لب کہا، ساحل کی طرف بڑھا، اور میری تمام دن کی کمائی دریا میں پھینکدی، یہ دیکھ کر میرا دل لرز گیا، اور میری بھوک تیز ہو گئی، اس نے کن انکھیوں سے میری اس حالت کا اندازہ کیا، خالی ٹھیکرا پانی سے لبریز کیا، مُسکرا کر اس میں اپنا مُنہ دیکھا، اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پانی سے چھلکتا ہوا ٹھیکرا میرے ہاتھ میں دیدیا۔ جیسے ہی یہ ظرف میرے ہاتھ میں آیا میں غرور سے بدمست ہو گئی، میری تمام حاجتیں پوری ہو گئیں۔ میں دو جہان سے بے نیاز ہو گئی ـــ ـــ، اور اس روز سے میں ایک ایسی زندگی بسر کرتی ہوں جو دنیا کی بڑی بڑی شاہزادیوں کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی!!

"عیش معصیت نہیں نیکی ہے - وہ نیکی جس کے کر اُٹھانے میں تمہیں تمہارا ادب یا ایمان تمہیں!!!"

ادبیات

"شاعر شباب" خیام ہندی

"یار کی گلیاں" معصوم محبت کا ایک مستقل فسانہ ہیں اور یہ فسانہ شاعر شباب خیام ہندی کے قلم سے اور بھی رنگین ہو گیا ہے۔ چاروں بند جذبات محبت کے آئینہ دار ہیں ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

نگاہوں سے جہاں روحوں کو ہم سرشار کرتے تھے
جہاں سوئی ہوئی تقدیر کو بیدار کرتے تھے
جہاں جذباتِ حُسن و عشق کا اظہار کرتے تھے
جہاں چھپ چھپ کے ہم ایکدوسرے کو پیار کرتے تھے
وہ گلیاں یاد آتی ہیں، وہ گلیاں یاد آتی ہیں!

جہاں گہوارۂ اُمید میں ارمان سوتے تھے
محبت کو جہاں ہم ذرّے ذرّے میں سموتے تھے
جہاں شکوی بہم تاخیر سے آنے کے ہوتے تھے
جہاں ہم چپکے چپکے شب کے سنّاٹے میں روتے تھے
وہ گلیاں یاد آتی ہیں وہ گلیاں یاد آتی ہیں

تکلّم خیز ہوتی تھی جہاں الفت کی خاموشی ؎
زبانِ بے زبانی، ترجمان شوق بے حد تھی ؎
جہاں آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوا کرتی تھی سرگوشی
جہاں بادِ صبا بھی ڈرتے ڈرتے سانس لیتی تھی
وہ گلیاں یاد آتی ہیں وہ گلیاں یاد آتی ہیں

جہاں انگڑائیوں کو عشق نے سانچے میں ڈھالا تھا
سمٹ کر آگئی تھی ایک مرکز پر جہاں دُنیا
جہاں پر بہہ جاتے تھے شراب و شعر کے دریا
جہاں فطرت نے شاہینہ مجھے تم سے ملایا تھا
وہ گلیاں یاد آتی ہیں وہ گلیاں یاد آتی ہیں

تأثرات

از جناب صہبا صاحب لکھنوی

جناب صہبا صاحب لکھنوی کے یہ چاروں بند فلسفۂ خودداری کی مکمل تفسیر ہیں ناممکن ہے کہ انھیں پڑھکر جوش ہمّت نہ پیدا ہو۔ آجکل نوجوانوں کے دلوں میں ایسی ہی آگ بھرنے کی ضرورت ہے، امید کہ قارئین انکا مطالعہ پوری توجہ سے فرمائیں گے۔

میں کہ میری ذات ہے، وجہ قیامِ ہست و بود!
کائناتِ عالمِ امکان ہے میری ــــ نمود!
جب تخیل کی بلندی پر پہنچ جاؤں گا میں!
گیتی و افلاک و مہر و مہ کو شرماؤں گا میں!
موجِ نغمہ بنکے بحرِ غم پہ چھا جاؤں گا میں!!

ہستیِ دَوراں کی نبضیں ہونگی جب اُکھڑی ہوئی!
ہونگی جب "دستِ ستم" کی انگلیاں اکڑی ہوئی!
جب تشدد، جبر، استبداد ہوگا گامزن!
گردشِ گردوں کا ہر انداز ہوگا خندہ زن
قہقہوں سے کھیلتا، ہنستا گذر جاؤنگا میں!!

خارزاروں میں جہاں مدہوشیاں، ہشیار ہیں!
زعمِ باطل کو مٹانے کیلئے ــــ تیار ہیں!
جاگ اُٹھے گی جوانی کروٹیں لیتی ہوئی!
ہوگی جب انسانیت "پیغامِ نو" دیتی ہوئی!
"عالمِ صد رنگ" سے نیچے اُتر آؤنگا میں!!

رات کی مدھم شعاعوں میں فضا کی سسکیاں!
رینگتے سایوں کی پیہم ہچکیوں پر ہچکیاں!
ہوگی جب محسوس مجھکو تلخیِ آلامِ دہر!
جب نظر کی وسعتیں ٹھہرائینگی بن بن کے قہر!
"زعمِ خودداری" پہ اپنے ناز فرماؤنگا میں!!

مالکِ گُل سے

از مولانا آرشد تھانوی

اے خدا بندے جو تیرے نیک ہیں معصوم ہیں
تیری دُنیا میں وہ کس واسطے مظلوم ہیں؟

عادتیں جن کی کمینہ، خصلتیں مذموم ہیں
جو خبیث الطبع ہیں وہ کس لئے مخدوم ہیں

بس میں ہیں ان لوگوں کے پاکیزہ ذہن
کیوں فضا کے زہر سے مسموم ہیں

النفس کیوں مجبور خدمت کیلئے
کیوں غلامانہ فضا، مغلوب ہیں، محکوم ہیں

کس لئے ان پر مسلط ہے ہوائے اقتدار
کس لئے پابند ہیں، سب وصف سے معدوم ہیں

کس لئے اُن پر طاقتوں سے وہ غریب
جن میں انسانی شرافت کے وصف سب معدوم ہیں

زادہ، قاہرانہ، طاقتوں لوگ
سے آمیز اسما ہی وہ موسوم ہیں

انیر وہ شقی القلب
کیوں ہتک آمیز آرزو و موہوم ہیں

غالب ہیں اہلِ خطاب
اُن کے نقاط آرزو کے لئے مقسوم ہیں

تحقیر اُن کی کرتے ہیں ابنائے زماں
ہر طرح کے رنج کیوں اُن کے لئے مغموم ہیں

اُن کی برائی نہیں؟
کس لئے اندوہ بے پایاں سے وہ مغموم ہیں

کوئی تسکین اُن کے مقدر میں نہیں؟
کس لئے وہ قیدی میعاد لامعلوم ہیں

راحت کوئی اُن کو میسر جاتی نہیں؟
اِن کے الفاظِ دُعا کیوں خالی از مفہوم ہیں

بھول کر بھی ان کو نصیب
کی تو پُکار

ہوتی نہیں آزادیاں ان کو
کچھ اثر

یادیں اُن کی نہیں پہنچتی ہیں اُن کے دلوں کی تو پکار
کس لئے سُنتا نہیں ان کے محروم ہیں

کیوں وہ اے آقا تیرے انصاف سے محروم ہیں

سالنامہ مشہور دہلی

دخترِ ملّاح

از جناب وکیل احمد صاحب ضیا الٰہ آبادی

ہر سیر اک شب ہوا میرا جو دریا پر گذر
کیا بتاؤں میں مری آنکھوں کو کیا آیا نظر؟

تھی لبِ جو ایک دوشیزہ سمن بر ماہ رو
بے وفا، کافر، ستمگر، بے مروت، تند خو

حسن اُس کا ایک ادنیٰ بندۂ بے دام تھا
دل دُکھانا جان لینا اس کا ادنیٰ کام تھا

موجِ دریا اسکے گیسوئے مسلسل پر نثار
اس کی آنکھوں پر تصدق تھے حباب آبشار

قامتِ موزوں قیامت جسکو کہنا ہے روا
وہ نگاہیں جس کو کہنا چاہیئے تیغِ جفا

دوش پر بکھرے ہوئے تھے گیسوئے پیچ و خم
روحِ تاباں چاند کو شرما رہا تھا دمبدم

پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی وہ دستا نوار
موجِ دریا آ کے اسکے پاؤں کو کرتی تھی پیار

گنگناہٹ تھی لبوں پر اسکے رقصاں دمبدم
راگنی کا اسکے آگے تھا سرِ تسلیم خم

اسطرف بیٹھی ہوئی تھی وہ بتِ کافر ادا
اسطرف تھیں دیکھ کر خود اسکو حیرت سا بنگیا

دیکھکر مجھکو نگاہیں اسکی مجھ پر جم گئیں
اسطرف میری نگاہیں بھی اسی سے لڑ گئیں

میں نے پوچھا کون ہے؟ تو اور یہاں آئی ہے کیوں
عرض کی میں نے کہ میں راز تجھ سے کیا کہوں؟

تجھکو اس حسن میں پھرتا ہوں میں صبح و مسا
بس یہی ہے کام میرا اور یہی ہے مشغلہ

آج قسمت نے درِ مقصد پہ پہنچایا مجھے
چاندنی شب میں لبِ جو مجھکو دکھلایا تجھے

سن یہ فقرے میرے وہ دل میں کچھ گھبرا گئی!
ہو گئیں نیچی نگاہیں اس کی وہ شرما گئی!

میں نے پھر اس سے کہا تو کون ہے اے مہ لقا
اور یہاں اسوقت آنیکا سبب مجھکو بتا

یہ کہا اس نے کہ میں اک دخترِ ملّاح ہوں
ہے ازل سے میرے بھی سر میں محبت کا جنوں

عشق ہے روزِ ازل سے میری گھٹی میں پڑا
اس جگہ سے ہے ذرا سی دور میرا جھونپڑا

آپ ہیں مہماں مرے میں میزباں ہوں آپکی
ملکیت ہے سرزمیں خاص میرے باپ کی

مٹ گیا میں حسن کی یہ مہربانی دیکھ کر
اس کا بندہ ہو گیا اس کی جوانی دیکھ کر

رُوحانی علاج

از جناب مولانا سہا صاحب مجددی بھوپال

مشرقی علوم ومذاہب میں" روحانیت" اور روحانی اثرات وتاثرات
کے الفاظ، اجنبی، غیرمعروف، یا مجہول المفاہیم نہیں ہیں۔ اور یہ موضوع مسلمہ
اتنا طویل وبسیط ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر وحوادث کو اس میں سمویا جاسکتا ہے
اور حیات ومتعلقاتِ حیات کا ہر جزئیہ روحانی موثرات کا حلقہ بگوش معلوم
ہوتا ہے۔ چنانچہ روحانی معالجات کا شعبہ گو مرتب ومنظم اور تدوین منطقی کے مطابق
نہیں، تاہم یہ طریقہ، متفرق منتشر اور مجہول طور پر، ایشیا میں موجود ضرور ہے۔
اور چونکہ اس طریقِ علاج نے علمی حیثیت حاصل نہیں کی اسلئے ہم لوگ عام طور پر
ان اعمال کو اوہامِ باطلہ کہکر نظر انداز کردیتے ہیں!

لیکن یہاں کی بیشتر جاہل وغیر متمدن اقوام، جو امراض کی حقیقت
کو ارواح خبیثہ یا شیاطین یا آلہۂ باطلہ سے منسوب کرتی ہیں، وہ اپنے عقائد و
تجربات کے مطابق، بعض ایسے رسوم واعمال سے بعض امراض کا علاج کرلیتی ہیں۔
جن کا کوئی دور کا تعلق بھی علاج بالادویہ سے نہیں ہوتا۔ اور اسمیں بھی کوئی شک
نہیں کہ ان معالجات میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوتی ہے۔

خود مسلمانوں میں، جو روحانی اعتبار سے بھی تمام ایشیائی اقوام میں
زیادہ ترقی یافتہ ہیں، دفعیۂ امراض کے لئے تعویذ، گنڈے، فلیتے، دم کیا ہوا پانی
مشک وزعفران سے لکھے ہوئے نقوش یا چینی کی رکابیاں، اکثر امراض کے معالجوں
میں مروج ہیں، اور موسمی بخاروں، یرقان اور خنازیر کے لئے بعض تعویذ اور گنڈے
حیرتناک کامیاب نتیجہ پیش کرتے ہیں، نیز بواسیر اور دردِ گردہ میں بعض منقش
انگوٹھیاں اور بعض فلزات کے چھلے، اور بعض پتھروں کے نگینے عام طور پر مستعمل
نظر آتے ہیں۔

اور جو لوگ سیّارات کے اثرات کے قائل ہیں، وہ امراض کا علاج
ان اشیاء وفلزات اور نگینوں وغیرہ سے کرتے ہیں، جو سیارات کے اثرات میں
ممد ومعاون باور کئے جاتے ہیں۔ لیکن بنیادی حیثیت سے یہ پہلو بھی روحانیت
ہی کا ایک شعبہ ہے، علاج بالادویہ سے اس کا بھی کوئی تعلق نہیں، اور نہ اس
شعبہ کے عامل، امراض پر اس لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں جس طرح ارباب طب۔
مگر ان تمام واقعات وحقائق اور تجربات کی موجودگی وتصدیق کے باوصف،
ہمارے یہاں، ان امور پر کبھی علمی حیثیت سے غور نہیں کیا گیا، اور امراض کی روحانیت
یا روحانی الاصل ہونے کی تحقیق نہیں کی گئی، اور نہ قسم معالجات یا اصولِ
علاج کو مُدوّن کیا گیا، تاکہ یہ علم مستقل حیثیت سے مرتب ہوکر، جدید انکشافات کے
تحت دوسرے علوم کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتا، اور بنی نوع انسان کے لئے افادہ
کا باعث ہوتا! ـــــ اس بارے میں، ہمارے وہ اطباء بھی سہل انگار رہے جو
تصوف وروحانیت میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اور جو" سلب امراض" کے طریقہ
سے نابلد نہ تھے، درآنحالیکہ اطباء متصوفین کا یہ ایک ضروری فرض بھی تھا، اور
وہ اسکو بوجہِ احسن انجام بھی دے سکتے تھے! ـــــ علم تصوف اور عقیدۂ توحید
خالص کے لحاظ سے، امراض کا روحانی الاصل باور کرلینا تو لازمی تھا ہی، صرف
طریق علاج کی تنظیم کا مسئلہ درپیش ہوتا، جس کو اپنی اپنی استعداد وطاقت روحانی
سے متعین کرلیا جاسکتا تھا ـــــ

اسکے برعکس جب ہمارے ہی مبادی علوم وتجارب، متفرق ومنتشر
حالت میں، کسی طرح اہل مغرب کے علم میں آجاتے ہیں، تو وہ ان پر علمی اہمیت سے غور
کرتے اور علمی ربط وترتیب سے مدون کرلیتے ہیں، اور نئے انکشافات کی حیثیت
پیش کرکے اہل علم کے لئے استفادہ ترقی کا ایک نیا راستہ کھول دیتے ہیں!

یہی تنویم مقناطیسی (ہپناٹزم، جسکو میں تنویم ارادی کہتا ہوں) کسقدر
معمولی عمل ہے، جس کی ابتدا شعبدہ گری سے ہوئی تھی، آج علمی اہمیت رکھتا ہے اور
اس سے مغربی اطباء، اختناق الرحم اور جنون وغیرہ امراض کے معالجے میں کام لیتے
ہیں اور کامیاب نتائج پیش کرتے ہیں ـــــ اور" نفسیاتی" و" مابعد الطبیعاتی"
اطباء کے تو تمام معالجات کی بنیاد ہی اسی عمل پر ہے۔ اور وہاں اس عمل سے جو
جو کام لئے جاتے ہیں وہ ادویہ کے دائرۂ اثر سے قطعاً مافوق وماوراء ہوتے
ہیں! ـــــ اور ظاہر ہے کہ یہ عمل اپنی ابتدائی نوعیت میں بھی، چھوٹے چھوٹے جراحی
اعمال، یا ان صورتوں میں جہاں ادویہ بیہوشی وبے حسی دینا خطرناک سمجھا جاتا
ہے، بیحد محفوظ وبکار آمد ہے۔

تاہم روحانی علاج یا علاج بالارادہ کے مسئلہ پر جب علمی حیثیت سے نظر
ڈالی جائے گی، تو سب سے پہلے یہ شبہ درپیش ہوگا، کہ انسانی جسم ایک مشین یا انجن
کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ کہ اس کی خرابیوں کے دفعیہ کے لئے کسی صاحب شعور
میکانیکی شخصیت کی ضرورت ہے، یا خود اُس کے مزاج کے خلقی اعتدال میں ایسی
صلاحیتیں موجود ہیں کہ اسقام وامراض کا مقابلہ ودفعیہ کرسکے؟ ـــــ تو جو لوگ
رازِ حیات سے واقف ہیں وہ جسم کو خارجی مداخلت کا قطعاً محتاج نہیں سمجھتے اور

یقین کرتے ہیں۔ کہ حیات وہ الوہی و ابدی شعاع ہے جو بذات خود اپنے "ملبوس" یعنی جسم کو زندہ و صحیح و درست رکھنے کی قدرت رکھتی ہے، اور جسمانی اسقام کی اصلاح بھی "فیضانِ حیات" کا لازمی عمل ہے!۔

پس، روحانی اعتبار سے، سورِ مزاج یا خرابیٔ صحتِ جسمانی کے اسباب بھی مادّی نہیں قرار دئے جاتے۔ اور کسی مریض کی بیماری، کوئی بیماری، یا تو اسکے غلط طرزِ تخیل، مضر خیالات اور خوف سے پیدا ہوتی ہے، یا اسکے فاسد خیالات کا ردِ عمل، مرض کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اسلئے، اصلاحِ خیال اور تقویتِ یقین و ارادہ سے ہر مرض کا علاج و دفیعہ، اور "امنیت" و "مناعت" نہ صرف ممکن بلکہ یقینی ہے!!۔

تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ نہ صرف امراض، بلکہ دُنیا میں جسقدر مصائب و فسادات پھیلے ہوئے، وہ سب کے سب بلا استثناء لوگوں کے اسقامِ ذہنی کے نتائج خارجی ہیں۔ اور بعض لوگ خود اپنے ذہنی عمل کی خرابی سے مبتلائے آلام ہوتے ہیں، اور بعض اپنے بدخواہوں کی خواہشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام کائنات ایک ایتھری سمندر اور "ذہنیتِ مجتمعۂ" کائنات میں "غرق" ہے۔ اور ایک ذہن کا ہر خیال، ذہنیتِ کائنات، اور تمام اذہانِ عالم سے بجلی کے لمس کی طرح ٹکراتا ہے، پھر دوسرے مناسب و متعلق ذہنوں پر اس نامعلوم تصادم کا اسی طرح ردِ عمل ہوتا ہے اور اسی عمل سے ہر وقت احوال و اوضاع و اطوارِ عالم منتج ہوتے رہتے ہیں۔ اور انفرادی طور پر ہمارے اعمالِ ذہنی کے اثرات، ہماری ذات، جسم اور ہماری زندگیوں کے نظام پر پڑتے ہیں۔ اور اجتماعی طور پر، ملکوں اور اقوام کی عداوتوں، لڑائیوں اور امراض اور وباؤں کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ــــ یہ ایک طویل مبحث ہے جس کے لئے ایک مستقل تصنیف میرے زیرِ غور ہے۔ فی الوقت مختصراً یہ سمجھ لینا چاہئے، کہ تخیل و ارادہ کے صحیح عمل سے ہر تجویز، منصوبے اور مقصد میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، اور نیک خیالی کیساتھ قوتِ ارادی کا عمل خاطر خواہ نتائج کا لازمی سبب ہوتا ہے۔

کیکڑے کا پنجہ ٹوٹ جاتا ہے تو چند روز بعد پورا پنجہ نیا پیدا ہو جاتا ہے لیکن آدمی کی انگلی اگر ٹوٹ جائے تو نئی انگلی نہیں بنتی، یہ انسان اور کیکڑے کی ذہنیتوں کے عمل کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔

تاہم ایسے "اولوالعزم" اور قوی الارادہ لوگوں کی مثالیں مل سکتی ہیں، کہ جن کا کوئی عضو مدت تک لاعلاج طور پر مفلوج و بیکار رہنے کے بعد "خود بخود" محض ان کی قوتِ ارادی سے وظیفہ طبعی بجالانے لگا۔ اور ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ بعض اشخاص انھیں امراض کے شکار ہو جاتے ہیں، جن کے پیدا ہونے کے کوئی مادی اسباب بجز وہمی خوفزدگی کے نہیں ہوا کرتے!ــــ غرضکہ ہماری اصلی و فرعی، مادی و روحانی زندگی کے لئے تخیل بطور سانچے کے ہے، اور بالعموم اسی سانچے کے مطابق زندگیاں ڈھلتی ہیں۔ کسی شخص کو اگر کسی کام کی دُھن لگ جاتی ہے، تو وہ انجام کار اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ضدی لوگ روزمرہ کی زندگی میں اپنی بیشتر ضدیں محض بر بنائے "ضد" پوری کر لیتے ہیں۔ اور ضد، اور دُھن بھی، متخیلہ اور ارادے مشترکہ شدید عمل کا نام ہے!

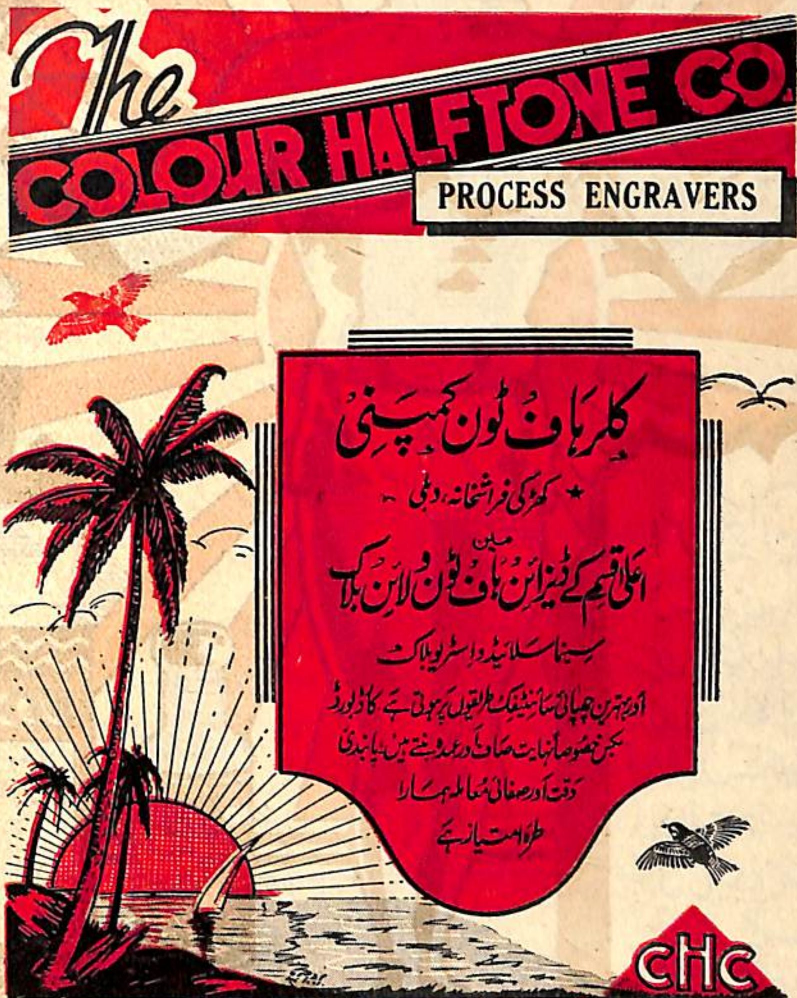
اعمال، اوراد، جادو، اور ٹوٹکوں میں ذہنی اثرات کی بدیہی مثالیں ملتی ہیں۔ پس یہ باور کر لینا مستبعد نہیں کہ امراض بھی تخیلات کے نتائج ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا علاج تخیل اور ارادہ کی مجتمعہ طاقت سے، بالیقین کیا جاسکتا ہے۔ اور کامیابی و صحت حاصل ہو سکتی ہے۔

میرے خیال میں امراض قلب خصوصًا، اور دق وغیرہ امراض، محض اسلئے لاعلاج ہو جاتے ہیں، کہ ان کے مریض سب سے زیادہ وہمی اور مایوس ہوتے ہیں۔ اور ان میں اُمید افزا تخیل اور طاقتور ارادہ باقی نہیں رہتا!۔

آپنے کبھی اسپر غور نہیں کیا، کہ ہمیشہ اور ہر جگہ، بعض اطباء بطور خاص، باعتبار "دستِ شفاء" کے اپنے ہم پیشہ اور ہمزمانہ لوگوں سے ممتاز و مشہور ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، حالانکہ سب کے طریق علاج اور نسخوں میں فنی مشارکت ہوتی ہے، اس کا ابتدائی سبب، ایسے طبیب کی پرہیزگاری، خیر سگالی، نیک نیتی، اور مریضوں سے ہمدردی اور "توجہ و اہتمام" میں اور ثانوی سبب لوگوں کی عقیدتمندی کے سوا اور کہیں بھی دریافت میں نہیں آسکتا، اور کوئی منطقی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اور یہی طاقتیں صحیح تشخیصوں اور باقاعدہ نسخوں کے بالمقابل، اعجاز، کارگر، اور تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں۔ ابتک اس "مظاہرے" کو عطائے غیب اور موہبتِ شافیِ مطلق سے تعبیر کر کے ٹالدیا جاتا رہا، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس عالمِ اسباب میں موہبت و عطائے غیب بھی بواسطۂ اسباب، ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ خواہ وہ اسباب مخفی و پوشیدہ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہندوستان و تبت کے کامل جوگی اور مغربی ماہر روحانیات تنویمِ ارادی کے بعد، مریض کو اپنے "ارادۂ شفا" کا معمول بناتے اور سلبِ امراض کرتے ہیں۔ اور یہ عمل مرض کی نوعیت اور شدت کے لحاظ سے کئی کئی روز بلکہ بعض اوقات کئی کئی ہفتے تک جاری رہ کر، آخر کار کامیاب ہو جاتا ہے اور ہمارے بزرگانِ دین، بلا تنویمِ ارادی، مریض کے اور اپنے درمیان ایک پانی کا طشت رکھ کر، یا تر پانی کا جانور درمیان میں باندھ کر بذریعہ "نفی و اثبات" (لا الٰہ الا اللہ) "بہ ہمت و توجہ" سلبِ مرض کرتے ہیں اور یہ صورت، جوگیوں اور مغربیوں کے بہ نسبت موثر تر ہوتی ہے۔ کیونکہ نفی و اثبات کی طاقت (جو ذہنیتِ مجتمعۂ کائنات سے ماخوذ ہوتی ہے) اور ان حضرات کی توجہ قلبی کی طاقت، جوگیوں، اور مغربیوں کے عمل میں نہیں ہوتی۔ اور


ZOOR
BEST TILA FOR ALL MALE ORGAN COMPLAINTS.
زن
زر
زور
PRICE 3/-
اس نوجوان کو دیکھیے!
جس نے چند ہی سال میں زر۔ زن اور
زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کا چمن شباب
جو بچپن کی غلط کاریوں اور جماع کی بے
اعتدالیوں سے مرجھا گیا تھا آج طلا زور
کی بدولت سرسبز و شاداب ہے۔ اور
جوانی کی بہاریں صدقے ہو رہی ہیں۔
قیمت
فی شیشی تین روپیہ علاوہ محصول
زور
عضو خاص کی تمام
خرابیوں کے لیے
بہترین طلا
زور
رجسٹرڈ
عضو خاص
کی تمام
خرابیوں کیلئے
بہترین طلا
ZOOR
زمین
MASHHOOR DAWAKHANA
DELHI
COLOUR HALFTONE Co DELHI


The
COLOUR HALFTONE CO.
PROCESS ENGRAVERS
کلر ہاف ٹون کمپنی
کھڑکی فراشخانہ، دہلی
میں
اعلیٰ قسم کے ڈیزائن ہاف ٹون و لائن بلاک
سینما سلائیڈ و اسٹریو بلاک
اور بہترین چھپائی سائنٹیفک طریقوں پر ہوتی ہے۔ کارڈ بورڈ
بکس خصوصاً نہایت صاف اور عمدہ بنتے ہیں پابندی
وقت اور صفائی معاملہ ہمارا
طرۂ امتیاز ہے
cHc
KHIRKI FARASH KHANA, DELHI.

ان طاقتوں کے اثرات سے جوگیہ اور اہلِ مغرب قطعاً واقف نہیں ـــ گویا اوّل الذکر دونوں عاملین، محض ذہن (خیال وارادہ) سے کام لیتے ہیں، اور آخرالذکر حضرات ذہن، قلب، اور نفی و اثبات کی الوہی طاقتوں کے مجموعے سے "نفاذِ شفا" کرتے ہیں! ـــ اسی امر کو مدِنظر رکھ کر میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اطبائے متصوفین اگر اس طرف توجہ کرتے، تو کامیاب ترین علم مدوّن ہو جاتا۔

بہر کیف، ان اعمال کے لئے بھی چند طریقے منضبط ہو چکے ہیں جنہیں دستگاہِ خاص حاصل کرنے کے لئے تعلیم اور مشق کی ضرورت ہے، جن کی طرف ہمارے اطبا کو ضرور توجہ کرنی چاہئیے۔

لیکن عام طور پر اگر کوئی مریض، خود، اسکے تیماردار اور معالج، چوبیس گھنٹے میں، صرف پندرہ منٹ کا کوئی وقت مقرر کر کے، خالی الذہن ہو کر توجہ شدید آنکھیں بند کر کے یہ خیال کرتے رہیں کہ مریض اچھا ہوتا جا رہا ہے اور اس کو اچھا ہو جانا چاہئیے۔ تو قوی اُمید کی جاتی ہے کہ چند روز میں وہ اچھا ہو جائے گا، انشاء اللہ!! گو "خالی الذہنی" اور رسوخِ خیال وارادہ کے لئے بھی پہلے مشق ہونی چاہئیے۔ فقط

بقیہ ڈاکٹر ٹیگور بحیثیت نغمہ نگار صفحہ ۱۴۹

بلکہ اس میں موسیقی کے زیر و بم کا بھی خاص حصہ ہے، جہاں تک ایک گیت میں تخئیل زبان اور موسیقی کا تعلق ہے وہ ایک انسان کے دل کو مسحور کرنے کے لئے کافی ہے یہاں پر اس خاص امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ٹیگور کے گیتوں میں انسانی محبت آفاقی محبت سے ہم دوش نظر آتی۔ کیونکہ آفاقیت کو جذبہ محبت سے کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ٹیگور نے اپنے اس قسم کے گیتوں پر کلاسیزم کا دباؤ ڈالنے نہیں دیا ہے بلکہ انہوں نے ہمیشہ بول کو موسیقی پر فوقیت دی ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ موسیقی کا لطف پورے طور پر اسوقت تک نہیں آتا جبتک کہ بول کی معنویت سننے والوں کے ذہن پر نہ چھا جائے۔

ٹکنیک کے لحاظ سے بھی ٹیگور کے گیت ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُن کے گیتوں میں تان، سُر، لے اور جذبات کے صحیح امتزاج کے ساتھ مغربی موسیقی کا انداز بھی ایک حد تک شامل نظر آتا ہے۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے بنگلہ گیتوں کی دُنیا میں وہ حسین انقلاب پیدا کیا ہے جس کا احسان کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

نوائے شعلہ

از جناب خلیل الرحمٰن صاحب شعلہ دہلوی

عشق میں مر کر جئے ہم جی کے تسلیم ہی کرنا پڑا
سخت جانی کو مری آخر ہمیں بھی مرنا پڑا
زہر کھا کر عشق میں پھر جان بھی کھونی پڑی
ٹکڑے دل کے دیکھ کر ملنے کی جب تاب کی
میں نے اُٹھتے بیٹھتے سر دیکھ کر وہ پانی پانی ہو گئے
اپنا ہمسر، رسمِ الفت نبھاتے ہو جیسے
دل پہ تیر آ کر لگا ہو گئی ہم سے نمازِ عشق میں
ہو جو بسمل ہم، تو اچھا جان پر ہم پر بنی!
دل مرا زلفوں میں اُلجھا، غم کا غصہ دیکھئے
کیا بتاؤں کیا کہوں ہے غم کا زخم بھی کھول کر
دیں دعائیں جب ان زخم نے ، پڑیں سو منتیں!
ایک دل کیوں واسطے کرنی پڑیں جب ہے ہے
وہ شبِ وعدہ بھی منت پر نہ جب پہنچے ہے
یہ وفورِ ناتوانی نے کیا اب حالِ زار
یہ بھی تھا حکمِ خدا، ہم اور اس کو کیا کہیں
شعلہ ہم کو نازنینوں کی ادائیں دیکھ کر!
چار دن کی زندگی میں بارہا مرنا پڑا!

جادۂ الفت بڑی مشکل سے طے کرنا پڑا
چلتے چلتے خنجر و تیغ وفا کو ہم سے بھرنا پڑا
کام جو امکان میں اپنے تھا وہ کرنا پڑا
عشق کرنے کا یہ خمیازہ ہمیں بھرنا پڑا
تنگ آ کر ان کو پھر راتوں سے زاری کرنا پڑا
آئینہ کو دیکھ کر پانی انہیں بھرنا پڑا
ہم کے ہی سر پر انہیں الزام بھی دھرنا پڑا
اور ایک سجدہ درِ محبوب پر کرنا پڑا
جو ہوا نقصان الفت وہ سب بھرنا پڑا
التجائے دعا کرتے ہوئے ڈرنا پڑا
پھر انہیں دل کھول کر اس میں رنگ بھرنا پڑا
ہم بھی پا کے ناز جاناں پر ہمیں صبر ہی کرنا پڑا
تو ہمیں مجبور ہو کر جگر تھامنا پڑا
جس جگہ میں نے لیا دم وہیں مرنا پڑا
ہم بتوں کے آستانِ ناز پہ دھرنا پڑا

مختصر افسانہ

دودھ والی!

خاص سالنامہ رسالہ مشہور دہلی کیلئے

از جناب کبیر احمد خان صاحب صوفی پربھنی (دکن ریاست نظام)

گاڑی ...... اسٹیشن سے آگے نکل چکی تھی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ میں گرم کوٹ پہنکر سیٹ پراس قرینہ سے بیٹھ گیا۔ کہ باہر کا پُرکیف نظارہ میری آنکھوں کو سامان مسرت جہیا کر سکے۔ میں سوچنے لگا۔ کہ چچا صاحب نے بُلوایا ضرور ہے۔ لیکن انکے مزاج میں سختی بہت ہے۔ ایک نوجوان بھلا ان سختیوں کو جو اسپر عائد کی جائینگی کیسے سہ سکیگا۔ چچی صاحبہ تو بیچاری بہت ہی غریب ہیں۔ مجھے نجمہ اور خورشید سے بھی زیادہ چاہتی ہیں مجھے ان کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ ان ہی خیالات میں کچھ ایسا کھو گیا کہ "رنگ پور اسٹیشن" قلی کے پکارنے اور گاڑی کے رکنے ہی سے محسوس ہوا۔ کہ میری منزل مقصود آ چکی ہے۔

جھٹ اُتر پڑا۔ چچا صاحب بھی اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ ان سے بڑے تپاک سے ملا۔ وہ مجھے دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ ایک تانگہ کرایہ پر لیکر ہم مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ چچا صاحب نے راستہ ہی میں تمام خیر و عافیت کے واقعات دریافت کرلئے۔ مکان پر اُتر پڑے۔ چچی صاحبہ کو بھی میرا ازحد انتظار تھا۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ خورشید اسکول جا چکا تھا۔ نجمہ گھر کے کاروبار میں مشغول تھی۔ میں نے چچی کے درشن کئے۔ نجمہ نے آکر آداب کیا۔ چچی صاحبہ نے کہا۔ اندر آؤ بیٹا۔ پلنگ پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود نیچے بیٹھ گئیں۔ کہو بیٹا۔" اپنے تمام رشتہ دار حجانسی میں اچھے تو ہیں۔ میں نے تمام باتوں کا اطمینان بخش جواب دیا۔ چچی صاحبہ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا بیٹا تم کو بچپن میں تمہاری والدہ نے میرے ہی پاس رکھوایا تھا۔ تم بہت شریر تھے۔ اب تمھاری حالت میں واقعی بہت کچھ تبدیلی ہو چکی ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ والد صاحب بھی ذرا سخت طبیعت کے انسان ہیں۔ وہ میری شرارت کو بہت بُرا خیال کرنے لگے۔ اور میرے ساتھ سختی کے برتاؤ ہونے لگے۔ اسکول میں پڑھائی کے لئے جانے لگا۔ اور اب انٹرینس پاس ہوتے ہی سرکار کے پبلک ہاؤس بینک کا مینجر بھی ہو گیا ہوں۔ اب کیوں نہ میری طبیعت میں اختلاف پیدا ہوگا۔ چچی صاحبہ کو میری بھولی باتیں سنکر بے اختیار ہنسی آگئی۔

چچا صاحب نے سادہ طور پر دسترخوان ٹھیک کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں سے پکارا۔ "بیٹا رشید جلد کھانا کھالیں، مجھے ہفتہ واری مزدوری سٹرک چکانے جانا ہے، مزدور میرا انتظار کر رہے ہونگے"۔ میں چچی صاحبہ کے پاس سے اُٹھکر دسترخوان پر پہنچا۔ اُن کے ہمراہ کھانے سے فارغ ہوا۔ بعد فراغت طعام انھوں نے کہا۔ بیٹا رشید! تمھاری حالت ازحد کمزور دکھائی دے رہی ہے۔ شاید تم دفتر کے کاروبار کے بعد اچھی کھلی ہوا میں تفریح کے لئے نہیں جاتے۔ میں تمھیں نیک مشورہ دیتا ہوں کہ تم کل ہی سے ورزش کا کام شروع کر دو۔ جس سے تم ہمیشہ چست چالاک خوش و خرم رہو گے۔ کام کرنے کی نئی اُمنگ دل میں پیدا ہوگی۔ تم کو ورزش اور کھانے پینے آرام کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں۔ کہ چند ہی عرصہ میں تمھاری طبیعت اپنا عجیب رنگ دکھائے گی۔ اسکے علاوہ تمھاری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ تم ورزش کا کام بس شروع ہی کر دو۔ میں نے اقرار کیا۔ چنانچہ دوسرے روز سے ورزش کا اہتمام کرا دیا گیا۔ مگدر۔ مقوی میوہ جات وغیرہ کی رسائی کا انتظام بھی کیا گیا۔ اور ایک دودھ والی بڑھیا کو بھی مقرر کروا دیا گیا۔ جو صبح ہی بہترین دودھ ہمارے گھر پہنچا دیا کرتی۔ ورزش شروع کر دی گئی۔ پہلے پہلے تو یہ کام بہت کٹھن معلوم ہوا۔ لیکن چند ہی روز بعد میں اس کا عادی ہو گیا۔ میرا کام صرف ورزش کھانا پینا اور آرام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسی طرح ایک ماہ گذر گیا۔ چچا صاحب نے ہمارے دفتر کو لکھکر مزید نو ماہ کی رخصت منظور کروائی۔ چار ماہ گذرنے کے بعد میری حالت میں کچھ فرق ضرور ہو گیا۔ اس عرصہ میں بڑھیا دودھ والی نہایت ہی کمزور ہو گئی تھی جب وہ دودھ کا بھرا ہوا لوٹا یا برتن اٹھاتی۔ تو اسکے قدم ڈگمگانے لگتے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا۔ اس نے ایک روز چچا صاحب سے یہ سفارش کی۔ کہ اب میں اتنی سکت نہیں رکھتی۔ کہ آپ کو ایک ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر آکر دودھ پہنچا کر جایا کروں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو بچے ہی کو روز میرے گھر بھجوا دیا کریں۔ میں وہیں دودھ دھوتے ہی گرم گرم، بابو کو پلوا سکوں گی۔ پہلے تو چچا صاحب کو تامل ہوا۔ لیکن چونکہ بڑھیا دودھ دوسروں کے مقابل میں اچھا مہیا کر دیتی تھی۔ ہمیں روز صبح اسکے گھر بطور تفریح جاکر دودھ پی آنے کی اجازت مل گئی۔

ہر روز ورزش کرنے کے بعد میں علی الصبح اس بڑھیا کے گھر جو ہمارے مکان سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، روانہ ہو جاتا۔ اور دودھ پی کر واپس لوٹتا۔ سرما کے موسم کی وجہ سے بڑھیا کا اتنا صبح اُٹھنا، دس بارہ بھینسوں کا دودھ دوھنا۔ کام کرنا ذرا تکلیف دہ امر تھا۔ دوسرے روز میں حسب عادت دودھ پینے کی خاطر گیا۔ تو بڑھیا کے بجائے اس کی ایک حسین جمیل لڑکی، جس کے حُسن کو دیکھکر چودھویں کا چاند بھی شرما جائے۔ اعضا متوسط۔ جسم سڈول، عمر بھی کچھ آغاز جوانی سینے پر کچھ کچھ اُبھار، آنکھوں میں دُگنا خمار، بڑھیا کے فرض کو انجام دے رہی تھی۔ میں جاکر خاموش مبہوت سا کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر دودھ کا پیالہ لاکر پیش کر دیا۔

میں نے پی لیا۔ میرے دودھ پینے تک وہ خاموش نظریں جھکائے کبھی نیچے اور کبھی میری شکل کو دیکھتی۔ میں حیران رہ گیا۔ کہ اس نے مجھے کیسے پہچان کر دودھ کا پیالہ پیش کیا۔ میں سوچنے لگا۔ شاید اس نے کل مجھے دیکھ لیا ہو۔ یا بڑھیا نے اسے جتلا دیا ہو۔

ہر روز یہی لڑکی بھینسوں کا دودھ دھوتی۔ اور میرا انتظار کرتی جب میں آجاتا۔ تو ہنستے ہوئے بڑی متانت اور سنجیدگی اور بھولے پن سے دودھ کا پیالہ پیش کرتی۔ جب میں دودھ پی کر پیالہ واپس دینے لگتا۔ تو وہ میری طرف مستی بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ اور نظریں نیچے کئے ہوئے واپس چلی جاتی۔ میں یہ محسوس کرنے لگا۔ کہ حقیقت میں یہ کوئی بیقراری ضرور محسوس کرنے لگی ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے واہمے جوش مارنے لگے۔ نہ معلوم اسکے دل میں میری محبت تو پیدا نہیں ہوگئی ہے۔ وہ سچے دل سے محبت تو نہیں کر رہی ہے۔ میں ان باتوں سے بالکل ناآشنا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی پُرکیف اور مستی بھری آنکھوں سے دعوتِ عشق و محبّت دینا شروع کر دیا۔ اس کا چہرہ کسی روز بھی افسردہ نظر نہ آتا۔ ہر روز وہ ایک نئی مسرت محسوس کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگتی ——— "کیا میں اس نوجوان سے محبت کرسکنے کے قابل ہوں۔ اگر میں محبت اور عشق کے جام اسے پلاؤں۔ تو کیا وہ اس جام کو جسے میں اسکو پلانا چاہتی ہوں، انکار کی ٹھوکروں سے پاش پاش تو نکردیگا۔"

صبح ہی میں دودھ کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لیکر پینے لگا۔ پیالہ واپس لیتے ہوئے اس نے ترنم آواز میں مجھ سے استفسار کیا "آپ کا نام کیا ہے"

"رشید" میں نے فوراً ہی کہا۔ "اور تمھارا نام"۔ میں نے اسکی شکل کیطرف دیکھ کر کہا۔ اس نے نیم تبسّم کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بدنصیب مالتی"۔

"بدنصیب کیوں" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ اس نے کہا۔

"اگر تم چاہو تو اس بدنصیب کی بدنصیبی کو خوش قسمتی سے بدل سکتے ہو۔ مجھے تم سے . . . ."

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی سسکیاں بھرنے لگی۔ میں ششدر و پریشان کھڑا تھا۔ واپس لوٹنے لگا۔ اس نے دروازہ کے قریب روک کر کہا "کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو"۔ میں حیران تھا۔ کہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے ایسا سُننے اور کچھ کہنے کا موقعہ ملا۔

میں محبت سے ناآشنا ہوں مالتی۔ میں نے کہا۔ اور جانے کا ارادہ کرنے لگا اس نے روک کر پھر کہا۔ تم آشنا ہو سکتے ہو! ایک ترکیب ہے۔ میں آپ کو شام کو اپنے ہاں مدعو کرنا چاہتی ہوں۔ کہو آؤ گے؟ یا پھر وہی لفظ بد.... نصیب...

میں نے اس کی زبردستی پر ہاں کہدیا۔ اور اس کی مضبوط گرفت سے رہائی پائی۔

تمام دن یہی سوچ رہا کہ شام کو کیا ہوگا؟ چچا صاحب سے شام کو گھومنے اور تفریح کی اجازت لیکر مالتی کے گھر کی طرف چلدیا ——— وہی دروازہ کی اوٹ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے جاتے ہی "او ہو آپ آگئے" کہکر اس نے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ہمراہ اندر چلا گیا۔ ایک تاریک چھوٹے کمرے میں جہاں معمولی قسم کا بستر اور آرائشی سامان اور ایک چھوٹا سا دریچہ تھا جس میں سے چاند کی شعاعیں اپنا پرکیف جلوہ دکھا رہی تھیں۔ یہی شاید مالتی کی آرامگاہ تھی۔ اُس "بیٹھئے" کہا۔ میں پلنگ پر جو اندر بچھایا گیا تھا۔ اسپر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف سحر آگیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا

"آج میرے گھر میں پہلی مرتبہ چراغ جلایا جا رہا ہے۔ اور ایسا چراغ جو شاید میری زندگی اب تک نہ روشن ہوا تھا۔ اور وہ ہو تم ———" اس نے اتنا کہکر اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے پیوست کر دئے۔ میں گھبرا سا گیا۔ لیکن اس نے مجھے اپنی مضبوط گرفت سے جدا نہ ہونے دیا۔ میں نے انتہائی شوق میں اس کے عارض گلگوں پر کئی دفعہ مُہرِ محبت ثبت کردی۔

. . . .

. . . .

دو گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ چچا صاحب کے غصّہ ہونے کا بار بار خیال دامنگیر ہو رہا تھا۔ عالم اضطراب میں کچھ نہ سوجھا۔ مالتی کو ہوشیار کرکے میں گھر کی طرف روانہ ہوا۔ غنیمت یہ ہوا۔ کہ چچا صاحب گھر پر باہر سے تشریف ہی نہیں لائے تھے۔ میں خاموش جاکر پڑ رہا۔ تمام رات ان گذرے ہوئے واقعات کا خاکہ دماغ پر یکے بعد دیگرے چھاتا رہا۔ لیکن اس گتھی کو سلجھا نہ سکا۔

یہ سلسلہ چار ماہ تک جاری رہنے کی صورت میں میرا عجیب سا حال ہوا چچا صاحب کو میری حالت پہ عجیب اچنبھا اور حیرت ہوئی۔ ورزش سے بچّہ کی حالت ٹھیک ہونے کے بجائے روز بروز صحت گرتی جا رہی ہے۔ لیکن انھیں یہ کیا معلوم کہ ہم یہ بہترین ورزش چھوڑ کر اس سے بھی لاجواب ورزش کر رہے ہیں۔ چچا صاحب اس خیال سے کہ بھائی کو کیا جواب دُوں گا۔ ہمارے علاج کی طرف رغبت کی اور ہمارا دودھ پینا بند کرا دیا گیا۔ مالتی ہمارے دودھ کے بند ہونے کی وجہ سے ملول رہنے لگی۔ اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ وہ دیوانہ وار دروازے کی اوٹ میں کھڑی رہتی۔ اور میرا انتظار کرنے لگتی۔ اس کے لئے ہر صبح ایک قیامت برپا کر دینے والی ہوتی تھی۔ عشق نے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ ہمیں بھی اس سے ملاقات کا موقعہ نہ ملتا۔ چچا صاحب ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے جدا نہ کرتے۔ میری بھی دیوانگی کا عالم یہ تھا۔ کہ ہر وقت ہر لمحہ ہر گھنٹہ مالتی کی یاد دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی لیکن ———

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

جب میری رخصت اختتام پر پہنچی ۔ تو میری حالت بھی ذرا کچھ ٹھیک ہو چکی تھی ۔ ڈاکٹر لشیشور ناتھ بی ۔ اے نے یہ توقع دلائی ۔ کہ آپ تقریباً پندرہ یوم کے عرصہ میں ٹھیک ہو جائینگے ۔ میری حالت ٹھیک ہوتی گئی ۔ یکایک کمپنی کی طرف سے تار آیا ۔ کہ آپکے بغیر بنک کا کاروبار چلنا مشکل ہے آپ کی رخصت بھی ختم ہو چکی ہے ۔ فوراً چلے آئیے ۔ چچا صاحب نے دوسرے روز ہی ہماری روانگی کا انتظام کروا دیا ۔"

بنک کا کاروبار اچھا چلتا رہا ۔ اور مجھ کو ابھی تک مالتی کی یاد کہ "میں بغیر ملے ہی یہاں چلا آیا ہوں خدا جانے مالتی کی کیا حالت ہو گی" رہ رہ کر تڑپا رہی تھی ۔ ایک دن میں نے اضطراب کے عالم میں ایک اخبار جو میز پر پڑا تھا اُٹھا لیا ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اسکے سرورق پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا :۔

"رنگ پور میں مالتی نامی عورت نے باولی میں گر کر
اپنی جان دیدی"

یہ پڑھ کر میری عجیب سی کیفیت ہو گئی ۔ اور بے اختیار اُٹھ کر گھر کی طرف چلدیا ۔ اور دو روز تک دفتر نہ آسکا ۔

کچھ عرصہ بعد گو چچا صاحب نے اپنی لڑکی نجمہ کے ساتھ مجھے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا تھا ۔ لیکن

"اُف وہ پیار اور یہ پیار" فقط

بقیہ "ایکادشی" ص۹۶

تھوڑی سی کسمساہٹ کے بعد . . . . . آہستہ سے کسی نے کہا !

"پیارے . . . . پیتم" !

متحرک جسم دریا کے پانی کی طرح ٹھہر گئے !

"کون . . . . رودا" ؟

پہلی آواز لرز گئی . . . . . . ! پتا . . . . . جی ؟

جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے ایسے ہی رودا چارپائی سے تڑپ گئی !

دونوں چپ چاپ سر جھکائے ہوئے کوٹھری سے باہر نکل گئے !

آسمان پر چھٹکی ہوئی چاندنی ان کے چہروں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی ۔

صبح ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں غُل پیتم چمار اور مُرلیا کے بھاگ جانے کا چرچا ہونے لگا ۔ اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ بیچارہ بڑا سیدھا تھا ۔ لیکن آجتک کوئی یہ نہ جان سکا کہ وہ کیوں بھاگ گئے ۔"

"بقیہ قوت حافظہ" ص۱۲۳

اور بہی سمجھ، شوق اور دلچسپی اسپر ایسا گہرا نقش قائم کر دیتے ہیں جو یاد نہ رکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں مٹتا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کو ذہن نشین کرنے کے لئے کوشش، شوق اور دلچسپی کی بیحد ضرورت ہے ۔ تاکہ ان کی مدد سے سمجھ اور فہم حاصل ہو سکیں ۔ کیونکہ اگر سمجھ حاصل نہ ہوئی تو شوق اور رغبت باقی نہ رہینگے اور جب شوق و رغبت کا فقدان ہو گا تو حافظہ اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہے گا ۔ لیکن جب یہ چیزیں موجود ہونگی تو قوتِ حافظہ واقعات و کیفیات کو قبول کرنے کیلئے فی الفور تیار ہو جائے گی اور اس طرح حافظہ میں جو نقش قائم ہو گا وہ یقیناً گہرا اور پختہ ہو گا ۔

تحریر سے بھی حافظہ کو بڑی مدد ملتی ہے ۔ مگر ساتھ ہی اس میں یہ نقصان بھی ہے کہ تحریر پر بھروسہ رکھنے سے حافظہ مستعد اور مستحضر نہیں رہتا ۔ کیونکہ اس صورت میں حافظہ کی مشق باقی نہیں رہتی اور جب مشق نہ ہو تو ترقی معلوم ۔ اندھوں کا حافظہ بالعموم قوی ہوتا ہے ، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے یاد رکھنے کی مشق مسلسل جاری رہتی ہے ۔

مظاہرات ، مسموعات کی بہ نسبت زیادہ یاد رہتے ہیں اور پھر ان کو بھی جسقدر شوق اور غور و خوض کے ساتھ دیکھا جائے گا ۔ اسی قدر گہرا اور عمیق نقش حافظہ میں قائم ہو گا ۔ چنانچہ جغرافیہ میں ممالک اور ان کے مقامات کو نقشہ کی صورت میں ترتیب دیکر اسی سبب سے سمجھایا جاتا ہے تاکہ جو چیز ایک یا متعدد مرتبہ میں یاد نہ ہو سکے وہ دیکھنے سے یاد ہو جائے ۔

مطالعہ شدہ مضمون کو یاد رکھنے کی ایک یہ بھی اچھی تدبیر ہے کہ مصنف کے خیالات پڑھ چکنے کے بعد معلوماتِ مخصوصہ پر اپنے طور پر غور کیا جائے اور سوچا جائے کہ ہمیں کیا معلوم ہوا ۔ نیز یہ کہ مصنف کیا کہہ رہا ہے اور کن باتوں کو ثابت کرنا چاہتا ہے اور ان کے ثبوت و حمائت میں کیا کیا دلائل و شواہد پیش کرتا ہے ۔ اس طریق سے معلومات کی ایک ترتیب حافظہ میں قائم ہو جائے گا اور اس کے حسن و قبح پر غور کرنے سے حافظہ کے علاوہ ذہن پر بھی اس کا خاصہ اثر پڑیگا ، اور تنقید اور پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں یہ عادت بہت معاون ثابت ہو گی ۔

مذکورہ بالا اصول و قواعد پر عمل پیرا ہونے سے گو اتنا کثیر مطالعہ نہیں کیا جا سکتا ، جتنا ان امور کو غیر ملحوظ رکھنے سے کیا جا سکتا ہے ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان اصول موضوعہ کی رو سے جتنا مطالعہ کیا جائے گا وہ اس مطالعہ سے جس میں اصول موضوعہ کی رعائت نہیں رکھی گئی ۔ کہیں مفید تر اور یاد رہنے والا ہو گا ۔

علاوہ ازیں قوائے عقلیہ اور قوتِ فکریہ پر جو مفید اثر اس کا پڑے گا وہ علیحدہ ہے ۔

میاں بیوی پر جان دے، اور بیوی میاں پر



کیا؟ ایسا ہو سکتا ہے۔

جی ہاں "**ملذذ بے نظیر**" میں یہ صفت ہے۔

وہ کیا کوئی تعویذ ہے؟

نہیں جناب۔ وہ ایک طلا ہے جو "مشہور دواخانہ دہلی" سے ملتا ہے اسکی تاثیر یہ ہے کہ جہاں اسے عضو پر ملکر صحبت کی اور طرفین فرطِ لذت سے ہم آغوش ہو گئے پھر زندگی بھر رشتہ الفت قطع نہیں ہوتا۔ اور کبھی اُس گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔

آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں آج ہی کارڈ لکھ کر منگاتا ہوں۔ اس کی قیمت کیا ہے؟

دو روپیہ فی شیشی......

ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا۔

مشہور دواخانہ "فراشخانہ" دہلی۔

اخراجی رجسٹرڈ

ایک طبی معجزہ کا ظہور

قبض کشا ادویات ہر مطب میں موجود ہیں مگر "اخراجی" ہی ایک ایسی واحد دوا ہے جسے قبض کشا دواؤں کا سرتاج تسلیم کر لیا گیا ہے یہ دوا آنتوں میں خراش کئے بغیر آسانی کے ساتھ اجابت لاتی ہے اور معدہ کی اکثر بیماریوں کو دفع کرتی ہے۔ کیسا ہی سخت معدہ ہو اسکے کھانے سے قبض رفع ہو جاتا ہے۔ یہ دوا بھوک بڑھاتی ہے اور فضلہ کو دُور کر کے معدہ کو پاک صاف کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر بھی اسکے حیرت انگیز اثر سے متاثر ہو کر اپنے مطب میں بکثرت "اخراجی" کا استعمال کراتے رہتے ہیں۔ حکمائے شاہی دہلی نے اس دوا کو طبی کرامت سے موسوم کیا ہے۔

قیمت فی شیشی چار درجن قرص صرف بارہ آنہ (۱۲/)



مشہور دواخانہ "فراشخانہ" دہلی۔

عورت

از جناب نواب محمد صادق علیخانصاحب
ایم - ٹی - ایس - لکھنوی

ماں بنکر عورت کی عزّت بڑھی - بیوی بنکر عورت کا حُسن بڑھا - بہن بنکر عورت کی سیرت بڑھی -

ماں بنی - نو مہینے کڑیاں جھیلیں - اپنا خون پسینہ ایک کیا - پرورش کی ذمہ داریاں لیں، تربیت کی سختیاں اُٹھائیں - تیمارداری کی مصیبتیں برداشت کیں - ماتما کے کارن جانیں گنوائیں - اس کا پھل ملا - وہ عزت حاصل ہوئی جو کسی اور کو نہ ملی - اسکے پیروں کے نیچے بہشت آگئی - وہ استعارہ بھی مگر عورت کی عزت بڑھاتا ہے شان دوبالا کرتا ہے -

بیوی بنی - ذلیل ہونے کے لئے - حیوانیت کا شکار بننے کے لئے ظلم برداشت کرنے کے لئے - اطاعت کی شان بڑھانے کے لئے - برابری کا حق گنوانے کے لئے - کیا لالچ تھا؟ حُسن حُسن نہ رہتا اگر عشق اس کی داد نہ دیتا - نزاکت کی تمیز نہ باقی رہتی اگر بھدے پن کا وجود نہ ہوتا - ادھوری زندگی بدمزہ ہو جاتی اگر محبت کی چاشنی نہ ملتی - قدرت کا نظام بدلجاتا اگر عورت بیوی نہ بنتی -

بہن بنی - بھائیوں پر نچھاور ہونے کے لئے سماجی قانون کا تیر کھانے کے لئے - کمتری کا برتاؤ سہنے کے لئے - پائے کے نیچے دبا کر مار ڈالنے کے لئے -

کیا عورت اسلئے پیدا کی گئی کہ دیو داسی بن جائے - بیوہ بنا کر اسکے پیدائشی حق چھین لئے جائیں - چتا کی آگ پرستی کی جائے سر مونڈ کر گریہ المنظر بنائی جائے سفید پوش اور سیاہ پوش بنائی جائے - مایۂ تفریح بنائی جائے مَردوں کے کھیلنے کا کھلونا بنائی جائے - بازاروں میں بٹھائی جائے - اس سے حُسن فروشی کرائی جائے - کیا اس کی ہستی اس لئے ہے کہ وہ ناچے اور گائے دیش سیوا میں اپنی عزت گنوائے - سوسائٹی کے ڈوبتے ہوئے نام کو بچائے -

زمانہ کے ساتھ اور ملک کے ساتھ عورت کا رنگ بدلتا رہا - اہلیہ بائی اور وکٹوریہ نے حکمرانی کی کیتھرائن اعظم اور کلو پیٹرا نے مَردوں کے بھی کان کاٹے - ہر شعبہ میں ایک نہ ایک نے امتیازی درجہ حاصل کیا - کسی قوم نے عورت کو تابع فرمان رکھا - کوئی قوم عورت کی تابع فرمان رہی - گھرداری کی ذمہ داریاں کسی قوم نے عورت کے سپرد کیں کسی قوم نے مرد کے -

زمانہ وحشت سے عورت نے ترقی کی - پتّوں کے بجائے کپڑوں سے تن ڈھانکا - پانی کے بجائے آئینہ میں مُنہ دیکھا - گھاس پھوس کے بجائے زیور سے آراستہ ہوئی - حُسن کو احساس حُسن پیدا ہوا - سجاوٹ دکھاوٹ میں ترقی ہوتی گئی فطری خود بینی اور خود نمائی نے زور پکڑا اور جو تاثرات کسی زمانہ میں اوس زمانہ کے معیار سے بُرے سمجھے جاتے تھے علم اور آرٹ کی صورت میں بدل گئے -

زمانہ بدلا زمانہ کے خیالات بدلے اچھائی بُرائی نے نیا معیار اختیار کیا - مشرقی عورت در و دیوار چیر کر باہر نکل آئی - اس چڑیا کی طرح جس کی نسلیں پنجرہ کی قید میں گذر گئی ہوں - پروں کی طاقتِ پرواز فنا ہو گئی ہو کھلی ہوا میں اُڑی - خوشی کے مارے خوب پنکھ مارے - وہ کمزور پنکھ شل ہو گئے - کہیں درخت سے ٹکرائی کہیں ہوا کا جھونکا بہالے گیا - کہیں تھک کر بیٹھی تو دوسرے پرندوں نے مذاق اُڑایا - کہیں علمِ پرواز میں غلطی کی تو شرمساری کا مُنہ دیکھنا پڑا - غرضکہ ہوا کا بہاؤ جس طرف لیگیا وہ مجبورًا اُڑتی رہی - واپسی کا امکان بھی باقی نہ رہا -

ایک زمانہ ایسا آیا کہ عادت فطرت بن گئی - مغربیت کا اثر پڑا - معیارِ حُسن بدلا - رہنا سہنا بدلا - پوشاک و لباس بدلا - حیا نے ساتھ چھوڑا بیباکی نے ہمت دلائی - عصمت روپوش ہوئی - معیارِ عصمت تبدیل ہوا -

مہندی کا رواج ختم ہوا ناخنوں کی پالش نکلی - ناخون بڑھائے گئے - نسلوں کی دبی ہوئی خواہش نے شیر کا پنجہ دیدیا - ہاتھ کام سے بیکار ہو گئے گھریلو کام میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں - ناخونوں کا چاند نکالا گیا وقت کی کمی محسوس ہونے لگی - کاجل کا چلن اُٹھا - میک اپ پنسل رائج ہوئی - بھونیر مو چنا چلگیا - فیشن کی تکلیفیں برداشت ہوئیں - چوٹی کاٹی گئی، بال کاٹنے والیوں کا ایک نیا روزگار پیدا ہوا - پوڈر کریم کا استعمال ہوا - جلد کی ملاحت مٹی - روز ایجاد ہوا - شاعروں کی خیالی دنیا میں روح پھونکدی گئی - گداز جسم ناپسند کیا گیا فاقوں کی تعلیم ملی - مسی کا چلن اٹھا دانتوں سے رنگیں غائب ہوئیں لعل یمن مفقود ہوا موتی کی آب بڑھی - پان کی دھڑی معیوب سمجھی گئی لپ اسٹک نے رنگ پکڑا - میک اپ کے نئے نئے طریقے نکلے - تصنعات کی رنگینیاں بڑھیں - قدرت کی سادگی مٹی ریاکاری نے دامن پھیلایا - سجاوٹ دکھاوٹ انتہا کو پہونچی حسن کا حوصلہ بڑھا - شہرت کا ولولہ پیدا ہوا تعریفِ حُسن ایک فن بنا -

حسن کی تعریف ہوئی پتی دیو کی عزت بڑھی۔

عورت دوزانو بیٹھنا بھول گئی۔ جب پیٹی کوٹ کا گھیر ہی کم کر دیا جائے تو دوزانو بیٹھنے میں تکلیف تو خیر ہے ہی مگر کپڑا اتنا دباؤ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ پیٹی کوٹ کا گھیر اسلئے نہیں کم کیا گیا کہ کپڑے کی بچت ہو اور کفایت شعاری منظور تھی بلکہ اسلئے کہ زیادہ گھیر ساری کو پھلا دیگا اور جسم کو چھریرا بنانے کی مشقتیں رائیگاں جائینگی۔ پھر دوزانوں بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا۔ تخت کا استعمال باعث عار۔ نئی تہذیب سے شرم کی بات۔ ناجہذب کہلا کر نکو تھوڑی بننا تھا سوسائٹی کا پروانہ حاصل کرنا تھا۔ میز کرسی تو گھر میں رکھنا ہی تھی۔

عورت پر الزام تھا کہ وہ گھر گھسنی ہوتی ہے۔ اب وہ شام کے وقت ٹہلنے نکلی۔ گھر کی ذمہ داریاں کم ہوتی گئیں۔ اس کا زیادہ تر وقت دوستوں کی صحبت اور کلب کی رنگ رلیوں میں صرف ہونے لگا۔ گھرداری کے لئے وقت نہ رہا۔ نوکروں کی مانگ پیدا ہوئی۔ روپیہ گردش میں آنے لگا۔ بازاریں گرم ہو گئیں۔ بچوں پر آیا رکھی گئی ماں کی آغوش تربیت چھن گئی۔ ایک نقش پذیر ہستی اللہ کے سپرد کر دیگئی۔ عورت کے لئے شراب معیوب رہی مگر کملٹ نہ پینا ناجہذب تصور کیا گیا۔

شرمیلا حسن بیباک ہو گیا مغرب کی پرستش ہوئی۔ مغرب میں خیال پیدا ہوا کہ قدرت کی بنائی چیزیں ایک مقصد رکھتی ہیں۔ حسن جینز خراج تحسین حاصل کرتی ہے اور انسان کی خوشی کا ذریعہ ہے۔ قدرتی حسن کو لباس کے پیچھے چھپانا سماجی بندھنوں کے ہاتھ فروخت کر دینا ہے۔ تہذیب کا بیجا دباؤ اٹھانا ہے لباس عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے لیکن حسن کی شان گھٹاتا ہے۔ لباس غیر فطری ہے اور تندرستی کا دشمن ہے جس سے قدرت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے حسن کو کوروپوش کرنا کفران نعمت سمجھا گیا اور انسان کو جو انکار زمانہ سے خود پامال تھا جس کا دماغ زندگی کی بھول بھولیوں میں بھٹک رہا تھا۔ قدرت کی دی ہوئی نعمت سے محروم کرنا تصور کیا گیا۔ زمانۂ وحشت کی یاد نے چٹکی لی اور حسن برہنہ ہو گیا۔ سورج کی کرنوں سے تندرستی کے اجزا حاصل کرنے کے لئے ننگے کلب قائم ہوئے۔ دنیا کے بنائے ہوئے اصول ترک کئے گئے۔ قدرتی اصولوں پر عمل ہوا اور حسن عشق کی آغوش میں کھیلنے لگا تہذیب پیدا کی لباس اور کھیل کود کی پوشاک کے پیچھے جا چھپی۔ سیمیں باہوں کی کشش بڑھی۔ سڈول بازو نظر میں کھٹکنے لگے۔ شانوں کی گولائی میں دل فریبی پیدا ہوئی۔ بلوری پیٹھ داد طلب ہوئی۔ گردن کی کہربائی بڑھی جسم کے ابھار نمایاں ہوئے۔ نصف عریانی میں دل آویزی پیدا ہوئی۔ کپڑے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے حسن کا نکھار بڑھا۔ ایک خاص مقناطیسی اثر پیدا ہوا اور مرد کی دبی ہوئی خواہشات بھڑک اٹھیں نظروں نے بہار حسن لوٹی۔ فطرت نے جذبات مشتعل کئے۔ سماجی پابندیوں نے فطرت کو منہ چڑھایا۔ انسان نے اپنی تصنع پسند زندگی قبول کی۔ ریاکاری کا اقبال کیا۔ اپنی ہار تسلیم کی۔

مغرب مشرق پر اثر پذیر ہوا۔ مشرق نے مغرب کا اثر قبول کیا مگر مشرق اور مغرب میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہے۔ مشرقی ذہانت بدلی۔ کہیں مغربی لباس پہنا گیا۔ کہیں مغربی تہذیب کا دور دورہ ہوا۔ کہیں مغربی طرز رہائش اختیار کیا گیا۔ مگر مشرق آدہ نہ بدلا جا سکا۔ ہندوستان کے خون نے زور کیا اور اپنا اثر دکھا کر رہا۔ بلاؤز نے فراک کی نقل کی۔ عریانی کو پسند کیا مگر اس میں بھی ہندوستان کی جھلک باقی رہی۔ ساری فراک نما بنی۔ اسکے باندھنے کے طریقے بدلے جسم کے ابھار نمایاں کئے گئے۔ آنکھوں کو تماشہ کی دعوت دی گئی۔ مگر ساری نے فراک کی رسائی نہ ہونے دی۔ ساری ساری رہی فراک جگہ نہ لے پایا۔

عورت کے دل میں مرد کی برابری کا ولولہ پیدا ہوا برابر کے حقوق طلب کئے۔ جسم کی ساخت بدل جانے سے اسکے حقوق میں فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے پاس بھی دل ہے۔ انسان کا دل جس میں خواہشات کا ہجوم ہے اور خواہشات زندہ ہیں۔ ہر ایک پابندی محض عورت کے لئے نہیں رکھی جا سکتی۔ اسکی خواہشات اسکی ہیں۔ اس کا دل اس کا ہے۔ اس کا گوشت پوست اس کا ہے اس کا جسم اس کا ہے اسکی زندگی اسکی ہے۔ اسکو اختیار ہے جو اس کی خواہش ہو ویسا کرے جو دل قبول کرے ویسا کرے۔ جو فطرت طلب کرے ویسا کرے۔ جس سے زندگی سنور سکے ویسا کرے۔

مگر عورت کیا ہے یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ایک معمہ ہے وہ ایک بھید ہے وہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، وہ حاصل اظہار ہے وہ تصادم ضدین ہے وہ انکار میں چھپا ہوا اقرار ہے۔ وہ جان آرزو ہے۔ وہ جان کا دبال ہے۔ وہ خواہشات کا مرکز ہے۔ وہ نفرت کا اظہار ہے۔ وہ باتوں کا خزانہ ہے۔ وہ بھیدوں کا دفینہ ہے۔ وہ سادگی کی تفسیر ہے۔ وہ پوڈر بکس ہے۔ وہ قلب کی صفائی ہے۔ وہ عطر کا کارخانہ ہے۔ وہ لبوں کی شیرینی ہے۔ وہ لپ اسٹک کا گدام ہے۔ وہ قدرت کی کاری گری ہے۔ وہ روٹی کی تمنا ہے۔ وہ رنڈاپے کی شان ہے وہ بن چھپانے کا آلہ ہے۔ وہ بچوں کی ماں ہے۔ وہ جہالت کی تربیت ہے وہ کفایت شعاری کا سبق ہے۔ وہ دوکانداروں کا آسرا ہے۔ وہ گھرداری کی جان ہے وہ شوہر کا اوور ڈرافٹ ہے۔ وہ مصیبتوں کی جڑ ہے۔ وہ آرام طلبی کا منشا ہے وہ اطاعت کی تصویر ہے۔ وہ فرمانبرداری کی بناوٹ ہے۔ وہ حسن کا روپ ہے وہ سیرت کی حیاسوزی ہے۔ وہ عشق کا حاصل ہے۔ وہ خود بینی کا فسانہ ہے۔ وہ ایثار کا مرقعہ ہے۔ وہ خود نمائی کی آئینہ دار ہے۔ وہ محبت کی امانت ہے۔ وہ عصمت کی شرم ہے۔ وہ جانبازی کی انتہا ہے۔ وہ خود غرضی کا مقصد ہے وہ سچائی کی تعلیم ہے وہ جھوٹ کی زبان ہے۔ وہ پشیمانی کا اظہار ہے۔ وہ

ہٹ دھرمی کی مثال ہے۔ وہ عقل کا ادراک ہے۔ وہ مُرغے کی ایک ٹانگ ہے۔ وہ سوسائٹی میں داخلہ کا پروانہ ہے۔ وہ پتی دیو کا رشک ہے۔ وہ کامرانی کا بہانہ ہے، وہ مرد کا امتیاز ہے۔

زمانہ خوش ہوا کہ نئی تہذیب نے عورت کو سنوار دیا۔ عورت ترقی کرتی گئی۔ دنیا والوں نے عورت کے ہر مذاق کو جائز کیا اور مرد پر سختیاں ہونے لگیں عورت کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرنا مرد پر فرض ہوا لیکن عورت کا جس بات میں مقصد نکلا اس میں تو اس نے مرد کی برابری کی۔ برابر کے حقوق حاصل کئے۔ کھیل کود میں حصہ لیا۔ بال ترشوا کر مرد نما بنی۔ پتلون کا نام بدل کر سلیکس سے نامزد کیا۔ اکھاڑے میں اُتر آئی۔ ملازمت میں جگہیں چھینی۔ طلاق کی بجلیاں توڑیں۔ بچوں کی پرورش کے بہانہ سے مرد کو مفلوک الحال بنایا۔ وہ یہ نہیں مانتی کہ عملی دُنیا میں وہ عورت ہونے کا فائدہ اُٹھاتی ہے۔ مرد اس کے ساتھ مراعات کرتے ہیں۔ جس بات میں اُس کا مقصد پورا نہیں ہوتا وہ پھر عورت بنجاتی ہے اور امتیازی سلوک کی طالب ہوتی ہے۔ وہ سمجھ ہی کیسے سکتی ہے دل قبول نہیں کرتا۔ اپنی کمزوری کا اعتراف انسانی فطرت کے منافی ہے۔

اب اس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے کُتّے کے پٹّہ کی ناپ نہیں بھولتی شوہر کے کالر کی ناپ بھول جاتی ہے۔ وہ اب شوہر کی ماں ہے اور اپنے لڑکے کی سہیلی۔

رنگِ قدیم

از جناب دگمبر پرشاد صاحب گوہر دہلوی

نیچی نظر بھی آپ کی سرکار کم نہ تھی ۔ ٹکڑے جگر کے کر گئی تلوار کم نہ تھی
چلتے چلاتے کہہ گئے ہاں دیکھ جائے گا ۔ اقرار میں بھی صورت انکار کم نہ تھی
حیرت میں ہوں کہ گرتی ہے کس بیگناہ پر ۔ کچھ آج تیری برق سے رفتار کم نہ تھی
وہ بھی تو آج دیکھ کے خاموش ہو گئے ۔ جب تھا طبیب حالت بیمار کم نہ تھی
میں ان کو دیکھتا رہا وہ دل کو بار بار ۔ انکی نظر بھی مجھ سے گنہگار کم نہ تھی
گر گر پڑا ہوں نقش قدم، دیکھ دیکھ کر ۔ ورنہ قدم میں طاقت رفتار کم نہ تھی
زلفوں نے آکے بیچ میں اندھیر کر دیا ۔ دل چھیننے کو تابش رخسار کم نہ تھی!
پہلو سے لے گئی مرے دل کو نکال کر ۔ ان کی نشیلی آنکھ بھی ہشیار کم نہ تھی

گوہر کسی کے حسن نے بیخود بنا دیا!
ورنہ مجھے بھی طاقت گفتار کم نہ تھی

کلرک کی زندگی!

جناب سید نصیر امام زیدی ۔ بی ۔ اے دہلوی

سید نصیر امام صاحب زیدی بی ۔ اے مشہور کے مخلص معاون ہیں اس مرتبہ غیر معمولی فرائض کی تکمیل میں منہمک تھے ۔ تاہم کسی نہ کسی طرح غایت عجلت میں ایک کلرک کی زندگی کا نقشہ کھینچکر آپ کے سامنے پیش کر ہی دیا ۔ ٹریجڈی (دردناک مضامین) لکھنے میں ۔ امام صاحب کو ید طولےٰ حاصل ہے اور اس معرکہ میں کوئی ان کا حریف نہیں ہو سکتا ۔ بس دل پر ہاتھ رکھکر اس مضمون کا مطالعہ کیجئے ۔

(ایڈیٹر)

سعید کا بچپن ہی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا ۔ باپ کی اوقات تو اتنی نہ تھی ، لیکن ایک تو اکلوتا بیٹا چھوٹی آنکھ کا دیدہ ، دوسرے ہونہار شوقین ۔ جس طرح بھی بن پڑی اپنا پیٹ کاٹا سو ضرور تلون کو روکا لیکن سعید کو بی ۔ اے تک پہنچا ہی دیا بیٹے نے باپ سے قول لے لیا تھا کہ وہ اسے ایم ۔ اے ضرور کرا دیں گے ، لیکن تدبیر کنند بندہ تقدیر کنند خندہ ۔ بی ۔ اے کے امتحان میں دو مہینے تھے کہ باپ کو نمونیہ ہوا اور چار دن میں چٹ پٹ ہو گئے ، سعید کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی ۔ تمام حسرتوں آرزوؤں پر اوس پڑ گئی ۔ گھر بھر کا بار سر پر پڑ گیا ۔ کنبہ کا سہرا باپ ہی کے سر تھا ۔ وہی دم نہ رہا ۔ اپنی تعلیم کا جید خرچ ۔ بیوہ ماں تین بہنیں کرے تو کیا کرے ۔ کہے تو کس سے کہے ۔ بہتیرا سوچا کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ دو مہینہ تو کسی طرح لشتم پشتم گذر جائیں ، بی ۔ اے کا امتحان تو دے لوں پھر محنت مزدوری کروں گا ۔ اللہ مالک ہے ۔ لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی ۔ آخر ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے ، منہ سے ایک لفظ نہ نکلا ، ماں کی مامتا دوڑ کر کلیجہ سے لگا لیا ۔ اور کہا میرے چاند تو اپنا جی برا نہ کر مجھ رانڈ بیوہ کا جب تک سانس چل رہا ہے کسی بات کی فکر نہ کر خود کو بیچ کر بھی تیرا اوپتھ پورا کروں گی یہ کہکر کوٹھری میں گئی اور اپنی چمپا کلی لا بیٹے کے ہاتھ میں یہ کہکر دیدی لے ماں کی جان تو اپنا دل میلا نہ کر اسے بیچ کر کالج کی فیس دیدے ۔

سعید نے چمپا کلی کانپتے ہاتھوں سے لے لی ۔ اور اپنے کمرے میں گھنٹوں بیٹھا اپنے پھوٹے مقدر کو روتا رہا ۔ ہزاروں خیالات سیلاب کی مانند چلے آتے تھے ، اور ہر تصور جگر کے ٹکڑے کئے دیتا تھا ۔ کبھی سوچتا تھا کہ ایک بہن جوان بیٹھی ہے ، اسے کب تک بٹھائے رکھوں گا ۔ منجھلی اور چھوٹی بھی خیر سے کافی ہوشیار ہیں ۔ آنکھ بند کی تو تین چار سال گذر جائیں گے اور وہ بھی جوان ہوتیں ۔ اگر ماں کا تار چھلا بھی تعلیم پر آگ لگا دیا تو ان کے وقت پر کیا کروں گا ۔ فقیر سے فقیر بھی ننگی بچی اپنے گھر سے رخصت نہیں کرتا دنیا میرے حلق میں تھوکے گی کہ بھائی کا راج تھا بہن کو تار چھلا تک نصیب نہ ہوا ۔ ایسے تو کنگال بھی نہ تھے ۔ آخر باپ کا بیس برس کا جما جمایا گھر تھا ۔ دیک کی کھرچن بھی بہت ہوتی ہے ، ہاتھی لٹے گا تب بھی سوا لاکھ کا کس کس کی زبان پکڑوں گا ۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کسی کو کیا خبر کس طرح دن تیر ہو رہے تھے ، باہر تو سفید پوش رہنا ہی پڑتا تھا ۔ اللہ بخشے وضعدار آدمی تھے ۔ مرتے مر گئے مگر اپنی وضع میں فرق نہ آنے دیا ۔ آخر میں سوچا کہ کچھ بھی ہو ، دو مہینے کی بات ہے ، چودہ سال کی محنت اکارت ہوتی جاتی ہے برسوں آنکھوں کا تیل نکالا ہے ، بی ۔ اے بھی نہ کیا تو کوئی دو کوڑی کو بھی نہ پوچھے گا ۔ ہرچہ باد آباد ، جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں کا کیا ڈر ، ماں کا زیور بیچنے کیا حیا جب ناچنے نکلی تو گھونگھٹ کیسا ۔ خدا کو منظور ہوا تو دن پھر ہی جائیں گے ۔ وہ نہ رہے یہ بھی نہ رہے گے ۔ اور اگر مقدر میں پاپڑ ہی بیلنے لکھے ہیں ۔ تو یہ چمپا کلی ہی کیا سہارا لگا لے گی ۔ مرضی مولا از ہمہ اولا ۔

بری بھلی طرح دو مہینے گذر رے ۔ اللہ کا نام لے کر امتحان دیا ۔ اور اس کی رحمت پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہا ۔ دل کا خدا حافظ تھا ۔ رات دن ستا ہی ست پر جان تھی ۔ دیکھئے اللہ کیا کرتا ہے ، باپ کی موت اس پہ ناداری ۔ نہ دل ٹھکانے تھا نہ دماغ ۔ تمام امنگیں خاک میں مل چکی تھیں ۔ اب تو امتحان گلے پڑا ڈھول تھا جو بجانا پڑا ۔ نتیجے کا ایک ایک دن گنتا ۔ رات دن نمازوں اور دعاؤں میں بسر ہوتی خدا خدا کر کے وہ دن آیا اور اللہ نے سن لی ۔ سعید نے دروازے ہی سے پکار کر کہا ، اماں جان بیوہ یتیموں کے والی نے کرم کیا ۔ آپ کا غلام کامیاب ہو گیا ۔ ماں سن کر اچھل پڑی ۔ دوڑ کر بیٹے کو کلیجہ سے لگا لیا ۔ چٹ چٹ بلائیں لیں ۔ ساتھ ہی دل پر ایک گھونسہ لگا ۔ بے تحاشہ منہ سے نکلا کاش آج وہ زندہ ہوتے

اللہ بخشے اپنے ساتھ قبر میں یہ ارمان لے ہی گئے۔ اکثر کہا کرتے تھے خبر نہیں میری زندگی میں میرا بچہ کسی قابل ہوگا بھی یا نہیں۔ بیگم میں تو اس انتظار میں ہوں سعید بی۔ اے۔ کرے اور جیتا رہا تو دیکھ لینا نتیجہ آنے کے ایک ہفتہ کے اندر ہی چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ میں نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے پاپڑ ہی بیلے بس ایک ہی تمنا پر جیتا ہوں۔ کہ اپنی آنکھ سے سعید کو دولھا بنے دیکھ لوں۔ میں اکثر بگڑ کر کہہ دیتی کہ تمہیں بیٹے کی فکر پڑ گئی۔ بیٹی اللہ رکھے منہ کو آئی جاتی ہے۔ اس کا کچھ خیال نہیں تو ہنس کر کہہ دیتے ہم باپ ہیں بیٹے کی فکر کر رہے ہیں۔ تم ماں ہو بیٹیوں کی فکر کرو، اس دن کی خبر نہ تھی کہ یہ ارمان ہی سدھاریں گے۔ نہ بیٹے ہی کا کار نصیب ہوگا نہ بیٹی کا۔ یہ کہکر ضبط نہ ہو سکا۔ چیخیں نکل گئیں۔ ماں کو بلکتا دیکھکر بچے بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔

(۲)

سعید نے بادل ناخواستہ کالج کو خیرباد کہا۔ رات دن نوکری کی تلاش میں سرگرداں پھرتا۔ شام کو در در کے دھکے کھا کر بھوکا پیاسہ گھر گھستا۔ باسی تازی دال چٹنی مل گئی تو کھا لی ورنہ اللہ کا شکر کیا اور پڑ رہا۔ دو مہینے کی رات دن پیر ڈوری کے بعد کسی دفتر میں چالیس روپے ماہوار کی عارضی نوکری جڑی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ماں نے دو رکعت شکرانہ پڑھی۔ بہنوں نے منتی روزے رکھے، سعید میاں دفتر جانے لگے، افسروں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا۔ کہ بھائی تمہاری ملازمت بالکل عارضی ہے۔ اگر محنت سے کام کروگے تو مستقل ہو جاؤ گے ورنہ جواب مل جائے گا۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیے، تین مہینے بیکار جوتیاں چٹخاتے پھرے۔ در در کے جوتے کھائے تھے، دفتر کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچتے۔ اور چراغ جلے گھر میں آن کر گھستے۔ چودہ برس تعلیم حاصل کرنے میں لوہے کے چنے چبانے پڑے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اس سے فارغ ہوتے ہی نوکری کی بلا گلے پڑی۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ رات دن میں گھڑی بھر چین سے گذارنا نصیب نہ ہوتا۔ دن بھر دفتر میں دماغ سوزی کی، گھر میں قدم رکھتے ہی نون تیل کی فکر میں سرگرداں ہوئے، جب کہیں رزق کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی۔ وہ بھی خیر سے روکھی سوکھی۔ چالیس روپے کی اوقات ہی کیا ماس پر چار دم۔ پھر بہن کی فکر کرنی لازمی۔ غنیمت یہ تھا کہ ماں سر پر موجود تھی۔ ہزار جوڑ توڑ کرتی اور جس طرح بن پڑتی سب ہی کچھ کرتی۔ سال بھر بعد کسی نہ کسی طرح بیٹی کو گھر کا ہی کر دیا۔ جو کچھ قرض دام کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اتار ہی دیا اب آخر ماں تھی بیٹا اللہ رکھے جوان جہان برسر کار تھا۔ کبتک نرا نرد ٹھا پھراتی۔ رات دن یہی فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح بہو گھر میں لے آؤں۔ خدا رازق ہے وہ آئی گی تو اپنا رزق ساتھ لائے گی۔ مجھے میاں کی موت اور گھرداری کی فکروں نے مردہ کر دیا۔ سانس آیا آیا نہ آیا نہ آیا۔ آج مری کل دوسرا دن۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ ہی گیا۔ میا بندی کی آنکھ بند ہوئی تو کون لاوارث کو بیٹی دیگا۔ گلے ہاتھوں یہ کار بھی کرتی جاؤں ورنہ دل میں

کہے گا ماں ٹانگ پسار کر مر گئیں۔ بیٹے کا فکر نہ کیا۔ کہ وہ کیا کرے گا، یہ سوچ کر دل کڑا کیا۔ جان پر کھیل کر بہو کو گھر لے آئیں۔ دین سے دنیا مشکل کرنے کو تو بیاہ تو کر ہی دیا۔ لیکن اکلوتے بیٹے کا پہلا کار کرنے بیٹھی تھی۔ بہتیرا دانت بھینچ بھینچ کر ہر کام کیا۔ لیکن کچھ نہ کچھ کرتے کرتے بھی ہزار بارہ سو کے پھیر میں آ ہی گئیں، آخر پرائی لڑکی گھرانی تھی۔ گڈے گڑیا کا کھیل تو تھا ہی نہیں کہ ہنڈ کلیا پر ٹل جاتی، عمر بھر لوگوں کے ہاں کھایا تھا۔ آج کیسے ناک کٹا کر بیٹھ رہتی۔ دو دن نہ سہی دو وقت ہی سہی دال دلیا سامنے رکھنی ہی تھی۔ بہو کو سترہ ستائیس نہ سہی پانچ سات ہلکے بھاری جوڑے دینے لازمی۔ جھومر جھلنیا نہ سہی نتھ انگوٹھی ہاتھ گلے کا کچھ کرنا ہی تھا۔ غرض تھوڑا یا بہت برا یا بھلا کچھ ہی کرنا پڑا۔ اب کورے چالیس روپے اور پورے کنبہ کا خرچ، نئی بیاہی بہو گھر میں۔ دو بیٹیاں سینے پر سوار ادھر قرض سے بال بال بندھا ہوا کرے تو کیا کرے، کہے تو کس سے کہے۔ روز سوچتی کہ سعید سے کہونگی کہ بیٹا سوکھی تنخواہ میں کیونکر گذارہ ہوگا۔ کوئی ایک آدھ لڑکا ہی لگا لو دس پانچ جو آئیں گے قرض ہی میں پھونکوں گی۔ کچھ تو سر سے بوجھ ہلکا ہوگا۔ لیکن جب بیٹا دن بھر کا تھکا ماندہ مغرب کے بعد گھر میں گھستا۔ اور بے حال ہو کر پڑ جاتا تو منہ دیکھکر رہ جاتی۔ ایک حرف کہنے کی ہمت نہ پڑتی، آمدنی وہی رہی اور خرچ بڑھتے ہی گئے۔ اب تک بہو بیٹے ہی تھے اب پوتی پوتا والی ہو گئیں۔ نتیجہ ظاہر تہا۔ روٹی تک کے لالے پڑ گئے۔ ادھر بیٹیاں ادھیڑ ہونے کو آئیں۔ دن رات اسی ادھیڑ بن میں گذرتا۔ ساری ساری رات تارے گنتے گذر جاتی مصیبت کی ماری اس پر ضعیفی، رات دن کے فکروں نے مرنڈا کر دیا۔ سوکھ کر ہدف ہو گئی، پنپنے کی تو صورت ہی کیا تھی۔ بد نصیب یونہی گھل گھل ختم ہو گئی۔

(۳)

سعید کے لئے ماں موت تباہی کا پیش خیمہ ہو گئی۔ باپ کے سایہ سے تو خدا نے محروم کر ہی دیا تھا۔ ایک ماں کا دم رہ گیا تہا۔ سب کو پروں تلے لئے بیٹھی تھی۔ لیکن وہی مثل ہوئی کہ اتنا بھی روپ کھو دوں تو کیا دے۔ پھر ایسی ناداری کی حالت میں مرنی کو تکلے کا گھاؤ بہت، کفن دفن فاتحہ درود سب کچھ کرنی پڑی۔ سوا سو روپے کا جوت ایسی حالت میں اور لگا۔ چوہا بل میں سماتا نہیں کہ دم سے بندھ گئی چھاچھ، بہو اکثر ساس سے برگشتہ رہتی تھیں، لیکن ساس کی آنکھ بند ہوتے ہی چاندنا ہو گیا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ آج تک سمجھتی تھی کہ ساس نہ معلوم کیا کچھ ڈھب میں رکھتی ہونگی۔ لیکن جب اپنے ہاتھوں خرچ کیا تو آنکھیں کھل گئیں، پہلی تاریخ کو میاں نے تو گننے کو پچاس روپے لاکر دئے مگر شام تک پانچ بھی نہ رہے۔ دس روپے مکان کا کرایہ دیا۔ پانچ روپے کمیں دھوبی سقے کو چلے گئے۔ بیس روپے بنئے کو بھجوائے تو آئندہ کا راستہ کھلا، چار روپے دودھ والا لے گیا۔ چار پانچ روپے کا مرچ مصالحہ آ گیا۔ آمدنی خرچ تقریباً برابر ہوا،

روپیہ وثیقہ چٹ پٹ میں اٹھ گیا۔ اب چار پانچ روپے اور پورا مہینہ۔ میاں غریب دن بھر جان کھپانے کے بعد دو وقت کی روکھی سوکھی کا شرمندہ تھا اور بس۔ ماں کے سامنے سگریٹ چھوڑ بیڑی پر آ گئے۔ اب وہ بھی ختم ہوئی۔ دوپہر کا ناشتہ تو گیا بھاڑ میں، افیون کھانے کو دو پیسہ بھی جیب میں نہ ہوتے، لیکن غریب اف نہ کرتا۔ صبح جو کچھ بیوی نے سامنے رکھ دیا۔ اللہ کا شکر کر کے کھا لیا اور کان دبا کر دفتر چلا گیا۔ شادی کی دعوت کے لئے دوستوں نے کئی دفعہ ایسا ایسا ذلیل کیا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن ہاں کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دن تہوار کو ایک ایک سے منہ چھپاتا پھرتا۔ ایک اچکن میں گرمی گذر جاتی۔ اکثر لوگ جملے فقرے چست کرتے کہ میاں بیوی اماں سے کہو کہ اب یہ منتی کپڑے بڑھائیں ورنہ بدن پر چپک کر رہ جائیں گے۔ یہ بے چارہ گردن جھکا چپ ہو رہتا۔ گھر میں بیوی کہتیں اے دیکھو تو گھر میں نگوڑے بچے تپتی زمین پر ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ لیتڑا اٹک اٹکانے کو نہیں موئے کھڑاویں ہی لا دو۔ پاس پڑوس کی کوئی بیوی آ نکلتی ہیں تو غرق ہو جاتی ہوں، یہ دبی زبان سے کہتا کہ بیگم کوڑی کوڑی تمہیں لا کر دیتا ہوں مجھ سے کیا کہتی ہو اللہ سے کہو وہی اس بیڑے کو پار لگانے والا ہے۔ فالحال تو منجدھار میں ڈوبتی نظر آتی ہے۔ بیوی بھی سن کر چپ ہو رہتی۔ میاں کے پاس ڈھکا چھپا ہو تو آتے بھی اچھی لگے، وہی بندھی ہوئی تنخواہ خواہ اوڑھو خواہ بچھاؤ۔ پھر موسم گذر جاتا لیکن نگوڑے بچے موسم کی پھل ترکاری کو ترستے رہ جاتے۔ اکثر نئی کرنی بھی نصیب نہ ہوتی۔ محلوں کے بچوں کو دیکھا دیکھی پیسے کے لئے بلک رہے ہیں۔ ماں کی بوٹیاں نوچتے ہیں لیکن ماں کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ ہر چند بہلاتی ہے لیکن بالک ہٹ مشہور ہے، عاجز ہو کر اٹھی۔ باسی کوسی ٹکڑے پر گڑھ کی ڈلی رکھ کر پیار سے ٹال دیا۔ لیکن دل کی جو حالت ہوتی وہ کوئی ماں کے دل سے پوچھے۔ کلیجہ کے ٹکڑے اڑے جاتے تھے، ادھر سعید کو دو بہنوں کا فکر کھاتے جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ الٰہی کونسی گھڑی ہو کہ ساتھ خیریت کے گھر کی ہوں، مرحوم ماں کی روح کلپتی ہو گی جب کوئی صورت بن نہ آئی تو بیوی سے عاجز اور روکھا ہو کر بولا:۔

سعید۔ اے بی سنتی ہو مجھے آج تم سے ایک نہایت اہم گفتگو کرنی ہو

بیوی۔ کہئے خیر تو ہے۔ کیا کوئی نیا گل کھلا۔ جلدی کہئے۔ میرا تو دل ڈھڑکنے لگا۔

سعید۔ تم اس قدر گھبرا کیوں جایا کرتی ہو۔ اللہ کا فضل ہے۔ سب طرح خیریت ہو۔ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری بہنیں تمہاری کون ہوئیں۔

بیوی۔ واہ یہ بھی عجیب بات پوچھی۔ تمہاری بہنیں ہماری بہنیں

سعید۔ دل سے کہہ رہی ہو کہ منہ دیکھے کی۔ تمہیں ہمارے سر کی قسم سچ کہنا۔

بیوی۔ مجھے پھپھڑ دلالے نہیں آتے، میں انہیں اپنی سگی بہنوں سے کم نہیں سمجھتی۔

سعید۔ بس تو بات ختم ہوئی۔ ان کی شادی کا جس قدر فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ اتنا ہی تم پر بھی۔ اپنا زیور مجھ کو دو۔ اب کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انہیں بیچ کر انہیں گھر بار کا کر دیں۔ خدا کو منظور ہوا تو پھر میسر ہو جائیگا

بیوی۔ اس ہیر پھیر کی بات سے نتیجہ کیا ہوا، سیدھے سبھاؤ کہ دیتے تو کیا مجھ کو انکار ہوتا۔ جب میں ہی تمہاری ہوں تو ہر چیز تمہاری ہے، تمہارے ہی نشیب و فراز کے لئے جگا جگا کر رکھا تھا۔ بندہ بشر ہے۔ ہزار موقع پڑ جاتے ہیں۔ سو تمہیں اختیار ہے۔ جب چاہو حاضر ہے۔

سعید (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ آج ہر طرف سے عاجز اور مایوس ہو کر کہا ہے۔ کیا کروں ان مظلوموں کا کون وارث بیٹھا ہے۔ ہر پھر کر ایک بھائی کا دم ہے اور بس۔ میں اگر نہ کروں گا تو کون کریگا۔

غرض بیوی کا کچھ زیور بیچا کچھ ساتھ کیا۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کو گھر کا کر دیا۔ بیوی بیچاری کان ناک تک سے ننگی ہو کر بیٹھ رہی۔ لیکن تیوری پر بل نہ آنے دیا۔

۴

بہنوں کی شادی کو مشکل سے سال بھر گذرا ہو گا کہ بڑی بہن بیوہ ہو گئیں۔ سسرال میں صرف میاں کا دم تھا۔ وہی قبر میں جا سوئے، ننھے ننھے اوپر تلے کے بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے، بھائی کو جو خبر ملی چکر آ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ رہا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ سوچتا تھا کہ اب ہو گا کیا۔ گرتا پڑتا بہن کے گھر پہنچا۔ وہ بدنصیب کھڑی اور پڑی پیٹ رہی تھی، بھائی کو دیکھتے ہی آ کر لپٹ گئی اور رو کر کہا، بھیا تمہاری ماں جائی لٹ گئی۔ اچھی بھائی دعا کرو کہ میری میت بھی ساتھ اٹھے، اب میرا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں اس کچے ساتھ کو لیکر کس گھر جاؤں گی۔ سعید نے بمشکل تمام اپنے کو سنبھال کر کہا، بہن تیرا بھائی بے لبس ہو سہاگ تو واپس نہیں لا سکتا، لیکن جب تک اس کا سانس باقی ہے، بھیک مانگے گا، محنت مزدوری کرے گا۔ پہلے تیرے بچوں کو کھلا کر پھر اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی فکر کرے گا۔ میری مظلوم دکھیاری بہن اللہ کی مرضی پر شاکر رہو۔ وہ اپنے نیک بندوں کا اس دنیا میں ہی امتحان لیتا ہے، بی بی اس درد سے نہ رو بھائی کا اب کلیجہ پھٹ جائے گا۔

بہن نے عدت پوری کی تو بھائی نے پندرہ روپے کا مکان لیا۔ او ر بچوں سمیت لے آیا۔ اب خیر سے چھ بچے بہن کے چار اپنے ایک بہن ایک بیوی ایک خود، تنخواہ میں تو روٹی چٹنی بھی مشکل۔ آخر صبح کو ایک لڑکے کو پڑھاتا دن بھر دفتر کا کام کرتا اور شام کو سات بجے سے رات کے دس بجے تک ایک

سوداگر کی دوکان پر حساب کتاب لکھتا۔

آخر انسان تہا۔ اگر حیوان بھی اتنی محنت مشقت کرے تو بیٹھ جائے جب تک بن پڑی اپنے کو گھسیٹتا رہا۔ تین سال اس کشمکش میں گذرے۔ صحت گرتی چلی گئی۔ کبھی بخار ہے۔ کبھی معدے میں تکلیف ہو۔ پھر بیماری میں بھی آرام نصیب نہ ہوا دن بھر کولھو کے بیل کی طرح پلتا۔ بخار میں بلبلا رہا ہو۔ سر درد کے مارے پھٹا جاتا ہے۔ گرمی کا یہ عالم ہو خدا کی پناہ، یہ مصیبت کا مارا اسی عالم میں اندر گودام میں بیٹھا حساب لکھ رہا ہے۔ رات کو ساڑے دس بجے گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ رات بھر درد میں لوٹتا رہا۔ بخار میں تپا کیا۔ صبح کو حالت ہی عجیب ہو گئی۔ بہتری ہمت کی لیکن پلنگ سے نہ اٹھا گیا۔ دفتر سے سو جتن سے مہینہ بھر کی رخصت مل بھی گئی۔ لیکن صبح و شام کے دونوں ٹھکانے چھوٹ گئے۔ اب تو روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ کیسی دوا کیسی غذا۔ بیوی پہلے ہی ننگی ہو چکی تھی۔ بہن کا تار چھلا خاوند کی دوا دارو فاتحہ درود میں برابر ہو چکا تھا۔ اور کوئی آسرا وسیلہ نہ تہا۔ بیوی حسرت سے بیٹھی خاوند کا منہ تکتی رہتی جب دوا و غذا خاوند کا تڑپنا نہ دیکھا جاتا تو گھبرا کر کوٹھری میں جا کر خوب دل کی بھڑاس نکالتی۔ ادھر بھوک سے بچوں کو بلکنے کی آوازیں آتیں تو بیتاب ہو کر ایک ایک کو کلیجے سے لگا لیتی۔ دل میں کہتی کہ اگر آج میرا گہنا پاتا ہوتا تو یہ بپتا نہ پڑتی۔ لیکن ایک دفعہ منہ پر نہ لائی کہ میاں کو صدمہ نہ ہو۔ ادھر بہن بھائی کو اس حالت میں دیکھکر بھڑک جاتی۔ شرمندگی اور ندامت سے آنکھ سامنے نہ ہوتی۔ پہردں بیٹھی سوچا کرتی کہ میں نا جو بہن ڈائن بن کر آئی اور بھائی کو فراش کر دیا، اگر مجھ بدنصیب کا بار نہ پڑتا تو یہ اس حال کو نہ پہنچتے، لیکن تنکے کا سہارا نہ تہا اس کچے ساتھ کو لے کر کہاں جائے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ بچوں کی انگلی پکڑ کر سڑک پر جا بیٹھتی۔ دل ہی دل میں گھٹتی لیکن نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، اپنا چھڑا دم ہوتا تو بھائی کو بھی دو بھر نہ ہوتا۔ اور اگر ایسا ویسا وقت دیکھتی تو جس گھر جا بیٹھتی دو ٹہل کرتی اور ٹکڑا کھاتی یا بھائی کے گھر بیٹھ کر ہی آنے دو آنے کی مزدوری کرتی تو اکیلے دم کو بہت تھی۔ لیکن اس چیونٹی بھرے کباب کو کیا کرے، اچھی طرح جانتی تھی کہ بھائی کی زندگی اس کے کارن خطرے میں آگئی۔ مگر کرے تو کیا کرے کئی دفعہ اس قدر دم گھٹا کہ پکا ارادہ کر لیا کہ رات کو چپکے سے بچوں کو لیکر جدھر منہ اٹھے گا نکل جاؤں گی۔ عزت آبرو کو بٹہ لگیگا تو بلا سے۔ در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی تو آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک، میرا مانجایا تو بچ جائے گا۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ایسا نہ ہو کہ وہی مثل ہو کہ اتنا بھی روپ کھو دوں تو کیا دے۔ میں تو بھائی کے کارن مٹ جاؤں اور بھائی دل میں سمجھے کہ جب تک بھائی کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے بہن صدقہ قربان ہوتی پھرتی تھی۔ آج جب بھائی پر مصیبت وقت پڑا تو بچوں کو لے کر چمپت ہو گئیں۔ آج کے دم تک پہلے بہن کے بچوں نے سیر ہو کر کھا لیا تو اپنے بچوں کو کھلایا ان کا تن ڈھانک کر پیٹ پالا تو [illegible]

بہن نے یہ دیا۔ آخر میرے بچے بھی تو بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ میں مرنے کو پڑا ہوں۔ دوا تو دوا غذا بھی میسر نہیں۔

یہ سوچ کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ کبھی پاگلوں کی طرح گھبرائی گھبرائی پھرتی۔ پھر بھائی کے پلنگ کے گرد پھرنے لگتی اور رو رو کر کہتی بھیا بہن تیری اور بلائے کر مر جائے ذرا آنکھ تو کھول، ارے میں تیری بیکسی کے صدقے فقط اشارہ سے اجازت دے دے، میں بھیک مانگ کر تیری دوا دارو کروں گی۔ بھائی نے آنکھ کھول کر عجیب حسرت کی نظر بہن پر ڈالی۔ بہن بھائی کو ندامت سے تکنے لگی۔ تمام بدن کانپ رہا تہا۔ اتنے میں بچے روتے ہوئے ماں سے لپٹ گئے۔ اور کہنا شروع کیا اماں بڑی بھوک لگ رہی ہو کل سے روٹی نہیں کھائی۔ ابھی اماں ابا پاس چلو۔ اب ماموں جان روٹی نہیں دیتے، بچوں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سعید کے دل پر نشتر بن کر لگے۔ بیساختہ آنسو بہنے لگے۔ اور ایک آہ کی اور آنکھیں بند کر لی۔ ادھر بہن نے پچھاڑ کھائی۔ ادھر بیوی کی ہچکی بندھ گئی۔

(۵)

سعید کی حالت یک لخت بگڑ گئی۔ سانس دھونکی طرح چل رہا تھا۔ تمام بدن ٹھنڈے پسینے سے شور بور تہا۔ نند بھاوجوں نے پیٹنا شروع کیا۔ محلے والے جمع ہو گئے۔ انہیں میں سے کسی اللہ کے بندے کو رحم آگیا۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کر لایا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہ دیا۔ کہ قلب کی حرکت نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ کوئی شدید صدمہ پڑا ہے۔ دو تین منٹ سے زائد زندگی کی امید نہیں۔ ڈاکٹر دروازہ تک پہنچا تھا۔ کہ سعید دار المحن سے رخصت ہوا۔ بہن اور بیوی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنوں کا تو ذکر ہی کیا غیر تک زار و قطار رو رہے تھے۔ بین سن سن کر جگر پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ بچے بھوک سے بلک بلک رہے تھے۔ اور ماؤں کو ہوش نہ تھا۔ میت سے لپٹ لپٹ کر ہلکان ہوئی جاتی تھیں۔ بہن کہتی تھی بھیا ڈائن بہن تم کو کھا گئی، اچھی تم ہی سر ہو کر لائے تھے۔ میا جائے رانڈ بیوہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر لائے تھے، اب اسے کس پر چھوڑے جاتے ہو۔ ارے میرا رنڈاپا تم سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ مجھے تسلی دیتے دیتے خود چیخیں نکل جاتی تھیں۔ اب اس دکھیاری کو چھوڑ گئے کہ بھاوج کو رنڈسالہ پہنائے، اچھی بھیا اسی دن کے لئے دکھیاری بہن کو لائے تھے، ارے لوگوں آج میں بن بھائی کے ہو گئی۔ مجھ بندی کو پانی پی پی کر کوسو۔ بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ پیٹ پیٹ کے بدن نیلا کر لیا تہا۔ بال نوچ ڈالے بچے بلک رہے تھے۔ دل ہلا دینے والا سماں تھا۔ آج ایک پر ارمان عمر بھر پا بہ بیل کر ننھے ننھے معصوموں کو یتیم اور بدنصیب شریک حیات کو بیوہ بنا کر تمام حسرت و ارمان [illegible]

آج جب بہن کو خیال آتا کہ مقدر کے بیٹے بھائی نے جب سے آنکھ کھولی ایک دن سکھ کا دیکھنا نصیب نہ ہوا تو دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر بیٹھ جاتی۔ بیوی کو جب اپنی اپنے بچوں اور نند اور اس کے بچوں کی لاوارثی نظر آتی ہے بے تحاشہ چیخیں نکل جاتی ہیں۔ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا پر ارمان کی میت بے گور و کفن سامنے پڑی دیکھکر دیواروں سے سر ٹکراتی ہے۔ کاش سعید ایک غریب مزدور ہوتا۔ تو ظاہر رکھ رکھاؤ نہ کرنا پڑتا۔ وضع داری کی فکر نہ ہوتی۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی وقت گذارتا۔ اگر معمولی تاجر بھی ہوتا تو سو دو سو ہزار یا پانچسو کا سرمایہ اپنے لاوارث کنبہ کے لئے چھوڑتا۔ کسی بڑے سوداگر کے ہاں ملازم ہوتا تو آج اس کی احترام کے ساتھ منزل اول کرتا۔ اس کے ورثا کو تسلی ڈھارس دیتا۔ حتی الامکان ان کی مدد کرتا۔ قدمے درمے سخنے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کسر نہ اٹھا رکھتا لیکن صرف وہ ایک کلرک تھا۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے تھے اس کا مقدر کا لکھا اس کو مل جاتا تھا۔ آج وہ خدا کے حکم سے ہمیشہ کے لئے بے حس و حرکت ہوگیا۔ اب اس کے حقوق ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ قانون کی بے رحم اور غیر ہمدرد نگاہیں اس کی افسوسناک اور دردانگیز موت کو نہایت اطمینان کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ مرنے والی کی عمر بھر کی خدمت گذاری، ورثا کی کسمپرسی کا عالم ان کی گریہ وزاری چیخ و پکار رونا بلکنا، پچھاڑیں کھانا اور ٹکرانا اس کی نظروں میں دنیا کا روزمرہ ہے۔ اس قسم کے قیامت خیز منظروں سے اس کا دل نہیں پسیج سکتا۔ وہ نہایت مستقل مزاج ہے، مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں اسے اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ اس کے چہرے پر آثار حزن و ملال کی بجائے خفیف سی مسکراہٹ اور مسرت رقصاں ہے۔ اس خوشی پر کہ ایک پرانے تھکے ہوئے مہنگے خدمتگار کے عوض اسے ترو تازہ نوجوان طاقتور اور سستے دو یا تین اسی تنخواہ میں نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں۔ ع

روئے وہ اس کی موت پہ اس کی بلا کو کیا غرض

ہائے کاش آج کوئی مرنے والے کے دل سے پوچھے کہ عمر بھر پاپڑ بیلنے کے بعد اس کی روح کو چین نصیب نہ ہوا۔ اس کی روح اپنی ماں جائی اور شریکِ حیات کو اور ان کے معصوم بچوں کو رلتا دیکھکر کلپتی رہے گی۔ اور بے بسی سے دیکھا کرے گا۔ اور مدد کرنے سے قاصر رہے گا۔

سعید کا تیسرے دن سویم ہوا۔ گھر میں دن بھر کہرام عظیم بپا رہا تیسرے پہر نند بھاوج بیں نڈھال ہو کر پڑی ہی تھیں کہ پوسٹ مین نے آواز دی۔ مرحوم سعید کا بڑا لڑکا قیم ایک بڑا سرکاری لفافہ لے کر داخل ہوا، ماں پھپھی نے پوچھا اتنا بڑا لفافہ کس کا ہے۔ اس نے پڑھ کر کہا ابا جان کے دفتر سے آیا ہے۔ دونوں مقدر کی ہیٹی اپنی کم فہمی سے سمجھیں کہ شاید دفتر والوں کو مرنے والے کی پر ارمان اور حسرت ناک موت پر اور اس کے ورثا پر رحم آیا ہے۔ اور مرحوم کی خدمات کے عوض کوئی وسیلہ ہماری زندگی کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ قیم نے خط کا ترجمہ بلند آواز سے کیا:۔

"دفتر کی انجمن سعید احمد کلرک کی قبل از وقت موت پر انتہائی افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ اسے مرحوم کے وارثین سے کافی ہمدردی ہے۔ وہ دعا کرتی ہے کہ سعید احمد کو پروردگار عالم جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، اس خط کی نقل مختلف اخباروں میں بھیجی جا رہی ہے، اور اس کی ایک کاپی یونین کے فائل میں شامل کر دی گئی ہے"

خدا نہ کرے جو دنیا میں کسی کی امیدیں یوں بندھ کر پل بھر میں ٹوٹ جائیں۔ اور وہ حسرت سے آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک جگر سوز و دل دوز اور غم اندوز آہ کھینچ کر چپ کا چپ رہ جائے۔

"اک کلرک کی زندگی بھی کس قدر عبرت ناک زندگی ہے"

دورِ جدید اور مسلمان

خواب کا وقت نہیں وقت ہے بیداری کا ✤ ہو کھڑا لے کے علم ہاتھ میں خودداری کا

علامہ لبصر پانی پتی نے یہ مسدس لکھکر مولانا حالی مرحوم کی یاد پھر تازہ کر دی ہے اس میں دورِ جدید کی برائیوں کا لطیف پیرایہ میں اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان عورتوں اور مردوں کو تہذیبِ جدید سے الگ تھلگ رہنا چاہئیے اور اسلامی روح کو ہرگز پامال نہ کرنا چاہئے۔ شاعر کا دل منبع الہام ہوتا ہے، اس لئے جو کچھ لبصر نے کہا ہے مسلمانوں کو اس پر غور کرنا چاہئیے۔ اور اس مسدس کو خطرہ کی گھنٹی سمجھ کر ہوشیار ہونا چاہئے۔ اس مسدس کا ایک ایک مصرعہ جوشِ اسلام سے مملو ہے۔

صاحبانِ ذی استطاعت سے گذارش ہے کہ وہ اس مسدس کو خرید کر ازراہِ ثواب مفت تقسیم کریں تاکہ نادار مسلمان بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ قیمت رعایتی چھ آنے (۶؍) ۔ ملنے کا پتہ:۔ ممتاز بک ڈپو، ممتاز منزل فراش خانہ دہلی۔

جذبات

از جناب مولانا اظہر صاحب امرتسری

سُنائی دے رہی تھی ہچکیوں سے بھی صدا غم کی
ٹھہرتے تم اگر تو سُن ہی لیتے آخری دم کی

زباں پر نورِ جنت، دل میں چنگاری جہنّم کی
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے سلوک اہلِ عالم کی!

ہزار افسوس موت آئی نہ ایّامِ جوانی میں؟
وگرنہ میری میت کو تمنّا ہوتی ماتم کی

نقوشِ گل بنا سکتا ہے تو کانٹے کے دامن پر
مجھے بھی کھینچ دے تصویر حُسنِ باغِ عالم کی

جہاں کیا ہے؟ فقط اک نقش تیری مسکراہٹ کا
قیامت کیا ہے؟ اک تصویر تیری طبعِ برہم کی

بجز الزامِ وصلِ گل نہ کچھ بھی ہو سکا حاصل؟
کہ شبنم کی طرح کی سیر ہمنے باغِ عالم کی

تمھیں کہتے نہ تھے ہم، لب کُشائی کی اجازت دو
بالآخر آنسوؤں نے توڑ دی حد ضبطِ پیہم کی!

کوئی لے کاش لے آئے اب انکو میری بالیں پر
وہ کہتے تھے کہ دیکھیں گے کھٹک، ہم نشترِ غم کی!

مریضِ غم ہی خاموش اور سر دُھننے لگی شمع
سحر بھی لیکے آئی ہے اُداسی شامِ ماتم کی

یہ کہکر پی لیا ہے زہر اب بیمارِ الفت نے
یہی ہے آخری صورت علاجِ دردِ پیہم کی!

جفا کا ذکر ہی کیا اس پہ بھی لڑتے ہیں اے اظہر
خدا کے سامنے تم نے مری تعریف کیوں کم کی؟

تصوّرات

از شبلی بی کام مدیر خیام لاہور

نہاں ہے حُسن لیکن جلوہ سامانی نہیں جاتی
حجابِ گل سے بھی نکہت کی عُریانی نہیں جاتی

زلیخا کا فسانہ تو بھلا بیٹھے ہیں یوسف بھی
مگر ابتک حدیثِ چاک دامانی نہیں جاتی

مری آنکھیں تو جلوے کو چھپا لیتی ہیں دامن میں
مگر میں کیا کروں نظروں کی حیرانی نہیں جاتی!

لُنڈھاؤ خم پہ خم رندو، عبث ڈرتے ہو محشر سے
حضورِ کبریا میں شیخ کی مانی نہیں جاتی

عدو کے تذکرے کو مدّتیں گذریں مگر ابتک
نگاہِ شرم آگیں سے پشیمانی نہیں جاتی!

یہ کن گُستاخ نظروں کے طمانچے کھا کے آئے ہو
تمھاری شکل آئینہ سے پہچانی نہیں جاتی!

کبھی ارماں کا ماتم ہے، کبھی رونا ہے حسرت کا
ہمارے غمکدے سے مرثیہ خوانی نہیں جاتی

جہاں بہتا رہیگا بحرِ نظارہ کی موجوں میں
ترے جلوے سے جبتک کیف سامانی نہیں جاتی

وہ میرے سامنے چُپ ہیں، میں انکے سامنے چُپ ہوں
مگر "چشمِ سخن گو" کی غزل خوانی نہیں جاتی!

وداع اے حُسن کی وادی کہ دل ہی بجھ گیا میرا
جہانِ آرزو کی خاک اب چھانی نہیں جاتی

صدا آتی ہے قبرِ دخترِ طیموؔس سے شبلی!
فنا ہو کر بھی یادِ ماہِ کنعانی نہیں جاتی

سالنامہ مشہور
دہلی

سنہ ۴۳ء
جنوری

فانوس حرم

عربی خُم کا ایک جام

از جناب
مولانا ضیاء القادری صاحب بدایونی

شمع فانوس حرم طور ہوئی جاتی ہے
شاہد جلوۂ مستور ہوئی جاتی ہے

روشن عارض پہ [illegible] پُر نور ہوئی جاتی ہے
[illegible] منصور ہوئی جاتی ہے

ہر دو فانوس حرم [illegible]
[illegible] مشہور ہوئی جاتی ہے

وسعت فاران میں [illegible]
[illegible] دور ہوئی جاتی ہے

حق تو تنہا [illegible] اناالحق [illegible]
[illegible] ہوئی جاتی ہے

حیرت میکدوں سے [illegible]
[illegible] ہوئی جاتی ہے

ہوں وہ [illegible] محبت [illegible]
[illegible] ہوئی جاتی ہے

[illegible]
[illegible] مشہور ہوئی جاتی ہے

فانی انداز [illegible]
[illegible] ہوئی جاتی ہے

سالنامہ مشہور دہلی جنوری ۱۹۴۳ء

تجلیات

وادیٔ ایمن میں

از جناب
وزیرزادہ محمد عثمانی صاحب جوناگڑھ

شائستہ نام ہے بربادی میخانہ
ساقی ہے نہ بیکش ہے شیشہ ہے نہ پیمانہ

اس حسن مجسم کی وہ نرگس مستانہ
جیسے مے و مینا سے لبریز ہو پیمانہ

آنکھوں کو ہے سکتہ سا دل غرق تحیر ہے
یہ سحر کیا کیا اے جلوۂ جانانہ

پر کیف جمال اس کا آیا ہے نظر جب سے
سرشار محبت ہے میرا دل دیوانہ

ہو مجھ کو ضرورت کیوں پھر دشت نوردی کی
اے جوش جنوں گھر ہی جب ہو گیا ویرانہ

اس شوق شہادت میں اک راز ہے پوشیدہ
ہر آن کے لپٹا ہے ہر شمع سے پروانہ

رہتا ہے ترا جلوہ آنکھوں میں مری ہر دم
انوار تجلی سے روشن ہے یہ کاشانہ

تو مست نگاہوں سے چاہے تو ابھی کر دے
فرزانے کو دیوانہ دیوانے کو فرزانہ

وہ قہر کی باتوں پر فرماتے ہیں ہنس ہنس کر
سودائی ہے سودائی دیوانہ ہے دیوانہ

دیوی

عزیز گورکھپوری

کسی کو کیا معلوم کل کیا ہونے والا ہے، وہی رادھا جو ماتا پتا کے لاڈ پیار دولت کی فراوانی کی وجہ سے رئیسانہ زندگی بسر کر رہی تھی اور ہمیشہ ہشاش بشاش تھی اسے بھولے سے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ میٹھے سپنے ایک دن فنا ہو جائینگے۔ اُسے دُنیا کی کلفتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

رادھا کے ماتا پتا نے رسم و رواج کے مطابق اس کی شادی سوہن لال کے کمار سے کردی تھی اور وہ اب اپنے فرائض سے ایک حد تک سبکدوش ہو چکے تھے انھیں جیتے جی کوئی ارمان یا آرزو تھی تو یہ کہ وہ رادھا کی گود میں ایک ننھا مُنّا دیکھنا چاہتے تھے، لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ان کی زندگی میں رادھا کے چمن حیات میں کوئی کلی کھلے اور وہ اس سے شادکام ہوں۔ چنانچہ شادی کے کچھ دن بعد دونوں پرلوک سدھار گئے۔

کمار اور رادھا جب تک ایک ساتھ رہے بہت ہنسی خوشی رہے۔ ان کے مزاج میں کوئی خاص فرق نہ تھا لیکن بی، اے، کے بعد جب کمار لندن گیا تو کچھ دن اس کی محبت کا چراغ اس کے من مندر میں روشن رہا اور رادھا کو اپنے حالات سے باخبر کرتا رہا، لیکن جوں جوں اسے لندن میں زیادہ دن رہتے ہوتے گئے، پریم کی چوٹ مدھم ہوتی گئی، اور دوسرے ہندوستانی جوانوں کی طرح اپنی رادھا کی یاد کو بھلاتا گیا، اور تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی عیش پرستی اور فیشن نوازی کی راہ میں اُسے کانٹا سمجھ کر خیرباد کہدے گا۔

رادھا کے لئے ہر آنے والا دن ایک پہاڑ کی طرح گراں گزرتا، وہ اپنے پتی کے خط کا بہت سختی سے انتظار کرتی، اور بے چینی میں سارا دن گذار دیتی۔ ادھر بہت دنوں سے کمار کو حسینانِ فرنگ کی جلوہ آرائیاں مسحور کر رہی تھیں اسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اپنی رادھا کو بھولے چوکے یاد کرے یا جھوٹ موٹ بھی کوئی چٹھی لکھ دے۔

رادھا بڑی فکرمند رہنے لگی، گھنٹوں سوچتی" وہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہونگے، مطالعہ کی وجہ سے فرصت نہ ملتی ہوگی ورنہ وہ ضرور جواب دیتے " وہ یہی خیال کر کے خود بھی جلد جلد خط نہیں لکھتی کہ اس سے ان کی یکسوئی میں فرق آئیگا جدائی کی بے تابیوں کا ذکر کرنے سے انھیں تکلیف ہوگی اور انکی طبیعت اُچاٹ ہو جائیگی۔

کئی دن کے بعد رادھا نے کمار کو خط لکھا تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کا ضرور جواب دینگے اور یہ پڑھ کر بہت ہی خوش ہونگے کہ " میرے سوامی! آپ ایک بھولے بھالے چاند سے مکھڑے والے بچّے کے باپ بن گئے ہیں " چاہے وہ نہایت ہی ضروری کام کر رہے ہوں لیکن انھیں خوشی ہوگی اور اتنی خوشی کہ میرے پاس خط لکھنے پر مجبور ہونگے۔ وہ تمام باتیں جو اپنے دل میں ہم سوچا کرتے ہیں اگر وہ سب پوری ہو جایا کریں تو پھر شکایت ہی کیا ہو اور کیوں ہو؟ پھر سبھی اپنے اپنے سندر محل میں رہنے لگیں اور سنسار کی ساری کاریگری ہی ختم ہو جائے۔

صبر اور ضبط کی بھی حد ہوتی ہے، خط لکھے ہوئے دنوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینے ہو گئے، جواب نہیں آیا، کمار کے آنے کی مدّت بھی بیت گئی —— رادھا کو اب پہلی بار خیال اور ہوش آیا اور اپنے بنائے ہوئے سُندر سپنے سے جاگی، آنکھیں کھولیں، تو دیکھا کہ ہر چہار طرف سوائے تیرہ و تار کے کچھ نہیں، اس کے سامنے مستقبل کا بھیانک منظر ایک ڈراونے خواب کی طرح دکھائی دینے لگا، لیکن وہ ڈری نہیں اور نہ ڈگمگائی، اس نے عقل کے ناخن لئے اور آرزوؤں، اُمیدوں اور خوش آیند نغموں کے تصور کی دُنیا سے کھیلنا چھوڑ کر اپنا فرض محسوس کیا اور اپنے چھوٹے رمیش کو پالن، پوسنا اور تعلیم و تربیت دینا شروع کیا، اور خود ایک اسکول میں ملازم ہو گئی۔

مسٹر کمار چار برس کے بعد نئی ڈگر اور نئی بیوی لیکر عازم ہندوستان ہوئے انکی نئی بیوی چندر پربھا بمبئی کے ایک مشہور سیٹھ کی لڑکی تھی جو بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے لندن گئی ہوئی تھی وہ جدید تعلیم سے آراستہ نہ تھی بلکہ نسوانی حُسن و لطافت کا ایک دلنواز مرقع تھی، اس کی آنکھوں میں شراب کی سی مستی ہمیشہ چھائی رہتی تھی، ہونٹ گلاب سے زیادہ سُرخ تھے، کمار کے دوست احباب بلاناغہ صبح شام چندر پربھا کی ٹی پارٹی دیتے اور اپنے ساتھ لیجا کر سنیما دکھاتے، جب کبھی چندر پربھا کو درد سر یا کسی قسم کی شکایت ہوتی تو فوراً ڈاکٹر پر ڈاکٹر چلے آتے شہر کے اکثر کلبوں میں ان دونوں کی دعوت ہوتی۔ اتفاق سے کبھی چندر پربھا کو نہ جانے کو جی چاہتا تو کمار اپنی طرف گھسیٹ لیتا اور کہتا تمھارے بغیر خاک لُطف آئیگا، تم نہیں جاتیں تو پھر میں بھی نہیں جا سکتا۔ اسپر چندر پربھا ہنستی، کمر لچکاتی، بل کھاتی کار میں جا بیٹھتی۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ سایہ کی طرح چندر پربھا اور کمار کی دلفریبی کم ہوتی گئی، اب عمر ڈھلنے کے ساتھ مغربی فیشن میں اتنی جاذبیت اور کشش باقی نہیں رہی اور اُن کے بجائے ان کی بیٹی پربھا نے لے لی۔ لیکن کمار جوانی کی لغزشوں اور تہذیب نو کی تلخ نوائیوں سے کافی آگاہ ہو چکا تھا، پربھا کے جوان ہوتے ہی اسے اس کی شادی کا خیال آیا، معاً اپنی پُرانی بیوی رادھا اور چاند سے مکھڑے والے بچے کا خیال آیا تو تڑپ کر رہ گیا دل میں ایک بیٹے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ سوچنے لگا نہ معلوم وہ لڑکا کہاں کہاں مارا پھر رہا ہوگا، رادھا کتنی باوفا تھی؟ کہیں اس نے خودکشی نہ کرلی ہو۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اپنی جوانی کی ترنگوں پر بڑا افسوس ہوا۔ خیر پُرانے قصے کو دہرانے سے کیا حاصل ہو سکتا تھا اس نے طے کرلیا کہ جلد سے جلد اپنی بیٹی پربھا کی شادی کر دیگا۔ چنانچہ اس کی نظر میں چند ایسے منتخب لڑکے تھے۔

چندرماں کی روپہلی کرنیں چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ تارے آسمان پر آنکھیں جھپک رہے تھے، کمار اور چندر پربھا آپس میں باتیں کر رہے تھے، کمار نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:-

میں نے ایک لڑکے کو چائے کی دعوت پر کل بُلایا ہے، دیکھنے میں بڑا ہوشیار معلوم ہوتا ہے، بڑا ہنس مکھ ہے، تھوڑے ہی دن ہوئے اُس نے وکالت بھی شروع کردی ہے، اُمید کہ وہ اپنی جگہ پیدا کرے گا۔

پربھا نے مُنہ بناتے ہوئے جواب دیا، نہیں میری بیٹی کسی وکیل کے ساتھ نہیں رہ سکتی، کوئی گورنمنٹ آفیسر ہو تو زیادہ اچھا ہے،

کمار نے آنکھیں مِلاتے ہوئے کہا، تم نہیں جانتیں؟ گورنمنٹ سروس تک پہنچتے پہنچتے سبھی کی شادی ہو جاتی ہے، اس میں کوئی ہرج نہیں ہی، میرا تو یہی خیال ہے۔

دوسرے روز چار بجے مسٹر کمار ایک نوجوان کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہوئے۔ گول کمرے میں چائے تیار تھی، کمار نے چندر پربھا سے نوجوان (رمیش) کا تعارف کراتے ہوئے چائے پینے کو کہا۔ باتوں باتوں میں مسٹر کمار نے اس سے پوچھا:-

آپکے پتاجی یہاں کونسا کام کرتے ہیں؟

رمیش نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا:-

جناب میرے پتا تو جب میں چھوٹا تھا پرلوک کو سدھار گئے۔

اچھا تو پھر آپ کی تعلیم و تربیت کیسے ہوئی؟

میری ماتا ایک پڑھی لکھی استری ہیں، ان ہی کے طفیل سے میں آج اس عہدے تک پہنچا ہوں۔

ذوقِ [illegible]

از محمد جان صاحب انجمؔ وزیر آبادی

گردِ راہِ پاکِ یثرب قابلِ توقیر ہے
شیشۂ دل ٹوٹ کر آئینۂ تصویر ہے
اللہ اللہ کیا جمالِ یار کی تصویر ہے
اُنکے دیوانے کی اُن کے سامنے تصویر ہے
ذوقِ نظارہ خطا تخلیقِ غم تعزیر ہے
جبتک انجمؔ سایۂ گیسو تر گردشِ تقدیر ہے
رائیگاں ہیں کوششیں بے فائدہ تدبیر ہے

کربلا کی خاک دل کیواسطے اکسیر ہے
ریزہ ریزہ آفتابِ مطلعِ تنویر ہے
دیکھنے والا سراپا پیکرِ تصویر ہے
آفتابِ کامرانی انجمؔ تقدیر ہے
حُسن کی اک اک نظر چلتی ہوئی شمشیر ہے

کہیں نسبت بھی طے ہوئی ہے؟

رمیش نے (سر جھکاتے ہوئے) جواب دیا۔ جی ہاں ابھی تک تو طے نہیں ہوئی، لیکن کئی جگہ سے خطوط و پیامات آئے مگر کافی پیسہ نہ ہونے سے کچھ نہ ہو سکا۔

آپ خرچ کی تو بالکل پروا نہ کریں۔

لیکن میں اس بارے میں اپنی ماتا کی رائے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا میری ماتا ہی یہ سب باتیں طے کریں گی۔ اور وہی لڑکی بھی پسند کریں گی۔

چائے پی کر رمیش گھر چلا آیا۔ چندر پربھا رمیش کے جانے کے بعد اسکی بہت تعریف کرتی رہی۔ اور کمار سے کہا کہ تم کل ہی اسکے گھر جاؤ۔

دوسرے روز مسٹر کمار موٹر پر سوار ہو کر رمیش کے گھر آئے، رمیش نے پہلے ہی سے رادھا سے ذکر کر دیا تھا، وہ سفید ساری پہنے باہر آئی، اسکے چہرہ پر زمانہ کی بے اعتنائی کی وجہ سے قبل از وقت جھریاں پڑ گئی تھیں، لیکن مسٹر کمار کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ وہ دیکھتے ہی بول اُٹھے "رادھا"! اور اس کے چرنوں پر اپنا سر جھکا دیا اور کہا تم دیوی ....؟

نشاط باغ میں

از- آیت اللہ بیگ صاحب عارف

مرزا آیت اللہ بیگ صاحب عارف دہلی کے ایک جواں سال ادیب ہیں۔ انھوں نے ادب کو ورثہ میں پایا ہے۔ خیالات میں شوخی اور بانکپن ہے۔ اسلئے جو کچھ لکھتے ہیں وہ دلکش ہوتا ہے۔ ذیل کے مضمون میں بھی دلربائی کی تمام ادائیں موجود ہیں۔ مناظرِ قدرت کی تصویر کشی اتنی رنگین ہے کہ نشاط باغ کا گھر بیٹھے لُطف آجائے گا۔

ایڈیٹر

کشمیر کی رشکِ جناں وادی ــــ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ، جبیں پر برف کا درخشاں تاج، اور گود میں لہلہاتا ہوا جوان سبزہ، چنار کے سائے اور رنگین پھولوں کے نگاہ فریب تختے ــــ موتی سی آبدار جھیل جس کا دل عاشق کی طرح لرزاں ــــ ہوا میں مستی وکیف، اور فضا میں پرندوں کا ہوا ترنم ــــ ہر ہر ذرہ جنت نگاہ اور ہر ہر نغمہ فردوس گوش ــــ اس خانۂ فطرت میں نشاط باغ کا وجود ــــ گویا کسی بھرپور جوانی کا سنگھار!

نشاط باغ کی سیر، وہ بھی اتوار کے دن! ــــ دل کے لئے سینے کی پہنائیاں ہو جاتی ہیں ــــ پہاڑ کے دامن میں سبزے کے تختے، پھولوں کی باڑیں، ار درختوں کے سائبان ــــ بیچ میں پانی کی تیز رو نہر، گرتی ہوئی آبشاروں زمہ، چلتے ہوئے فواروں کا حسین نظارہ ــــ سرینگر کے باسی اور کشمیر کے زاد سیاح اس فردوس ارضی کے دیدار کے لئے ٹوٹے پڑتے ہیں۔ وہ بھی بھرا دل لے کر اپنی جھونپڑی سے نکلی۔ اس ہنگامۂ طرب میں اپنے آپ کو ردینے کے لئے نہیں بلکہ اپنے ہی جیسے گوشت پوست کے انسانوں کے آگے سوال دراز کرنے کے لئے ــــ ہاں، آج اتوار کا دن ہے۔ نشاط باغ یوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ ضرور اس کی جھولی بھر جائے گی۔ باغ کے دروازے ریوں کی بھیڑ ہے۔ اِدھر کوئی موٹر سے اُترا اور اُدھر یہ غولِ بیابانی شکار پر جھپٹا۔ "صاحب پونسہ! صاحب پونسہ" کی غمناک صدائیں کے ترنم کو توڑنے لگیں۔ جواب میں کیا ملا؟ جھڑکیاں، گالیاں، اور کبھی ایک پیسہ! ــــ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتی، وہ یہاں کھڑی نہ ہوگی۔

وہ باغ کے اندر چلی گئی۔ ایک گھنے درخت کے سائے میں روش کے کنارے بیٹھ گئی۔ سامنے سے مرد، عورت اور بچے۔ بوڑھے اور جوان، اپنی بہترین پوشاکوں میں ملبوس چلے جارہے ہیں ــــ وہ ایک لڑکی، اُٹھتی ہوئی جوانی، سجل نقشہ، سُرخ و سفید رنگ، چوڑے بور ڈر کی بنارسی ساڑھی باندھے ہوئے اپنے منگیتر کے ہمراہ چلی جارہی ہے ــــ ماضی کی سُہانی یاد نے غریب بھکارن کو اپنے میں جذب کرلیا۔ آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے حسین چہرے پر بہنے لگے جس میں باوجود تباہی اور ادبار کی چیرہ دستیوں کے روپہلے دیوتا کا عکس اب بھی تابناکیوں سے نظر آتا تھا۔ وہ بھی جوان تھی اور حسین! ــــ مگر غربت وافلاس کی ماری ہوئی!

یہ ایک برقعہ پوش خاتون سے سر پاؤں تک ڈھکی ہوئی چلی آتی ہیں۔ مگر یہاں تو تن پوشی کے لئے پورا لباس بھی میسّر نہیں۔ یہ پھٹی ہوئی ساڑھی اچھے وقتوں کی آخری یادگار ہے۔ اس نے اپنی ناکافی پوشش کی طرف دیکھا اور سکڑ کر بیٹھ گئی۔ کیا اس حسین سرزمین میں جہاں پتھر کے بنے ہوئے پہاڑ سبز مخمل زیب تن کرتے ہیں، اُسے تن ڈھاکنے کا بھی حق نہیں؟ دُنیا کتنی ستم ظریف ہے!

اُس نے اپنی جھولی پھیلادی اور ہر آنے جانے والے کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ گاہے گاہے اپنی روح کی پوری طاقتوں کو جمع کرکے بھیک کی صدا بھی لگا دیتی۔ بے حس انسانوں کے گروہ کے گروہ مسلسل سامنے سے گذر رہے ہیں مگر نشۂ نشاط میں اس درجہ مدہوش کہ مظلوم انسانیت کی آہ وبُکا کی آواز اُن کے کانوں تک نہیں پہونچتی۔ آوارہ گرد آتے ہیں اور آوازے کس کے چلے جاتے ہیں۔ شریف عورتیں بیحیائی کا طعنہ دیتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ مذہب کے ڈھنڈورچی بظاہر تقدس سے مُنہ پھیر کر مگر کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں ــــ غریب بھکارن! کیا آج اسے کوئی بھیک نہیں دیگا؟

نزدیک ہی کسی تفریحی پارٹی میں گانا ہورہا ہے۔ مگر اس کے دل کا ساز تو ٹوٹ چکا ہے۔ دائیں ہاتھ پر درختوں کے جھنڈ میں ایک خاندان کھانا کھا رہا ہے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد اس نے چاہا کہ بچا کھچا کھانا مانگ لائے۔ مگر یہ کیا؟ وہ تو کُتّے کو کھلایا جارہا ہے۔ وہ مایوس ہو کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھی۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوئی۔ مگر اس کی جھولی خالی تھی۔ نہ معلوم آج صبح وہ کس کا مُنہ دیکھ کر چلی تھی؟ باغ خالی ہو چکا تھا۔ رات کا دُھندلکا چھانے لگا۔ اندھیرے باغ کے درخت دیو معلوم ہورہے تھے اور سبزے کی بیلوں پر اژدہوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ لوگ باغ کی سیر کر کے خوشی خوشی واپس جارہے تھے۔ اسکے قدم بھی غیر ارادی طور پر اپنی کُٹیا کی طرف اُٹھنے لگے جہاں اندھی اور اپاہج ماں اور معصوم بچّے اس کا انتظار کر رہے ہونگے ——— مگر وہ انھیں کیا دیگی؟ آج تو اُسے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ وہ خود تین وقت کے فاقے سے ہے۔ کمزوری کے مارے آنکھوں کے نیچے اندھیرے کی لہریں چلی آرہی ہیں۔ سردی سے ہاتھ پیر کپکپا رہے ہیں۔ اس زندگی سے تو مَوت بہتر ہے!

آخر وہ کیوں گھر جارہی ہے؟ خالی ہاتھ جانے کا اُسے کوئی حق نہیں۔ اس نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ اپنی منحوس شکل انھیں دکھانے کا بھی اسے کوئی حق نہیں ——— چھوٹے چھوٹے بچوں کا بلکنا اور بوڑھی ماں کی اندھی اور بے نور آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو! ——— نہیں وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے قدم خود بخود جھیل کی طرف بڑھے۔ رات کے سنّاٹے میں ایک بار پانی میں دھماکہ ہوا اور زمین ایک بیکار ہستی کے بوجھ سے آزاد ہوگئی۔

سیپارۂ دل کی تلاوت

از نتائجِ قلم جناب مولانا محمد عبدالحمید صاحب حمید صدیقی لکھنوی

پھر مجھ پہ لطفِ سیّدِ ابرار کیجیے
کیونکر حمید جرأتِ اظہار کیجیے
کیونکر حمید جب آپ کی تکرار کیجیے

ذکرِ دیارِ پاک کی لذّتیں!
پھر دیکھیے نوازشِ پیہم کی لذّتیں
پھر دل پہ چھائی جاتی ہیں دُنیا کی ظلمتیں
ذوقِ طلب میں اور کچھ احساس کا ہجوم
پیشِ نظر ہوں گنبدِ خضرا کی نزہتیں
پھر آرزو ہے رہے سینہ میں رات دن
ہر آرزو ہے رحمت کی اک جھلک
دکھلائے اپنے جلوۂ رحمت کی لذّتیں
سب کچھ ہے ہی تصورِ طیبہ کی دلکشی
اللہ رے آستانِ رسالت کی دلکشی
میرے رفیقِ خاص کو بھی شاہِ دوجہاں
ہر وقت بارگاہِ رسالت میں باریاب
جی چاہتا ہے عرض یہ بار بار کیجیے

پھر مہرِ دل کو مطلعِ انوار کیجیے
ایک ایسی آرزو ہے جسے پیار کیجیے
کچھ اور تیز قلب کی رفتار کیجیے
دل کو تو ہے حاضرِ دربار کیجیے
پھر بیتِ غمکدہ کو گلزار کیجیے
آسماں ہر ایک پہ بارشِ انوار کیجیے
پھر زائروں پہ چپ و بازار کیجیے
پیہم طوافِ کوچۂ دلدار کیجیے
آنکھوں کو محوِ لذّتِ دیدار کیجیے
پیدا کہاں ہے منتظرِ انوار کیجیے
سجدہ ہر ایک ذرّہ پہ سو بار کیجیے
لطف و کرم سے اپنے گرانبار کیجیے

کو معلوم نہ ہو سکا کہ سافو ایک بیٹے کی ماں بنی ہے۔
شاہِ یونان زرگوت نے سافو کو اپنے لئے انتخاب کیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی
سافو نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن محبت کا دیوتا بھی شاید اپنی بہیم توہین کا انتقام
لینے پر آمادہ تھا۔ زرگوت اور سافو میں انتہائی محبت ہو گئی۔ دونوں یک جان اور دو
قالب کی مصداق ہو گئے۔ زرگوت کے بغیر سافو اور سافو کے بغیر زرگوت زندگی سے بیزار تھے

جونکور۔۔۔ جوں سی اور طوفان باد و باراں
۔۔۔ دھر ادھر پناہ ڈھونڈھنے لگی۔ وسیع و عریض جنگل
۔۔۔ پہری۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک آدمی باہر نکلا اور ایک
۔۔۔ ین کو خوبصورت قیمتی لباس میں ملبوس دروازہ پر کھڑا دیکھ کر بہت
۔۔۔ نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔ میں یہاں رات بسر کرنا چاہتی ہوں گھوڑا
۔۔۔ ندھ کر وہ اسے اندر اپنے مالک کے پاس لے گیا۔

امداد غیبی



خونی بادی بواسیر کے مریض
امداد غیبی پر بھروسہ رکھیں

"امداد غیبی" خونی بادی بواسیر کی تیر بہدف دوا ہے۔ مرض کتنا ہی پرانا ہو اور کیسا ہی ناقابل علاج ہو۔ ڈاکٹر، حکیم، وید سب جواب دے چکے ہوں مگر آپ "امداد غیبی" کی چند خوراکیں مریض کو دیجئے اور حیرت انگیز اثرات ملاحظہ فرمائیے۔ یعنی فوراً خون کا اخراج رُک جائے گا۔ اور مسّے مندمل ہو جائینگے۔ ناطاقتی دُور ہو گی اور مرض چند روز میں بالکل جاتا رہیگا۔ آخر کیوں نہ ہو یہ دوا اُس مستند اور شاہی طبیب کی ہے جس کی صداقت کا شہرہ تمام دِلّی میں مچا ہوا تھا یعنی حکیم نواب جان صاحب

ضدی:۔ عصمت چغتائی کا مختصر ناول۔ جس کا ہر کردار زندگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اونچے طبقے کی رنگ رلیاں، نچلے طبقے کی افلاس زندگی اور پھر دونوں طبقوں کی آویزش، حسن و عشق کے ذریعے، ضدی پورن کی داستانِ عشق پڑھ کر آپ سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کے رومان کو بھول جائینگے۔ ضخامت ۱۱۶ صفحے، مجلد اور دلکش گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ **ممتاز بک ڈپو، فراشخانہ۔ دہلی**

قرارِی



دمادم دمادم دمادم

اُدھر تاشے بج رہے ہیں اِدھر مریضِ دمہ کے دم پر بن رہی ہے۔ زندگی کا وہ دمدمہ جو دم کے بھروسے پر قائم تھا ٹوٹ رہا ہے۔ غریب کا سانس اُکھڑ رہا ہے اور تشنجی کیفیت طاری ہے۔ کھانستے کھانستے پسلیاں دوہری ہو گئیں ہیں یا پتلا پتلا سا جھاگ نکلتا ہے یا محض اُبکائیاں سی آ کر رہ جاتی ہیں۔

وہ حکیم صاحب کی شادی کے تاشے بج رہے تھے

کسی نے حکیم صاحب سے کہا مریض جاں بلب ہے، چلکر دیکھ لو۔ حقیقی مسرت کسی کا دُکھ رفع کرنے میں ہے، حکیم صاحب آئے اور ... "قراری" لکھدیا چند ... ات چین ... نہ

سب کچھ ہے رسالت
اقتدار سے آستانِ رسالت
میرے رفیقِ خاص کو بھی شاہ و دو جہاں
ہر وقت بارگاہِ رسالت ...
جی چاہتا ہے عرض بابِ ...

اوراق پارینہ

سافو

افسانہ

از جناب شیخ حمید اللہ صاحب امرتسری

سافو اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی۔ اس کا نور کے سانچے میں ڈھلا ا بدن دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتا تھا۔ اس کی شوخ نگاہیں وں کو سینوں سے باہر کھینچ لانے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ تمام یونان میں اس کے ن کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ جس طرح وہ حسن و جمال میں بے نظیر تھی۔ اسی طرح دماغی بلیتوں میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔۔ وہ بہترین ادیبہ تھی اور شیریں مقال شاعرہ ۔ اس کے نادر استعارے، اچھوتے تشبیہات اور بہترین محاکات بڑے بڑے ستاد شاعروں کے فہم و ادراک سے بالا تھے۔ دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کی گردنیں بھی اس کا نام سنکر فرط احترام سے خم ہو جاتی تھیں۔

یونان کی یہ آتش نوا شاعرہ انتہائی بے باک، بے حد شوخ اور عجیب قسم کے شعیہ مزاج کی مالک تھی۔ علم و فضل اور حُسن و خوبصورتی میں یکتا ہونے کے علاوہ معمولی گھرانے کی دختر بلند اختر تھی۔ اس کے دام محبت میں ہزاروں نوجوان اسیر لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ کئی نوجوانوں نے اس سے محبت کی، لیکن بت کا جواب محبت نہ پاکر خود کشی کر کے اجل سے ہمکنار ہو گئے۔ اسے نوجوانوں سے ق و محبت کے پیمان باندھ کر بے وفائی کرنے میں خاص مزا ملتا تھا۔ اور اسی باعث سینکڑوں پروانے اس کی شمع رُخ پر فدا ہو چکے تھے۔

قدرت شائد تاک میں تھی۔ سافو کو ایسی خوفناک سزا دی جو ہزاروں جوانوں کی خودکشی کا انتقام کہی جا سکتی ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ فرکسس نامی ایک یونانی بد معاش اس کی محبت میں رفتار ہو گیا۔ سافو کو اس سے انتہائی نفرت تھی۔ اس کی محبت کا جواب نفرت انگیز یوں سے دیا گیا۔ ایک دن سافو اپنے چند احباب کے ساتھ تفریح کی غرض سے ہنے نکلی۔ شکار کھیلنے کی دُھن سمائی۔ اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئی، ناگن سی ی رات شائد انتقام پر آمادہ تھی۔ کہ سافو رستہ بھول گئی اور طوفان باد و باراں ۔ ژالہ باری کی تاب نہ لاکر ادھر ادھر پناہ ڈھونڈھنے لگی۔ وسیع و عریض جنگل ایک گٹیا سی نظر پڑی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک آدمی باہر نکلا اور ایک سین و جمیل نازنین کو خوبصورت قیمتی لباس میں ملبوس دروازہ پر کھڑا دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ سافو نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔ میں یہاں رات بسر کرنا چاہتی ہوں گھوڑا اف باندھ کر وہ اسے اندر اپنے مالک کے پاس لے گیا۔

یہ مقام دراصل فرکسس کی پناہ گاہ تھی۔ جنگلی تفریحوں سے سیر ہونے کے بعد یہاں وہ آرام کیا کرتا تھا۔ جونہی سافو نے فرکسس کی شکل دیکھی ششدر سی رہ گئی۔ دل نے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ لیکن خدائی قہر نے ہمت پست کر دی۔ فرکسس نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ عمدہ عمدہ غذائیں اسے پیش کیں۔ اور قیمتی بستر اسے مہیا کر دیا گیا۔

فرکسس اپنے زمانے کا بدترین انسان تھا۔ کئی غریب گھرانے اس نے خاک میں ملا دیئے تھے۔ کئی معصوم دوشیزاؤں کی پاکیزگی وہ لوٹ چکا تھا اور آج تو یونان کی پری اس کی مہمان تھی۔ جسکو دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا اس نے دعوت نظارہ خود ہی قبول کر لی تھی۔

سافو اتنی شوخ اور بیباک ہونے کے باوجود ابھی تک دوشیزہ ہی تھی۔ اس کا جسم پاک اور مقدس تھا۔ فرکسس کی اوباش حرکتوں سے سافو کچھ گھبرا گئی۔ بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ چھپر پھاڑ کر نکل بھاگتی۔ فرکسس نے سافو کو اپنی آہنی آغوش میں جکڑ لیا۔ وہ عورت جو یونان کے بڑے بڑے باعزت اور پُرشوکت نوجوانوں کے دل چٹکیوں سے مسل چکی تھی۔ آج ایک اوباش مرد کی ہوس رانیوں کا شکار تھی۔

وحشی فرکسس نے تمام رات اس سے دل کھول کر محبت کی۔ جب صبح ہوئی تو سافو کے خوبصورت لمبے بال عُریاں شانوں پر پریشان ہو رہے تھے پشگفتہ گال زرد پڑ گئے تھے۔ اور اس کا جسم جگہ جگہ سے درد کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ آج رات وہ دوشیزہ سے عورت بن چکی تھی۔

کچھ عرصہ بعد سافو نے محسوس کیا۔ کہ گناہ کی وہ رات جو جنگل میں کبھی گذری تھی اسے ایک مستقل نشانی دے گئی ہے۔ اور عنقریب وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ دوشیزگی زائل ہونے کا صدمہ ہی کیا کم تھا۔ اس نئے انکشاف نے اور بھی پریشان کر دیا۔ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ اس نے بچے کو جنم دیا۔ اور پالا۔ چشم فلک تک کو معلوم نہ ہو سکا کہ سافو ایک بیٹے کی ماں بنی ہے۔

شاہ یونان زرکوت نے سافو کو اپنے لئے انتخاب کیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی سافو نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن محبت کا دیوتا بھی شائد اپنی پیہم توہین کا انتقام لینے پر آمادہ تھا۔ زرکوت اور سافو میں انتہائی محبت ہو گئی۔ دونوں یک جان او دو قالب کی مصداق ہو گئے۔ زرکوت کے بغیر سافو اور سافو کے بغیر زرکوت زندگی سے بیزار تھے

سافو جنگل کی صحبت ابھی تک نہ بھولی تھی۔ بلکہ فرکسس سے ایک خوفناک انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے حرامی بیٹے کو آلۂ کار بنایا تھا۔ اس کا بیٹا اس کی ہدایتوں کے مطابق کام کر رہا تھا۔ سافو نے اس جنگلی کٹیا کے قریب جو گناہوں کا مرکز تھی ایک عالیشان محل تیار کرایا جو تمام و کمال شیشے کا تھا۔ اور اپنے بیٹے کے ذریعہ اس مردود صفت فرکسس کی دعوت اس شیش محل میں کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ شاہ یونان کو ان سب باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔

اپنی آنکھوں سے فرکسس کا انجام دیکھنے کے لئے رات کے اندھیرے میں اکیلی تن تنہا شیش محل کی طرف روانہ ہوئی۔ جنگلی راستہ۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں گھر کر رہے تھے۔ سانس پھولی ہوئی تھی، اور اس کا ریشمی لباس خاردار جھاڑیوں میں الجھنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے تار تار ہو گیا تھا۔ وہ شیش محل میں داخل ہوئی۔ مہمان کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

شاہِ یونان شکار سے فارغ ہو کر اسی راستے لوٹ رہا تھا۔ اتفاقاً اسکی نظر سافو پر پڑ گئی۔ ایک خاص کمرے میں دو آدمی مصروف گفتگو تھے۔ اور سافو اسی کمرے سے نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ کہ یکایک بجلی سی ہوا میں چمکی اور ملکہ ایک چیخ مار کر تڑپتی ہوئی زمین پر آ رہی۔

شیش محل کا وہ کمرہ جس میں دو انسان محو تکلم تھے دیکھتے ہی دیکھتے ان خفیہ کلوں کے ذریعہ پانی سے بھر چکا تھا جن کا پہلے سے ہی انتظام کیا ہوا تھا۔ بدکار فرکسس اور سافو کے گناہ کی پیداوار سسک سسک کر مر گئے۔

زرگوت آگے بڑھا۔ ملکہ کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ تو وہ کانپ گیا۔ اس سے یہ فعل اضطرار اور دیوانگی میں سرزد ہو گیا تھا۔ اسکے دل میں سافو کے لئے محبت کا ایک سمندر اُمڈ آیا۔ بجلی سی ہوا میں ایک بار پھر چمکی، بادشاہ نے اپنے سینے میں خنجر پیوست کر لیا تھا۔

صبح یونان نے دیکھا کہ زرگوت اور سافو کی لاشیں ایک دوسرے سے لپٹی پڑی ہیں۔ اور شیش محل کی آہنی دیواروں کے اندر دو لاشیں پانی پر تیر رہی ہیں۔ کوئی نہ سمجھ سکا کہ یہ راز کیا ہے۔

پھولوں کیساتھ خار

از جناب ہلال ایڈیٹر صاحب

انسان اپنے دل پہ اگر حکمراں رہا
ہر عیش و غم کی بزم میں وہ کامراں رہا

پھولوں کا رنگ و بو نہ کبھی جاوداں رہا
اک حال میں کسی کا زمانہ کہاں رہا

پھولوں کیساتھ خار ہیں نشیمن کیساتھ برق
ہمراہ ہر بہار کے دورِ خزاں رہا

صیاد کیوں رہیگا مرا رازدارِ غم؟
خود باغباں ہی جب نہ مرا رازداں رہا

اس تک نگاہِ شوق ابد تک نہ جا سکی
اور وہ ازل سے زینتِ کون و مکاں رہا

دراصل شاہکار ہے انسانیت کا وہ
طوفانِ رنج و غم میں بھی جو شادماں رہا

مجھکو کبھی کسی سے شکایت نہیں ہی
دشمن بھی اے ہلال مرا مہرباں رہا!

ہندوستانی جفت سازی کی روداد

از اے۔ڈبلیو جعفری

حال ہی میں ہندوستانی جفت سازی پر مسٹر جوہن ایف بارٹس نے ایک نہایت دلچسپ مضمون شائع کیا ہے جس میں انھوں نے باٹا شو کمپنی کے پروپیگنڈے پر ہی اظہار خیال نہیں کیا بلکہ اس تجارت کے تمام پہلوؤں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ یعنی ہندوستان میں جوتے پہننے کی تاریخ سے لے کر موجودہ رجحان ضرورت اور آئندہ پیش آنے والے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

ہم ہندوستانی وہ نظارہ ابھی تک بھولے نہ ہوں گے جب کہ دیہاتی سڑک پر جو شہر کو جاتی ہو ایک ہندوستانی کسان اپنے دیسی جوتوں کو لاٹھی پر لٹکا کر کندھے پر رکھے ننگے پاؤں خراماں خراماں شہر کی طرف جاتا تھا اور جب وہ شہری تہذیب کے نزدیک پہنچ جاتا تو اپنے پاؤں کے گرد و غبار کو جھاڑ کر وہ جوتے جن پر اچھی طرح تیل ملا گیا ہو پہن لیتا تھا۔ اس کا سبب کیا تھا؟ وہ ہندوستانی کسان میلوں گرد و غبار میں چل کر اور کیچڑ، کنکر، ریت کی اذیت کیوں برداشت کرتا رہا۔ اس نے اپنے جوتوں کو جو بظاہر مضبوط اور خوبصورت نظر آتے تھے۔ جب تک کہ وہ بڑے گاؤں، شہر یا قصبہ کے نزدیک نہ پہنچ جائے۔ انہیں پہننے کی بجائے آسمان کی طرف لٹکائے ہوئے کیوں چلتا رہا؟ اس کا سبب تھا اعتدال۔ یہ سیدھا سادھا دیہاتی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گرد و غبار سے اٹے ہوئے جوتوں کو پہن کر شہر یا بستی میں داخل ہو۔ جہاں اُسے ایسے آدمیوں کا سامنا کرنا ہوتا جو دیہاتیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کا ایک دوسرا سبب بھی ہے کہ وہ اتنا سفر طے کرنے پر جس سے کہ جوتا یقیناً خراب ہو جاتا۔ دوسرا جوتا دام دے کر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہی جوتا جو سستے داموں دیہاتی موچی نے بنایا ہے۔ زندگی بھر کام دے۔ چنانچہ اس احتیاط سے ایک جوتا پُشتوں تک کافی ہوتا تھا۔ تیسرا سبب ہے تکالیف۔ یہ جوتا دیکھنے میں خوبصورت اور مضبوط ہوتا ہے مگر لمبے سفر میں تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دیہاتی اس کو دنوں تک تیل دیتے ہیں اور استعمال سے پہلے کئی دن تک تیل میں بھگو کر رکھتے ہیں۔

شہروں اور قصبوں میں ننگے پاؤں پھرنے کی یہ وجہ ہے کہ یہاں جو چمڑے کے جوتے بکتے ہیں وہ اتنے گراں ہوتے ہیں کہ بیشتر مرد اور عورتیں انھیں بوجہ افلاس خرید کر پہن نہیں سکتے۔ عورتوں کے بارے میں ایک سبب اور بھی ہے کہ ہندوستانی عورت مردوں کے سامنے جوتے پہنے ہوئے کم جاتی ہے۔ یہ طریقہ خراب تھا۔

علاوہ ازیں ہندوستانی تہذیب کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ جوتوں سے گھر کے فرش خراب ہو جاتے ہیں مگر وہ لوگ جوان وجوہات کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتے وہ مغربی تہذیب کے جوتے پسند کرتے ہیں لیکن وہ جوتے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اس لئے بہت سے ان کو خرید نہیں سکتے۔

جاپان نے تجارت کے اس گُر کو سمجھتے ہوئے ہندوستانی مارکیٹ میں ایسے فینسی اور سستے جوتے لا کر رکھ دیئے جو کہ جاپان میں سستی مزدوری سے تیار ہوتے تھے۔ لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ جاپان کے جوتے دیکھنے میں فینسی اور سستے ہوتے ہیں لیکن دیرپا نہیں ہوتے جیسا کہ دوسری جاپانی اشیا ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے چند سال کے بعد لوگوں نے اُنھیں ترک کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ بھی وجہ تھی کہ جاپانی جوتے ہندوستانی آب و ہوا کے موافق نہ تھے ان کے استعمال سے اگر گرمی ہو تو پاؤں جلتے تھے اور سردی ہو تو سُن ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد ہندوستان میں بہت سی ہندوستانی کمپنیوں نے باہر کے سرمایہ سے کام کرنا شروع کیا۔ چونکہ ان کو مزدوری گراں دینی پڑتی تھی اس لئے وہ بہت کم تعداد میں جوتے تیار کر سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جاپانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے یورپ کے اقتصادی حالات کے زیر اثر اور فرقہ دارانہ اختلاف کو دیکھتے ہوئے پھر باٹا میدان میں آیا۔ اُنھوں نے اپنی ایک بستی کلکتہ کے نزدیک بنا کر یہ کام شروع کیا جس کا نام اُنھوں نے باٹا نگر رکھا۔ پہلے پہل یورپین اداروں کی طرح انھوں نے کام شروع کیا زیچوسلوواکیہ سے جوتے منگا کر فروخت کرتے تھے۔ یہ سٹائل اور آرام کے لئے اپنی قسم کے بالکل نئے جوتے تھے۔ وہ ہر قسم کے جوتے تیار کرتے ہیں یعنی چمڑے کے اور کنوس کے۔ انھوں نے بچوں اور عورتوں کے لئے خاص طور پر فینسی اور ہلکے جوتے تیار کر لیے اور ایک ایسے سوال کو حل کر دیا جو اب سے پہلے جوتے تیار کرنے والے نہیں کر سکے۔ لیکن جلدی ہی اُنھوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ ہندوستان میں مشنل تحریک کے زور پکڑنے سے ہندوستانی اب یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے استعمال کی اشیا باہر سے درآمد کی جائیں بلکہ ہندوستانی مال ہو اور ہندوستانی آدمیوں کے ہاتھ سے تیار کیا ہوا ہو۔

مسٹر جوہن ایف بارٹس۔ باٹا شو کمپنی کے موجودہ مینجنگ ڈائرکٹر نے اس اصلیت کو محسوس کرتے ہوئے ہندوستانی مال لگانا شروع کیا اور ہندوستانیوں کو اس کام کے لئے ملازم رکھنا شروع کر دیا۔ یہ اس لئے اور بھی ضروری ہو گیا کہ جنگ کی وجہ سے آمد و رسل کے ذرائع بند ہو گئے تھے۔ لیکن راستہ میں جو مشکل درپیش آئی وہ یہ تھی کہ ٹرینڈ (ماہر) آدمی نہیں ملے۔ اگرچہ کاروباری آدمی ہونے کی وجہ سے

وہ جفت سازی کو سائنس سمجھتے ہیں۔ انھوں نے تمام ملک کا دورہ کیا اور ہندوستانیوں کی ضرورت اور حالات کا بغور مطالعہ کیا اور باٹا نگر کی بنیاد رکھی۔ باٹا نگر آج ہندوستان کی صنعت جفت سازی کا بہترین مرکز ہے آپ نے یہ سب تھامس باٹا سے سیکھا جو کہ باٹا شو کمپنی کے بانی تھے اور جن کے زیر سایہ آپ رہے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"تھامس باٹا جو دنیا کی سب سے بڑی جوتا بنانے کی فیکٹری کے بانی ہیں اپنے سنہ ۱۹۳۲ء کے کاروباری دورے میں ہندوستانی رکشا والے کے ننگے پاؤں دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کے پاؤں سڑک کے کنکروں اور گرد و غبار کی وجہ سے جگہ جگہ سے کٹ گئے تھے اور جن سے خون جاری تھا۔ ان نظاروں نے ان کے دل میں خیال پیدا کر دیا کہ ہندوستان کی جفت سازی سے خدمت کی جائے۔ اور ان تکلیف اٹھانے والے لوگوں کے لئے جوتے مہیا کئے جائیں۔"

مسٹر جون ایف بارٹس خود ہندوستان کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خیال کا یوں اظہار کیا:۔

"یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں یورپ کی طرح برف نہیں پڑتی ہے لیکن یہاں پر سورج کی دھوپ گرمیوں میں سڑک کو اتنا گرم بنا دیتی ہے کہ ننگے پاؤں اس پر چلنا اتنا مشکل ہے جتنا ننگے پاؤں برف پر چلنا مشکل نہیں ہے۔ یہ پاؤں کا سب سے بڑا دشمن ہے اور انسانی پاؤں کے لئے ایک بڑا خطرہ بھی۔ میڈیکل رپورٹ بھی یہ ثابت کر رہی ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔"

ہندوستان میں جوتوں کی سالانہ اوسط کھپت نہایت ہی کم ہے۔ اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں فی آدمی ۰۵ء۰ جوتوں کے جوڑے کی کھپت ہے۔ یعنی ایک جوڑے سے بھی کم۔ یہ کتنا خطرناک اوسط ہے۔

اب باٹا جاپانیوں سے ایک قدم اور آگے گیا ہے۔ انھوں نے جنرل پبلک کے استعمال کے لئے مشہور جوتے تیار کرنے شروع کئے ہیں۔ ہندوستانی لوگوں کے لئے ہندوستان میں جوتے تیار کئے جاتے ہیں۔ اور جنگ کے بعد اس ملک کے ہر ایک شخص کے لئے جوتے مہیا کئے جائیں گے۔

ہندوستان کل ۷۰،۰۰۰،۰۰۰ جوتے تیار کرتا ہے اور ضرورت ہے ۸۰۰،۰۰۰،۰۰۰ جوتوں کی۔ کتنا زبردست کام کرنا ہے اور باٹا کر رہا ہے۔

اس انقلاب سے پہلے سنہ ۱۹۳۰ء میں ارزاں سے ارزاں جوتا -/۸/۲ کا تھا۔ باٹا کے ذریعہ سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ جوتا صرف -/۱۵/- کی قیمت تک آ گیا۔ اور اب اگر جنگ نہ ہوتی اور ہمارے لڑنے والے سپاہیوں کے لئے جوتے نہ تیار کرنے ہوتے تو یہ -/۸/۰ فی جوتے پر آ جاتا۔ اچھا کنویس کا جوتا سنہ ۱۹۴۰ء میں -/۹/۰ آنہ کا تھا۔ اس سے زیادہ ہندوستان کیا چاہتا ہے۔ باٹا کی کل تیاری ۱۵ کروڑ جوتے ہیں جن میں چار کروڑ باہر بھیجے جاتے ہیں اور گیارہ کروڑ ہندوستان میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔

اب ہندوستان نہ صرف جاپان کا مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ تمام دنیا کو بھی اپنے تیار شدہ جوتے مہیا کر سکتا ہے۔ باٹا نگر میں ۵،۵۰۰ کام کرنے والے ہیں۔ ان میں ۱۰۰۰ آدمی تو وہ ہیں جو کہ پہلے غیر ٹرینڈ موچی تھے۔ سیلز ڈیپارٹمنٹ میں بھی ہیں کے ۲،۰۰۰ آدمی بطور منیجر سیلزمین، چپراسی اور مرمت کرنے والے۔ نئی اسکیم کو چلانے کے لئے ۴۰،۰۰۰ آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ جس سے ۸،۰۰۰،۰۰۰ جوتے سالانہ تیار ہو سکیں گے۔ یہ نہ صرف ایک ہی صنعت میں ٹریننگ حاصل کریں گے بلکہ دوسری صنعتوں کو بھی سیکھ سکیں گے۔

سر ظفر اللہ خاں نے ایک دفعہ باٹا نگر کو دیکھ کر ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ "میرے خیال میں مزدوری کی تحریک کے لئے کام سکھلانے کے معاملہ میں باٹا شو کمپنی لمیٹڈ بہترین ادارہ ہے۔"

باٹا نگر میں کام کرنے والا ایک شخص ایک مضمون کے دوران میں لکھتا ہے:۔

"یہاں ہم کو اچھے کام کے لئے اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ یہاں اس فیکٹری میں کوئی بھی بشر ایسا نہیں جو کہ -/۷/۵ روپے فی ہفتہ سے کم کماتا ہو۔ اتنی بڑی فیکٹری اور دفتر میں آپ کو کوئی چپراسی نظر نہیں آئے گا۔ ہر آدمی باٹا نگر میں ترقی کرنے کا ایک جیسا درجہ رکھتا ہے۔ یہ فیکٹری مجھے محنتی اور خوش اطوار بنانے کا سبق دیتی ہے۔ گنگا کے کنارے باٹا نگر کا عجیب و غریب نظارہ ہے۔ یہ زمانہ حال کا صنعتی شہر ہے۔ چند سال میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ باٹا نگر ایک چھوٹی سی جمہوریت ہے۔ اس میں زندگی کا ہر ایک لطف اور ضرورت ہے۔ یہاں ہم اپنا واٹر ورکس رکھتے ہیں اور بجلی اور ٹیلیفون بھی۔ ان کے علاوہ یہاں پر لائبریری، کلب، کھیلنے کا میدان، ریسٹورنٹ، سنیما، ٹیلرنگ، لانڈری غرضکہ تمام چیزیں اپنی ہیں۔ اس کی اپنی پارلیمنٹ ہے۔ میرا مطلب ہے ہر ہفتہ کے دن ہفتہ بھر کے کام پر نظر ڈالنے کے لئے کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔"

سالِ نو

(آہنگِ نو)

از حضرت اجیب مالیگانوی

ادہر تہذیب کو ناز، ارتقائے بزمِ امکاں کا
نہیں سینوں میں باقی، روشنی شمعِ محبت کی
ستم ایجادیٔ دورِ خزاں بھولے، چمن والے
خدا کی رحمتیں، بڑھتی نہیں کیوں؟ ناخدائی کو
بنا ہے دوشِ بربادی پہ، قصرِ کامرانی کی!
ہمیں محبوب اس رفعت سے ہے وہ عہدِ پستی ہی
زمانہ اپنی بربادی پہ یوں مسرور ہے، گویا
زبانِ علم و دانش پر ہے، اک افسانۂ خونیں
فضا میں تیرتی پھرتی ہیں یوں دلدوز فریادیں
سکوں مغرب کو حاصل ہے، نہ اطمینان مشرق کو
تباہی روز افزوں ہے، تمدن کے کرشموں سے
پرستارا ہرمن کے چھائے ہیں، چھائے جاتے ہیں
ادہر انسانیت کو درد، اپنے خون ارزاں کا
اندھیرا زندگی پر چھا رہا ہے ظلم و عصیاں کا
بہاروں نے سکوں چھینا ہی یوں خاکِ گلستاں کا
سفینہ دیر سے گرداب میں ہے اہلِ ایماں کا
یہی سرمایۂ عظمت ہے کیا؟ عقلِ فراواں کا!
جو حاصل بے سروسامانیاں ہیں ساز و ساماں کا
بجز تخریب، دُنیا میں نہیں کچھ کام انساں کا
سبب کیا پوچھیے، اہلِ نظر سے چاکِ داماں کا
کہ جیسے دورِ آخر آگیا ہے، بزمِ دوراں کا!
ہے عالم محفلِ ہستی پر اک خوابِ پریشاں کا
اثر کس پر نہیں ہے اس قیامت خیز طوفاں کا
جلال آئیگا کب تک جوش میں خلاقِ یزداں کا

مبارک ہو، جہاں والوں کو آمد سالِ نو تیری
وہ اگر ان ظلمتوں کو دُور کر سکتی ہے ضَو تیری

سالنامہ مشہور
جنوری ۱۹۴۳ء

دُنیائے پریشاں!

از جناب نصیر مرموی صاحب

کسی کی یاد پھر آئی سکوتِ شامِ ہجراں میں
سکوں گھر میں میسر ہے، نہ راحت کوئے جاناں میں
کہاں تک شاد رہوں میں اس ہجومِ یاس و حرماں میں؟
خدا معلوم کیا تھا راز اپنے ضبطِ پنہاں میں!
تجلّی بزمِ عالم کی نظر میں جذب کر لیتا
مجھے دیکھو ذرا آلام سے منہ موڑنے والو؟
مدادائے عشق! تکمیلِ جنوں میں رہ گئی خامی
مری ہستی مکمّل ایک تفسیرِ محبت ہے
مجھے بے چینیوں میں بھی سکونِ قلب حاصل ہے،
محض اس خوف سے جی بھر کے رویا بھی نہیں جاتا
کریں کیا عیش! کہ "دار المحن" ہے نام دُنیا کا
ستارے جھلملا کر رہ گئے پھر چشمِ گریاں میں
الٰہی آگ لگ جائے شبابِ فتنہ ساماں میں
کبھی دیکھو تو آکر میری "دُنیائے پریشاں" میں
کلی کیوں مسکرا کر گر گئی صحنِ گلستاں میں؟
یہ حسرت تھی کہ ہوتا کاش! یہ بھی میرے امکاں میں
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا آغوشِ طوفاں میں
ابھی کچھ تار باقی ہیں مرے چاکِ گریباں میں
بہت ٹکڑے ملینگے اسکے اوراقِ پریشاں میں
نہ جانے کون شامل ہے مرے حالِ پریشاں میں
کہیں تخفیف ہو جائے نہ میرے دردِ پنہاں میں
نصیرؔ آسودگی ملتی نہیں قیدی کو زنداں میں

خاص
مشہور غزل کیلئے

از جناب محمد عبداللہ صاحب بیدل ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج بیکانیر

ترا جلوہ ہے آنکھوں میں ہے تیری جستجو مجھ کو
تمنا ہے تری دل میں ہے تیری آرزو مجھکو

نہیں بھاتی چمن میں اب گلوں کی گفتگو مجھکو
نظر آیا نہ گلشن میں وفا کا رنگ و بو مجھکو

یہ رمزِ حُسن و الفت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی
جو ہے بیگانہ مجھ سے ہے اُسی کی آرزو مجھکو

نظارہ چشمِ میگوں کا ہے میرے واسطے کافی!
نہیں درکار اے ساقی ترا جام و سبو مجھکو

تجلّی مہرِ رخشاں کی ہویدا ذرّہ ذرّہ میں!
جدھر دیکھوں نظر آئے الٰہی تو ہی تو مجھکو

تری محرابِ ابرو میں ازل سے سر بسجدہ ہوں
نمازِ عشق کا ہے آج تک تازہ وضو مجھکو

صدائے طور کا مشتاق میں بھی مثلِ موسیٰ ہوں
دل و جاں سے نہ کیوں پیاری ہو تیری گفتگو مجھکو

ترے کوچہ میں مٹنا خاک ہونا سر بلندی ہے
فرشتوں پر ملی ہے خاک ہو کر آبرو مجھکو!

ہے چاہت کا مزہ اسمیں محبت اسکو کہتے ہیں
تمنّا ہو مری تمکو، تمھاری آرزو مجھکو

تری تیغِ نظر کے وار جب رہ رہ کے ہوتے ہیں
تو پھر چاکِ جگر کی ہے عبث فکرِ رفو مجھکو

سمجھ کر تجھکو ہم مشرب پتہ کی بات کہتا ہوں
فدا ہے جس پہ تو بیدل ہے اسکی آرزو مجھکو

تاثراتِ شاعر

از جناب نغمہ صاحب لکھنوی بی۔اے (آنرز)

یہ سوز و سازِ کلامِ شاعر، رہینِ حسنِ بیاں نہیں ہے
یہ ہے بیانِ رموزِ فطرت، بیانِ دردِ نہاں نہیں ہے

چمن کی ہر شاخ وجد میں ہے، کچھ ایسا جادو بھرا ہے نغمہ
جہاں کو رنگیں بنا رہا ہے اگرچہ رنگیں بیاں نہیں ہے

فلک کے طائر تو رقص کرتے ہیں میری رنگیں بیانیوں پر
جہاں کی بزمِ نمود میں گر، کوئی میرا ہمزباں نہیں ہے!

مری نگاہوں کے سامنے سب حقیقتیں مُسکرا رہی ہیں
مری بصیرت فروز نظروں سے کوئی ذرہ نہاں نہیں ہے

نہ ڈھونڈھ بلبل کے دل میں شاعر کے داغہائے جگر کی تابش
چمن کی اس شاخ سوختہ پر کہیں مرا آشیاں نہیں ہے

جلو میں ہر اشک کے کھڑی ہے لئے ہوئے شمع اک لیلےٰ
یہ میرا افسانۂ محبت ہے قیس کی داستاں نہیں ہے

یہ رزم گاہِ عمل ہے غافل، یہاں تلاشِ سکوں عبث ہے
طلسمِ لیل و نہار ہے یاں سکوتِ خوابِ گراں نہیں ہے

نگاہِ چشمِ فلک سے اکدن گذر ہی جائینگے تیرے نالے
فریبِ رنگ و شباب مت کھا، یہ غم غمِ جاوداں نہیں ہے

الٰہی کیوں شمعِ بزمِ عشرت، لہو کے آنسو بہا رہی ہے
جہاں کے پھولوں میں کونسا پھول آج گریہ کناں نہیں ہے

گلوں کے خونِ جگر سے دامن ہے آرزو کا بہارِ رنگیں
مگر نگاہِ ہوس کسی خار کی ابھی شادماں نہیں ہے

ستارہ صبح سے ہوئی دیکھ وہ جبینِ سحر پر افشاں
جنابِ نغمہ کے داغہائے جگر کا جلوہ کہاں نہیں ہے

اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالُ

نگارشاتِ جمیل!

مُلک کی مایۂ ناز خواتین کی ادبی کاوش کے پھولوں کا وہ نفیس عطر

جو

"مشہور" کے سالنامہ کو معطر کر رہا ہے!

ایڈیٹر



تصادم؟

از محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

ایک ایکٹ کا ریڈیائی ڈرامہ

محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی کے اکثر ڈرامے اور افسانے "مشہور" کے اوراق کی زینت رہے ہیں۔ اور بارہا اس سلسلہ میں موصوفہ کی بیباک نگارش کو سراہا گیا ہے۔ بلاشبہ موصوفہ جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتی ہیں تو کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔ چنانچہ "تصادم" کے عنوان سے جو ڈرامہ آپنے ارسال فرمایا ہے اس میں جہاں تعلیم نسواں کی خوبیاں دکھائی ہیں وہاں ضرورت سے زیادہ جہیز مہیا کرنے کی بھی ایک دلنشین انداز میں تضحیک کی گئی ہے۔ اُمید کہ قارئین اسکے مطالعہ سے محظوظ ہونگے۔

ایڈیٹر

تعارف

(۱) جاوید ——— ایک تعلیم یافتہ روشنخیال شخص۔
(۲) بیگم ——— جاوید کی (قدامت پسند) بیوی۔
(۳) نرگس ——— ان کی لڑکی جو تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

منظر

نرگس مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھی ہے۔ سامنے میز پر سلیقہ سے کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ وہ ایک رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرتی ہے۔ پھر حضرت جگر مراد آبادی کا ایک شعر قدرے ترنم سے پڑھتی ہے۔

(ورق اُلٹنے کی آواز)

نرگس ؎ گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں جگرؔ

خوب...... بہت خوب۔ کیا پاکیزہ اور لطیف خیال ہے۔ اور انداز بیان بھی کتنا انوکھا ہے۔ حقیقتاً یہ شعر پوری غزل کی جان اور تیر بے کمان ہے.........

(دروازہ کھلتا ہے۔ پیروں کی چاپ)

بیگم۔ شاباش...... بیٹی...... شاباش۔ صبح سے شام تک یہی گل کھلایا کرو۔ خوب کنبہ کا نام اُچھالو گی۔ جس کے پلّے بندھو گی وہ کمبخت بھی بڑے بڑے خواب دیکھ رہا ہوگا۔

نرگس۔ کیا بات ہوئی اُمّی۔ کچھ کہئے بھی تو؟

بیگم۔ اُفوہ...... ذراسی چھوکری اور یہ زبان۔ چار انگل اور بڑھیگی تو شاید آسمان میں چھید کرے گی۔ یہ دیکھ اپنا سگھڑ پن۔ سارے بینگن جلا کر کوئلے کر دئے۔ ہانڈی چولھے پر چڑھا کر ختم تک نہ لی بھلی گلشن پرستی ہوئی۔ صبح سے شام تک سنتے سنتے کان پک گئے۔ ایسا ہی شوق تھا تو کسی باغبان کے ہاں جنم لیا ہوتا۔

نرگس۔ اُمّی...... مجھ سے بھول ہوئی۔ آج کالج کا کام اتنا زیادہ تھا کہ اس میں اُلجھ کر کچھ دھیان نہ رہا۔ ورنہ آپکے شوق کی چیز اور خراب ہو جائے۔

بیگم۔ ہاں۔ میّا کا اتنا وقر تیرے ہی دم سے تو ہے۔ یہ چکنی چپڑی باتیں سکولوں اور کالجوں میں خوب سیکھی ہیں۔ دیدہ تو کسی کام پر جمتا ہی نہیں۔ یہی چاہتی ہے کہ سارے کام کاج پر لات مار ہر وقت کتاب ہی منہ سے اڑائے رہوں۔

نرگس۔ اُمّی...... روپیہ پیسہ "آنی جانی" چیز ہے۔ وہ جو کہتے ہیں دودھ کا جھاگ اور دریا کی ریت البتہ علم ایک لازوال خزانہ ہے۔ چور، ڈاکو، اُچکّے تو کیا۔ دُنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں چھین سکتی۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کی دنیا میں ہر جگہ قدر ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ علم ہمیں تہذیب سکھاتا ہے۔ اخلاق کی بلندیاں دکھاتا ہے۔ جہاں ہم ہر بھلائی اور بُرائی میں بخوبی امتیاز کر سکتے ہیں۔

بیگم۔ جب ہی تو میّا کی بڑی خدمت کرتی ہو۔ اللہ رے تعلیم! نہ ہنڈیا کی سُدھ اور نہ چولھے کی خبر۔ نا۔ بابا ہم نے شریفوں کے یہ ڈھنگ نہیں دیکھے۔

نرگس۔ اُمّی جان...... اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب صرف دو ایک مذہبی کتابوں یا کریما، مامقیما، پر علم کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ ایک بڑا سائنسداں کہتا ہے کہ "علم ایک بڑے سمندر کے مانند ہے۔ جسکے کنارے کھڑا ہوا میں ابھی گھونگے ہی چُن رہا ہوں۔" اُمّی۔! علم کا سمندر بہت وسیع ہے ہماری تصورات کی دُنیا سے بھی کہیں بڑھ کر وسیع۔

بیگم۔ بس بی بس۔ زبان تو دیکھو۔ کیسی کترنی سی چل رہی ہے اور کام کے نام سانپ سونگھ جاتا ہے۔ یہ رموزیں اپنے باوا سے چھانٹنا، جس نے تمھیں شہ دے رکھی ہے۔ میں اگر ایسی ہوتی تو روٹی ٹکڑا ابھی نصیب نہ ہوتا۔

نرگس۔ بے شک آپ کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن کیا کروں۔ اُمّی جان! وقت ایک موتی ہے جو ڈھال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور دن رات لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی طاقت نہیں جو اسے روک سکے۔ زندگی کے یہ لمحے بہت قیمتی ہیں۔ سچے موتی اور جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی......

بیگم۔ نہیں تو ساری عمر پڑھتے ہی جانا۔ سارے خاندان میں تھڑی تھڑی ہو رہی ہے۔ جو سُنتا ہے دانتوں تلے اُنگلی دباتا ہے۔ میں تو چار آدمیوں میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ تیرے باوا کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ چاہے کتنا ہی بھونکو مگر ان کے کان پر کب جوں رینگتی ہے۔

نرگس۔ اُمّی — یہ دُنیا ہے۔ یہاں کوئی ایک دوسرے کو ترقی کرتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ ہماری یہ تعلیم اور ترقی خاندان والوں کی نظروں میں کانٹا بنکر کھٹک رہی ہے۔ جب ہی تو روز نئی نئی باتیں نکالتے ہیں مگر کسی کے کہنے کی خاطر اپنی زندگی برباد کر دینا بھلا کونسی عقلمندی ہے۔

بیگم۔ بھلا — انھیں کیا جلنا پڑا۔ جو کسی بُرے کام کو دیکھے گا تو کہے ہی گا۔ بھلا لڑکیوں کو پڑھا لکھا کر نوکری تھوڑی کروانی ہے۔

نرگس۔ نہیں — تعلیم نوکری ہی کی خاطر حاصل نہیں کی جاتی۔ یہی خیالات تو ہیں جن کی وجہ سے آج ہمارا ملک اسقدر پستی، اور تاریکی میں ہے۔ اور باوجود انتہائی ذلت اور خواری کے وہ آج بھی قدیم لغویات کو شمع راہ بنائے ہوئے ہے۔ افسوس! ہماری قوم! بدنصیب قوم اپنی شاندار عظمت کو بُھلا بیٹھی۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے اب تشنۂ مضراب (اقبال)

بیگم۔ سچ ہے بیٹی! دُنیا میں یہی ایک سبق رہ گیا ہے کہ ہر وقت اخبار اور کتابیں منہ سے لگی رہیں۔ حاصل نہ وصول، دماغ کا ناس ہو جاتا ہے۔ جب ہی تو اس زمانہ میں عمریں کم ہونے لگیں۔ اور وقت الگ برباد ہوتا ہے۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس میں کونسی شان ہے اور کیا خوبی دکھائی دیتی ہے۔

نرگس۔ خیر! یہ تو آپ کو کوئی بھی نہیں سمجھا سکتا۔ رہا دماغ کے متعلق۔ ایک بڑے عالم "کارلائل" کا قول ہے کہ کتاب دماغ کے لئے اتنی ضروری ہے جتنی کہ جسم کے لئے غذا" اور اسی لئے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "فرض انسانی میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی الگ لائبریری بنالے۔ خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو۔ تاکہ دماغ کے لئے مناسب غذا فراہم ہوتی رہے۔ رہی خوبی۔ سوشکسپیر نے اس کے متعلق کہا ہے کہ دنیا میں کوئی تاریکی نہیں مگر جہالت۔

بیگم۔ ہاں! پڑھ لکھ کر یہی تو سیکھا ہے۔ تیری نظر میں تو سب ہی جاہل ہیں۔ آئی بڑی پڑھی لکھی۔ کہیں کچھ گن ہوتا تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتی۔

نرگس۔ اُمّی جان — ناخوش ہونے کی بات نہیں۔ فارسی کی مثل ہے "قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔ یعنی موتی کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری۔

بیگم (بگڑ کر) یہ مثالیں اپنے باوا کو بتانا مجھے ان کی ضرورت نہیں....

(جاوید داخل ہوتا ہے۔ پیروں کی چاپ)

جاوید۔ اوہو....... آج تو ہماری بیگم کا پارہ بہت ہی چڑھا ہوا معلوم ہو رہا ہے؟

بیگم۔ مجھے تو کمبخت مُوت بھی نہیں جو اس جنجال سے چھوٹ جاؤں۔

جاوید اجی! ہم ہی آپ سے ڈرتے ہیں۔ تو بھلا مُوت آپ کو چھیڑ کر کہاں رہے گی؟

بیگم ہاں تم ایسے ہی بھولے ہو۔ جب ہی تو گھر میں نئے نئے سوانگ بھرے جا رہے ہیں۔ جو کہیں شریفوں میں دیکھے اور نہ سُنے۔

جاوید (ہنستے ہوئے) ہا ہا ہا خوب بیگم! خوب!! دیکھ تو رہی ہو اور کس طرح دیکھو گی۔

بیگم یہ تو کہو ہی گے۔ بات تو جب ہے کہ دُنیا کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔ میرا کیا ہے۔ میں تو تمھارے نزدیک باندی ہوں۔ جیسے چاہو نچا لو۔

جاوید۔ بھلا...... ہم کونسا ایسا کام کر رہے ہیں جس کے لئے دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی ضرورت ہے۔ کوئی خدانخواستہ چوری نہیں کر رہے۔ ڈاکہ نہیں ڈال رہے۔

بیگم ہوں...... بڑے ننھے شیر خوار بچے ہو۔ جیسے بیچارے کچھ جانتے ہی نہیں۔ نرگس سیانی ہو گئی ہے۔ مگر لکھنا پڑھنا ختم نہیں ہوتا۔ اور اوپر سے طرّہ یہ کہ اخباروں، رسالوں میں مضمون بھیجتی ہیں۔ ریڈیو پر ڈرامے کراتی ہیں۔ تقریریں کرتی ہیں۔ خوب باوا دادا کا نام روشن ہو رہا ہے۔ جو سُنتا ہے دانتوں تلے انگلی دباتا ہے تمھیں تو شرم بھی نہیں رہی جو چُلّو بھر پانی ہی میں ڈوب مرو۔

جاوید۔ خوب۔ آخر اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہماری پاپوش سے۔ جو کوئی دانتوں میں انگلیاں دبائیگا اپنی انگلیاں کاٹے گا۔

بیگم۔ تمھیں کاہے کو شرم آنے لگی۔ جس کی ماں کی آج تک کسی نے آواز نہ سُنی ہو وہ بیٹی کھُلے بندوں کالجوں جائے۔ ریڈیو پر تقریریں کرے۔ میرے

سامنے تو جو کوئی اس کا نام بھی لیتا ہے تو میرے اوپر شرم سے گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔

جاوید۔ بیگم ـــــ مثل ہے "بندر کیا جانے ادرک کا مزا" دیکھو آج دنیا کی تمام شائستہ اور ترقی یافتہ قومیں علم کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ علم نہ ختم ہونے والی دولت ہے۔ نہ فنا ہونے والا حسن ۔ مگر افسوس ہمارا ملک اب بھی اس جانب کم توجہ کر رہا ہے اور خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں تو بجائے ترقی کے اُلٹی مخالفتیں اور رخنہ اندازیاں ہو رہی ہیں ۔

بیگم۔ بس شروع ہو گئی مجذوب کی سی بڑ ۔ میرے دماغ میں اتنا گودہ نہیں جو بیکار باتوں میں اپنا مغز کھپاؤں ۔ تمہیں تنخواہ بکنے کے سوا اور کوئی فکر نہیں ؟

جاوید۔ فکر ـــ کیسی فکر ؟

بیگم نرگس ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہے۔ سارا زمانہ کہہ رہا ہے کہ ہتھنی بٹھا رکھی ہے . . . . . ہتھنی . . . . شادی بیاہ کا کچھ فکر نہیں کہ چار حرف پڑھا کر فرض سے الگ ہو جائیں ۔ اور سچ بھی ہے۔ زمانہ بہت بُرا ہے سیانی بیٹی کا بٹھانا اچھا نہیں۔ مجھے تو ایک ایک پل بھاری ہو رہا ہے۔ میں تو چین سے ٹکڑا اسی وقت کھاؤں گی جب یہ بوجھ سر سے اُتر جائے گا۔

جاوید۔ کیسی جاہلوں والی باتیں کرتی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں رہتے رہتے تمہارا چونڈا اسفید ہو گیا۔ پھر بھی یہ دقیانوسی اور جاہلانہ باتیں دماغ سے نہیں نکلیں ۔

بیگم۔ نہیں تو . . . . . . ساری عمر بٹھائے رکھنا۔ سارا زمانہ تھوک رہا ہے۔

جاوید۔ بیگم ! یہ کوئی گڑیا گڈے کا بیاہ تو ہے نہیں کہ جٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ ہر شخص کو اس معاملہ میں بڑی دیکھ بھال اور سمجھ بوجھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے اسلئے کہ اسپر لڑکی کی زندگی کے بننے یا بگڑنے کا دارومدار ہوتا ہے۔ ذرا سی عجلت اور لاپرواہی میں عمر بھر کا کیا دھرا خاک میں مل جاتا ہے۔

بیگم۔ دُنیا زمانہ میں سدا اسی طرح ہوتا آیا ہے۔

جاوید۔ تم تو وہی "مُرغی کی ایک ٹانگ" گائے جاتی ہو۔ دیکھو ! یہ جلدبازی ہی کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں ۷۵ فیصدی شادیاں، خانہ آبادیوں کے بجائے خانہ بربادیاں ہوتی ہیں۔ اور معصوم لڑکیوں کو عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ ماں باپ کا کیا بگڑتا ہے وہ تو یہ کہکر کہ ہم نے اپنا فرض اُتار دیا الگ ہو جاتے ہیں۔ مگر جسپر پڑتی ہے اسی کا کلیجہ جانتا ہے۔ سچ پوچھو تو شادی کے بہانے لڑکیوں کو فالتو اور بیجان سمجھکر ایسے تیرہ و تار غاروں میں ڈھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ سسک سسک کر اپنی زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔ کوئی بھی ان کی آہ وزاری کا سُننے والا نہیں ہوتا ۔

بیگم۔ تمہاری بیٹی کے لئے تو آسمان سے بَر اُترے گا۔

جاوید۔ یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ ٹاٹ میں ٹاٹ اور مخمل میں مخمل ہی کا پیوند بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے عموماً یہی دیکھا ہے کہ لڑکی کے مذاق اور رضامندی کا خیال کئے بغیر بیاہ دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بسا اوقات شوہر اور بیوی کے ازدواجی تعلقات انتہائی ناخوشگوار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جو بُرے نتائج رونما ہوتے ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔

بیگم۔ تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کہیں بیاہ شادیوں میں لڑکیوں کی بھی مرضی دیکھی جاتی ہے ۔

جاوید۔ اگر نہیں دیکھی جاتی تو دیکھی جانی چاہئے ۔ اسلئے کہ زندگی لڑکی کو نباہنی ہوتی ہے۔ ماں باپ کو نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جس لڑکے کو اس کے والدین پسند کرتے ہوں کسی وجہ سے وہ لڑکی کو ناپسند ہو۔ مگر سماج اور سوسائٹی کے شدید قانون اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی آرزوں اور اُمیدوں کے ذبح ہونے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھے اور خاموش رہے۔ یہی ایک ہندوستانی لڑکی کی عصمت اور حیاداری کا ثبوت ہے۔ انجام کار وہی ہوتا ہے جو ہم اکثر اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پھر بھی کوئی سبق نہیں سیکھتے ۔

بیگم۔ بس . . . . . تم تو عمر بھر یہی بیکار باتیں کیا کرو۔ نہ جانے تمہارے دماغ کو کیا ہو گیا ہے ؟

جاوید۔ تو ـــ گویا تمہارے نزدیک ہمارے دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہے۔

بیگم۔ جو کچھ بھی ہو۔ اسے تم جانو۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ لڑکی کے لئے کچھ جہیز کا سامان بھی کرنا ہے۔ وقت پر میرے کئے کچھ نہ ہو گا۔ کبھی ہیں کہ سر بھرو سے بیٹھے رہو۔

جاوید۔ بیگم ! ہمارے ملک میں یہ جہیز کی رسم بھی انتہائی پلید ہے۔

بیگم۔ توبہ . . . . کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ غریب سے غریب بھی خالی بیٹی نہیں دیتا۔ سُن نہیں رہے۔ پڑوس میں بہو آئی ہے۔ موئے نکٹوں نے ایک چھلّہ تک نہیں دیا۔ ساری برادری تھو تھو کر رہی ہے۔

جاوید۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ شخص کسقدر غریب ہے، بیچارے کے اگر ایک وقت کھانے کو ہے تو دوسرے وقت کا سہارا

نہیں۔ اگر وہ تن کے کپڑے بیچ کر بیٹی کو لگا دیتا تو بھی مجھے امید ہے کہ تمھارے کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑتی۔

بیگم۔ ہو یا نہ ہو —— بیٹی کو تو دینا ہی پڑتا ہے۔ عورتیں اگر کہیں تو کیا بیجا ہے؟

جاوید۔ جبھی تو میں کہتا ہوں کہ عورتوں میں تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ اُن کے دماغ سے جہالت کے پردے اُٹھ جائیں۔ بیگم! اگر تم میں ذرا بھی تعلیم کی بو ہوتی تو ہرگز ایسی باتیں نہ کرتیں۔

بیگم۔ تم جیسے پڑھے لکھوں سے پھر بھی اچھی ہوں۔ کس کام کی وہ تعلیم جو اوندھے اوندھے قانون سکھائے۔

جاوید۔ نہیں —— یہ اوندھے قانون نہیں ہیں۔ بلکہ ہماری معاشرت کا یہ اہم پہلو ہے جس کو سوسائٹی بالکل ہی نظر انداز کئے ہوئے ہے دیکھنے میں تو یہ باتیں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن حقیقتاً یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہیں۔

بیگم۔ ہونگی —— مجھے تو جہیز کے رواج میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ یوں کہو کہ لوگوں نے پیسہ بچانے کے لئے یہ ڈھکوسلے نکالے ہیں۔

جاوید۔ کیا تمھارے نزدیک یہ بات قابل نفریں نہیں۔ کہ کوئی بھی اپنے سے کم حیثیت والے کے ساتھ رشتہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ وہ اپنا قریب سے قریب ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ جانتی ہو کیوں؟ اسلئے کہ غریب کے پاس اتنی دولت کہاں جو بیٹی کو بھاری بھر کم جہیز دیکر ان کی ہوس کی آگ بجھا سکے۔ شاید تم نے یہ دیکھا ہوگا کہ جب کسی غریب کے لڑکی پیدا ہوتی ہے تو وہ بجائے خوش ہونے کے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اسلئے نہیں کہ وہ لڑکی ہے بلکہ اسلئے کہ اسکے بیاہ شادی کے لئے بہت سا روپیہ کہاں سے آئے گا۔ اور بقول تمھارے اگر وہ اعلیٰ جہیز کا انتظام نہ کریں تو برادری میں مُنہ دکھانے کے لائق نہیں۔

بیگم یہ اچھا قانون نکالا۔ تمھارے نزدیک تو کوئی کچھ بھی نہ دے۔

جاوید میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہر شخص بجائے زیورات اور دیگر سامان جہیز کے اپنی بچیوں کو حسب حیثیت علم کے زیورات سے آراستہ کرکے جس سے ان کے حسن سیرت کو چار چاند لگیں۔ اور پھر وہی لڑکیاں جو آج ہمیں بار گراں معلوم ہوتی ہیں ہمارے مُلک اور قوم کے لئے مشعل راہ بنجائینگی۔

بیگم ان گول مول باتوں سے کیا فائدہ صاف ہی کیوں نہیں کہتے کہ میں اپنی بیٹی کو کچھ نہیں دوں گا۔

جاوید۔ واہ —— خوب کہی —— دوں گا کیوں نہیں۔ البتہ عوام ہے تکلف

جہیز سونے چاندی اور جواہرات سے کہیں زیادہ قیمتی، علم کی بے پناہ دولت کبھی نہ ختم ہونے والا جہیز، اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہندوستان کے ہر شخص کو اپنی بچیوں کو ایسا ہی جہیز دینے کی توفیق دے۔

بیگم۔ بھاڑ میں گیا تمھارا جہیز۔ بیگن تو جلکر خراب ہو ہی گئے تھے اور تمھاری رٹ میں ٹھنڈے ہوکر بالکل ہی ستیاناس ہو گئے، میں تو جاتی ہوں۔

جاوید ارے ۔۔۔۔ رے ۔۔۔۔ بیگم۔ تم نے ہنڈیا میز پر رکھ کر سارن کتابیں اور میز پوش کا بھی ناس کر دیا۔

(بیگم جاتی ہے۔ پیروں کی آواز)

جاوید۔ (خود سے) "لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا" (آواز دیتا ہے) نرگس —! بیٹی نرگس!!

نرگس جی ابا جان —— آئی۔ (قریب آتی ہے)

جاوید بیٹی آج تو تم بہت سُست معلوم ہو رہی ہو۔ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟

نرگس۔ کیا بتاؤں ابا جان۔ میری تو زندگی وبال ہوگئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟

جاوید۔ خیر تو ہے —— بیٹی۔

نرگس ابا جان۔ کوئی تعلیم پر اعتراض کرتا ہے۔ کوئی مضامین لکھنے پر۔ غرض روز نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

جاوید۔ (ہنستے ہوئے) ہا ہا۔ بھلا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے، بیٹی! اس دنیا کی یہی ریت ہے۔ کیا تم نے اصغر گونڈوی کا یہ شعر نہیں پڑھا۔

"چلا جاتا ہوں ہنستا، کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جاوے"

نرگس۔ یہ صحیح ہے۔ مگر باتوں کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے تو ایک پل بھی جم کر کام کرنا دوبھر کر رکھا ہے۔

جاوید۔ مثل ہے "کوئی راستہ ایسا نہیں کہ جس میں کانٹے نہ ہوں۔ وہ شخص انتہائی بدنصیب ہے جو راہ کی مشکلات اور تکالیف سے ڈر کر ہمت ہار بیٹھے، حوصلے پست کرے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا میں جتنی بھی بڑی ہستیاں گذری ہیں ان کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کے قدم کبھی راہ راست سے نہیں ڈگمگائے۔ ہمیں ان سے سبق سیکھنا چاہیئے۔

نرگس۔ دوسروں کی تو بھگتی جائے مگر محلے اور خاندان کی عورتوں نے امی جان کو کچھ ایسا چڑھا رکھا ہے۔ کہ وہ تو بس ڈھائی سیر آٹا باندھ کر میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ اور ساتھ میں نہ جانے آپکو بھی کیا کیا کہتی رہتی ہیں۔

(بقیہ صـــ)

بھولا بھالا

از جنابہ آنسہ ہاجرہ مسرور صاحبہ لکھنوی

صنفِ نازک میں بھولپن عمر کی پختگی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مرتے دم تک ساتھ رہتا ہے اس لئے جب کوئی خاتون "بھولا بھالا" عنوان لکھکر اشہبِ قلم کو تیز گامی کی دعوت دے تو ظاہر ہے اس سے بازی جیت لینا ذرا مشکل ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں روفی کی بھولی بھالی باتیں بہت ہی جاذبِ نظر ہیں اور جس خوبصورتی کے ساتھ محترمہ آنسہ ہاجرہ صاحبہ مسرور نے انھیں قلم بند کیا ہے لاریب وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ایڈیٹر

(※)

یہ کمبخت پروانے۔ شمع کے دیوانے! ٹوٹے ہی پڑتے ہیں لیمپ پر۔ میں نے کتابیں میز پر دے ماریں۔ پڑھنے ہی نہیں دیتے۔ بھلا یہ کیوں یہاں جمع ہوئے ہیں کیا جل مرنے کے لئے؟ لیکن یہاں تو جل بھی نہیں سکتے۔ سوائے اسکے کہ بلب سے سر ٹکرائیں۔ اگر ان بیوقوفوں کو ایسا ہی مرنے کا شوق ہے تو جاتے کیوں نہیں کسی غریب کی جھونپڑی میں؟ وہیں ان کمبختوں کو تیل کا ٹمٹماتا ایک چراغ ملے گا بس وہیں جاکر اپنی وفاداری کا رنگ جمائیں۔

میں نے برقی لیمپ گل کر دیا اور آزردہ ہو کر پلنگ پر پڑ رہی۔ پچھلے سال امتحان میں فیل ہو چکی تھی اسی لئے اس بار ابو جان نے اُٹھا کر بورڈنگ میں ڈال دیا۔ کہ گھر میں تو ہو چکی پڑھائی۔ اور اب بورڈنگ میں یہ پروانے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ گھپ گھپ اندھیرے میں جی اُلٹنے لگا۔ مجبوراً روشنی کی اور کتابیں سنبھالیں کہ بھئی اسدفعہ تو پاس ہو کر چھوڑوں گی۔ چند سطریں پڑھی ہونگی کہ دھیان بھٹکنے لگا۔

گھر میں اسوقت کیا ہو رہا ہوگا؟ میں نے ایک جماہی لیکر سوچنا شروع کر دیا۔ اور روفی کیا کر رہا ہوگا؟ وہ بیچارہ بھی پڑھ رہا ہوگا اسوقت۔ کتنا بھولا بھالا سا ہے۔ میری نظریں ایک دم میز پر رکھی ہوئی روفی کی تصویر پر جم گئیں۔ گھونگریالے بال، روشن آنکھیں اور مسکراتے لب۔ میں نے تصویر اٹھا کر چوم لی۔ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ابھی کل تو آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ شادان آپا! آپ کے بغیر گھر سونا سونا معلوم ہوتا ہے۔ کتنا پیارا لڑکا ہے۔ لیکن ہے تھوڑا سا بیوقوف۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کے پاس رہوں؟ ہے نا بیوقوف؟ لڑکیوں کے بورڈنگ میں رہے گا پاگل ——

اُف اُف —— میں نے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ بڑی زور سے کاٹ لیا اس پتنگے نے۔ شاید اس کو غصہ آگیا؟ اسی لئے نا کہ یہ اپنی عادت کے مطابق جل نہیں سکتا؟ لے اگر ایسا مرنے کا شوق پڑا ہے تو مر! میں نے جوتی سے اسکو مل دیا۔ دوبارہ دماغ کو درست کر کے پڑھنا شروع کیا۔ آخر پڑھنا ہی تو ہے۔ شکسپیر لکھتا ہے "خوشدل انسان وہ ہے جو سختیٔ دوراں سے تلخ کام نہ ہو اور دامنِ صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔" بات تو کچھ پتے کی کہی۔ لیکن نہیں یہ تو ناممکن ہے۔ اب کوئی ان پروانوں ہی کو دیکھے۔ یہ مجکو کاٹے جائیں اور میں پڑھے جاؤں؟ جی یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ میں نے دوبارہ کتابیں پٹخ دیں۔ اور بتی بجھا دی۔ اور ایک دم اپنے جسم کو بستر پر گرا دیا۔ میں نے سوچا۔ آخر مجھ سے پڑھا کیوں نہیں جاتا؟ اور پروانوں کا بہانہ تو جیسے میں نے اپنے کو بہلانے کی غرض سے بنا لیا ہے۔ دوسری لڑکیاں بھی تو ہیں ان کے پاس پروانے نہیں آتے۔ تو پھر وجہ کیا ہے کہ پڑھا ہی نہیں جاتا۔ اندھیرے میں سُرخ و زرد دھبے میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگے اور پھر ان دھبوں نے آہستہ آہستہ روفی کی شبیہ پیش کر دی۔ بالکل کیوپڈ دیوتا کی سی معصوم صورت۔ شادان آپا! آپ کا دل تو گھبراتا ہوگا یہاں؟ سچ مانئے آپکے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ آخر مجھے اپنے ساتھ رکھنے میں آپ کا کیا حرج ہے؟ میں اندھیرے میں کھکھلا کر ہنس پڑی۔ میرا حرج؟ اتنا بڑا ہو رہا ہے اور لڑکیوں کے ساتھ رہے گا۔ روفی کی شکل دھندلی پڑ گئی اور میں نے اپنا مُنہ چادر میں چھپا لیا" کتنا بھولا بھالا ہے روفی" اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور تھوڑی دیر بعد —— ؟ بس سُہانے خواب!

"آپ کے بھائی آئے ہیں" بورڈنگ کی ملازمہ نے مجھے اطلاع دی۔ میں جلدی سے کتاب بند کر کے ملاقات کے کمرے کی طرف دوڑی۔ "روفی آیا ہے مجھ سے ملنے میرا بھائی" میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ پردہ سرکا کر اندر پہنچی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ دیکھا تو ہاتھوں میں بہت سے تانے بانے

پھول پکڑے ہے۔

یہ پھول تم نے یہاں سے توڑلئے؟ میں نے ڈر کر پوچھا۔

"نہیں آپا! میں نے تو یہ پھول نہیں توڑے" وہ مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"یہ پھر تمہارے ہاتھ میں کیونکر پہنچ گئے؟ معلوم ہے یہاں پھول توڑنے کی ممانعت ہے۔" میں ڈر رہی تھی کہ آج یہ ضرور اپنی کسی نئی بیوقوفی سے مجھے شرمندہ کرے گا۔

"یہ پھول تو مجھے ایک سانولی سی خاتون نے دئے ہیں" وہ اپنی صفائی کرنے لگا۔

"خوب! گویا اب تم اس قابل ہوگئے ہو کہ کوئی سانولی خاتون تمکو پھول پیش کریں"؟ میں نے ہنس کر پوچھا۔ میں نے دیکھا اسکے چہرے پر ایک رنگ آگیا۔ ہکلا کر بولا۔

"جی ای ای۔ ہاں ۔۔ نہیں"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سنبھل کر بولا۔ ارے! آپ ہنستی کیوں ہیں؟"

اس لئے کہ اب تم .... میں جملہ ادھورا چھوڑ کر ہنس دی

"سنئے تو سہی آپ۔ بات یہ ہے کہ جب میں آیا تو چپراسی غائب تھا میں اسکے انتظار میں ٹہل رہا تھا کہ ایک خاتون آئیں ——

"اور آپ کی پھول سی صورت دیکھ کر یہ پھول پکڑا دئے۔" میں اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔

"یہ بات نہیں ہے"۔ جھینپ کر جواب دیا۔

تو پھر وہ خاتون پھول لئے جارہی ہونگی تم نے ان سے مانگ لئے ہونگے۔ میں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"یہ بھی نہیں"

یہ بھی نہیں۔ وہ بھی نہیں۔ پھر کیا تمھارا سر؟

اچھا جائیے نہیں بتاتا۔ وہ مُنہ پھلا کر پھول نوچنے لگا۔

ارے، ارے یہ کیا وحشت ہے؟ ادھر لاؤ یہ پھول اور ہاں بتاؤ کس طرح ملے تم کو یہ پھول۔ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"نہیں بتاؤں گا۔ کہدیا ایکبار"۔

ہاں کیسا میرا بھائی۔ بتاؤ تو جھٹ پٹ بچوں کی طرح۔ میں اسے بہلانے لگی وہ مُنہ بنا کر بولا۔ میں وہاں کھڑا تھا۔ ادھر سے وہ نکلیں۔ میں نے کہا اللہ کی راہ میں یہ پھول مجھ کو دیدو۔ میری بہن بھوکی ہے ان کو کھائے گی وہ جل کر کہنے لگا۔

چھی، چھی۔ یہ بڑی بُری بات ہے روفی!

"سنئے جناب"! وہ تیزی سے بولا اور سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سُنائیے اپنا رومان"

پھر وہی۔ ہرگز نہیں سُناؤں گا۔

اچھا اچھا۔ اب تم شروع سے سُناؤ۔ میں درمیان میں نہ بولونگی ہوں! کہو بھی جلدی سے۔ ہوں! تو تم چپراسی کے انتظار میں ٹہل رہے تھے کہ اتنے میں ایک سانولی سی خاتون آئیں اور —— ؟

میں اسی کی زبانی اس کی کوئی نئی بیوقوفی سُننے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔

وہ آئیں اور انھوں نے پوچھا کیا تمھاری بہن یہاں پڑھتی ہیں میں نے جلدی سے کہا "یس سر"——

"عجیب احمق ہو۔ یہ انگریزی بولنے کا کونسا موقع تھا اور وہ بھی غلط" مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔

"ہاں آپا! واقعی اسوقت مجھے "یس میڈم" کہنا چاہئے تھا"۔

اس کا سر ندامت سے جھک گیا۔

"تو پھر تم نے کہا کیوں نہیں؟"

بات یہ ہے کہ میں کچھ گھبرا گیا تھا۔

میرا پارہ چڑھ گیا۔ ان خاتون نے کیا کہا ہوگا؟ اس لڑکے کو۔ اونٹ کا اونٹ ہو رہا ہے اور بات کرنے کی تمیز نہ آئی۔ اور بھلا گھبرانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی ان کو۔ میں برس ہی تو پڑی۔ "احمق کہیں کے یہی پڑھا ہے تم نے؟ آٹھویں کلاس میں پڑھتے ہو اور ایک لفظ درست نہیں بول سکتے۔ لُٹیا ہی ڈبودی"۔ وہ رُوانسا ہو گیا اور پھول نوچ کر پھینک دیئے۔

اب میں نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

دیکھو بھیا روفی! اب تم ماشاءاللہ کافی بڑے ہو گئے ہو۔ آٹھویں کلاس میں پڑھتے ہو۔ کم از کم کسی خاتون سے بات کرنے کی صلاحیت پیدا کرو ورنہ آئندہ تم جانو اور تمھارا کام۔

وہ میری اس چٹ پٹی نصیحت سے بہت چڑ گیا اور مُنہ بسورتا ہوا جانے لگا۔ میں نے کہا۔ ارے ابھی کہاں چلے۔

بس جی بس۔ ایک تو آپکے پاس میں دوڑ کر آؤں اور آپ میری یوں ٹانگ لیں۔ پوری بات تو سُنی نہیں اور لگیں قابلیت جھاڑنے۔"

اور یہ جا وہ جا۔ میں کچھ افسردہ ہو کر رہ گئی۔

ایک بار حضرت پھر اپنی تمام تر حماقتوں کے جلوہ میں تشریف لائے۔

شیروانی کے بٹن کھلے، اُلجھے ہوئے بال۔ دانت نکالے کھڑے ہیں۔

سبحان اللہ! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔ کچھ نہیں! بس یوں ہی۔ اور لگے بے تحاشہ مسکرانے۔

آج بھی کیا کسی خاتون سے مڈبھیڑ ہوگئی؟

بس چہرہ اُتر گیا۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ لٹک گئے۔ بولے آپ کو تو کوئی بات مل جانا چاہیئے۔ وہ ناخن سے میز کھرچنے لگا۔

تم تو چور بنتے ہو روفی! میں نے کہا۔

اس یعنی کیا؟ کون چور؟ ہڑبڑا کر بولا۔

تم اور کون۔ ان خاتون کا ذکر ہوا کہ تمھاری ساری شوخی رفو چکر ہوگئی۔ دیکھو بھئی روفی! میں ہر رومان کا کامیاب پہلو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس زمانے کے تو پر لگ گئے۔ جب لیلےٰ مجنوں ہوا کرتے تھے۔" میں چھیڑے جا رہی تھی۔

خدا کی قسم آپا۔ اب میں کبھی نہ آؤں گا۔ آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے؟

بولئے۔ کیا میں بالکل بے وقوف ہوں۔ اس نے غصے سے دو تین مکے میز پر رسید کر دیئے۔ اور وہ سانولی خاتون ہونگی آپ کی کوئی اُستانی۔ ان سے جا کر پوچھئے مجھ سے کیوں بولیں وہ۔ کیا میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔"

وہ آنکھیں نکال کر مجھے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ کہ میری ایک کلاس فیلو عروج جو ان حضرت کی بھولی بھالی تصویر دیکھ چکی تھیں پردے کے قریب آ کر لگیں جھانکنے۔ مجھے اس طرف مخاطب دیکھ کر یا تو مجھے دھمکا رہا تھا یا ایک دم مع کرسی کے "اباؤٹ ٹرن" ہوگیا۔

"تمھارا بھائی ہے" وہ بولیں۔

جی ہاں۔ میں نے بمشکل آواز نکالی۔

ابھی تو بچہ ہے۔ وہ کھیسیں نکال کر بولیں۔

ہے تو ایسا ہی۔ مجھے ان کی موجودگی سخت ناگوار گزر رہی تھی اور ایسے وقت میں جبکہ روفی حد درجہ اُلّو بن کر رہا تھا۔

روفی ادھر مُنہ کرو۔ یہ کیا وحشت ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

پہلے تو وہ ہچکچایا پھر بڑے تکلف سے کرسی سیدھی کی۔

آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہے؟ انھوں نے جانتے بوجھتے ہوئے سوال کیا۔

جی ہاں۔ روفی سلام کرو ان کو۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

اس نے مُنہ پھیرے پھیرے ایک فوجی قسم کا سلام ان کی طرف پھینک مارا۔ میں دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ وہ عینک درست کر کے کہنے لگیں۔

بڑا بھولا بھالا ہے۔

جی ہاں! بڑا بیوقوف ہے۔ میں نے ہونٹ کاٹنا شروع کر دیئے اور وہ ہنستی ہوئی چلدیں۔

یہ کون تھیں؟ اس نے خاموشی توڑی۔

کیوں؟ کیا خیال ہے تمھارا۔ میں تو خار کھائے بیٹھی تھی۔

آپ بڑی وہ ہیں۔ وہ جھینپ کر بولا۔

اچھا بھئی اب جا کر پڑھونگی۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ایسی جلدی کیا ہے۔ کیا پورے سال کی پڑھائی آج ہی ختم کرنا ہے۔؟"

"نہیں صرف دو دن کی"

"کیوں"

اب بات پوچھو بات کی جڑ۔ پھر پھنگی تک پہونچو۔

آخر کچھ تو معلوم ہو۔

بس یہی کہ کل سب لڑکیاں "پکنک" جا رہی ہیں۔

وہاں کیا ہوگا؟

تمھارا سر۔ میں نے اُکتا کر کہا۔

وہ ہنستا ہوا چلدیا۔

کل کی تھکی ماندی آرام سے ٹانگیں پھیلائے پڑی تھی "پکنک" کی دلچسپیاں ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے آگئیں۔ لاری کا طویل سفر۔ آپس کے چٹکلے۔ کھیتوں میں ٹولیاں بنا کر گھسنا، پھر دیہاتیوں کی حیرت، نہ جانے وہ بیچارے ہم سب کو کیا سمجھتے تھے کیسی آنکھیں پھاڑے، مُنہ پھیلائے اور ڈھیلے ڈھیلے ہاتھوں سے موٹے موٹے لٹھ تھامے دیکھ رہے تھے۔ اور ہم لوگوں نے بھی کیسے کھیت اُجاڑے کہ بس توبہ! کیسا لطف آیا تھا۔ اور پھر ریل کی سیٹی۔ بس ایک دم خیال آیا ریل کے ساتھ دوڑیں گے۔ بھاگم بھاگ۔ لیکن وہاں تو نہ جانے کب ع

گاڑی نکل چکی تھی، پٹڑی چمک رہی تھی۔

آپ کے بھائی آئے ہیں۔ خادمہ نے کمرے میں جھانک کر کہا اور میں روفی کو "پکنگ" کی دلچسپیاں بتانے کے لئے پہلے ہی بے چین تھی۔

واہ وا! ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ سب سے پوچھا لیکن کوئی بھی نہ بتا سکا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولتا گیا۔

ارے! کس کو ڈھونڈھا تمنے جی! میں زبردستی بول اٹھی۔ لیکن وہ کب سُننے والا تھا۔ اپنی ہی کہے گیا۔

واللہ صبح سے جو سائیکل پر بیٹھا ہوں تو شام ہوگئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اتنا خدا کو بھی ڈھونڈتا تو مل جاتا مگر۔

مگر اس سانولی خاتون کا پتہ نہ چلا۔ میں بے حد بیزار ہو کر بولی۔
اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے جوش پر اوس پڑ گئی۔
تو تمھارا مطلب کیا ہے؟ ختم بھی کرو تمہید۔ کس کو ڈھونڈھا تم نے؟
اور کون کمبخت تم کو نہ ملا؟

آپ کہاں گئی تھیں؟

"پکنک"

لیکن میں نے تو "پکنک" نامی جگہ ڈھونڈھ ڈالی۔ اس نام کا تو کوئی گاؤں واؤں نہیں۔ اس ضلع میں........

پردے کے پیچھے سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں چبھنے لگی۔ سب کی سب کمرے میں بھرّا مار کر گھس آئیں۔

"بڑا بھولا بھالا ہے تمہارا بھائی" اور لگیں بے تحاشہ ہنسنے۔ روفی جو اپنا "ہیٹ" چھوڑ کر بھاگا ہے تو میں اور بھی کٹ کر رہ گئی۔

اسی دن شام کو "ڈرائنگ ہال" میں عروج نے جو میرے بھائی صاحب کی معلومات کا پول کھولنا شروع کیا ہے تو میں میز پر اپنے مرغوب شامی کبابوں کی بھری پلیٹ چھوڑ کر بھنّاتی ہوئی ڈرائنگ ہال سے نکل گئی لیکن دُور تک شریر لڑکیوں کے فلک شگاف قہقہوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔"

بقیہ تصادم

صـ ١٩٥

جاوید۔ بیٹی! یہ لوگ تو "لکیر کے فقیر" ہیں۔ ان کے نزدیک تو خود جو کچھ کریں وہ تو باون تولہ اور پاؤ رتی ٹھیک۔ اور جو دوسرا کرے وہ بالکل غلط دیکھو ہمارا ملک اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب ہم ان جاہلانہ باتوں کی قطعی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی بچیوں کو ظاہری بناؤ سنگار کے بجائے تعلیم کے زیورات سے آراستہ کریں۔ جو نہ صرف ان کی زندگیاں سنوارے گی بلکہ ملک اور قوم کے لئے بھی سمندر میں روشنی مینار ثابت ہونگی۔ اچھا بیٹی جاؤ اور خوب جی لگا کر اپنا کام کرو۔ اور دیکھو اپنی اُمّی جان کے کہنے کا کچھ خیال مت کرو۔ ان کی تو وہ مثل ہے کہ "کسی نے بارہ برس کُتّے کی دم نلکی میں رکھی تھی۔ مگر جب نکالی تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی نکلی"

شعلۂ سینا

بہ جناب نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ایڈیٹر ماہنامہ ادیب دہلی

بیخودی میں وہ خودی پیدا کریں
تم جب آؤ ہوش میں آیا کریں

کی شبِ غم ہم نے رو رو کر بسر
صبح کے آثار ہیں اب کیا کریں

صُورتِ پروانہ جل کر عشق میں
سوزِ قلبِ حُسن میں پیدا کریں

پھر محبّت آزماتی ہے ہمیں!
پھر کسی کے دل میں گھر پیدا کریں

گلشنِ عالم سے جی اُکتا گیا
دل میں ہے آباد اب صحرا کریں

پھونک کر اپنی متاعِ زندگی
اپنے دل کو شعلۂ سینا کریں

اصل میں دریا ہے قطرہ اشک کا
آ کہ اس قطرے کو پھر دریا کریں!

دُور ہی سے دیکھتے رہتے ہیں ہم
پاس جا کر کیا انھیں رُسوا کریں

آؤ نجمہ طرزِ فکر و شعر میں
اِک نیا انداز ہم پیدا کریں!!

فطرتِ حُسن!

از محترمہ مہ جبین صاحبہ سیالکوٹی

ناکامِ تمنا کی اشاعت کے بعد میرا خیال تھا کہ مسٹر رفیق غازی سیالکوٹی یقیناً اُس کے جواب میں کوئی تردیدی افسانہ لکھینگے یا اپنی غلطی کو تسلیم کرینگے۔ لیکن ان کی خاموشی سے میں نے آخر یہ اندازہ لگایا ہے کہ انھوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا ہے یہ افسانہ بھی میں ان کے افسانہ "شامِ تمنا" کی تردید کرتے ہوئے ان کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

مہ جبین سیالکوٹی

رقیہ کی منگنی ہوئے کچھ دن ہی گذرے تھے کہ نعیم کے والدین نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ رقیہ کے والدین نے سوچا کہ ایک نہ ایک دن بیٹی کو رخصت کرنا ہے۔ پھر لڑکے والوں کا تقاضہ بھی ہے۔ بہتر ہے کہ ابھی رخصت کر دیا جائے۔ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ چنانچہ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رقیہ کی سہیلیاں اسے ایک دم کے لئے چین سے نہ بیٹھنے دیتیں۔ کوئی کہتی تمہارا دولہا اسقدر سیاہ فام ہے کہ جسے دیکھ کر شبِ دیجور کی بے پناہ تاریکی بھی پانی پانی ہو جائے۔

کوئی کہتی اسقدر خوشرو نوجوان ہے کہ خوبانِ فرخار کی تمام رنگینی اور حورانِ بہشت کی تمام رعنائی اسے دیکھ کر شرمسار ہو جائے۔

کوئی کہتی چہرہ کیا ہے تبارک کی روٹی، رنگت کا یہ حال کہ صباحت وملاحت آبدیدہ ہو کر چیخ اٹھے۔

کوئی کہتی چلتے ہیں تو گویا قیامت قدموں میں بکھر جاتی ہے، نزاکت لوٹ پوٹ ہوئی جاتی ہے، گویا نزاکت کے پُتلے ہیں، بلکہ بعینہٖ چین ——

لیکن اس کی سہیلی پروین جو نہایت سنجیدہ مزاج تھی ہر بار انھیں جھٹلاتی اور رنگین الفاظ میں دولہا کا ایسا نقشہ پیش کرتی جسے سنتے ہی رقیہ عالمِ خیال میں ہمہ تن خیال بن جاتی اور گھنٹوں اسی خیال میں غرق رہتی۔ تاہم اسے یقین تھا کہ اس کے والدین اسقدر کوتاہ بین نہیں کہ اسکے لئے دولہا کے انتخاب کرتے وقت اس کی صورت وسیرت کو نظر انداز کر دینگے۔ اسے کامل وثوق تھا کہ اس کا دولہا اگر بیحد خوبصورت نہ ہوگا تو قبول صورت ضرور ہوگا۔

ماہ شوال کی دس تاریخ تھی، برات آچکی تھی، دلہن کو زرق برق پوشاک میں ملبوس کیا جا رہا تھا، دلہن کی سہیلیاں دولہا کو دیکھنے کے لئے چھت پر جمع ہو رہی تھیں، یکایک نسرین نے بلند آواز سے کہا۔

"اے لو دولہا آ گیا"

تمام لڑکیوں پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ دولہا کو دیکھ کر سب حیران رہ گئیں، کہاں رقیہ اور کہاں اس کا دولہا، انھیں یہ وہم بھی نہ تھا کہ دولہا اسقدر بدصورت ہوگا۔ وہ تمام محوِ حیرت ہو کر دولہن کے پاس لوٹ آئیں، کسی سے اتنی جرأت تک نہ ہو سکی کہ رقیہ کو دولہا کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ رقیہ ان کیطرف الوداعی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور متمنی تھی کہ اب جبکہ وہ دولہا دیکھ کر آئی ہیں اس کی تعریف وتوصیف اسکے سامنے کریں۔ لیکن کسی نے اس کی تعریف میں لب تک نہ ہلائے۔ براتی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے، تو جہیز کا سامان باہر نکالدیا گیا، اور ہزار ہا دُعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔

رقیہ ایک نہایت آراستہ کمرے میں صوفے پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ اسکے چہرہ پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن دل میں اُمیدوں اور آرزوؤں کا حشر برپا تھا اور ساتھ ہی اُمنگوں میں مسکراتی ہوئی ایک ہلکی سی جھلک غم کو مسرّت میں تبدیل کر رہی تھی۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ صوفے سے اٹھی اور قریب ہی میز پر پڑی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔ لیکن اسکی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ جا بجا اس کا نام اوراق کتب پر تحریر تھا، اس کا دل وارفتگیٔ محبت سے اچھل پڑا اور اپنی سہیلیوں کے وہ فقرات اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"دیکھنا کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا جس سے میاں کو دلی رنج پہنچے ہر فعل اور ہر بات سے میاں کو خوش کرنے کی سعی کرنا، اس کی خوشی کے لئے اپنی تمامتر مسرّتوں کو پسِ پشت ڈالدینا یہی باتیں ہونگی جن سے تم اس کے دل میں گھر کر سکوگی"

اس نے زیرِ لب کہا:۔

"محبت تو پہلے سے ان کے دل میں موجزن ہے۔"

اچانک اسکی نگاہ سامنے کی دیوار پر آویزاں تصویر پر پڑی، اس نے کتاب کو وہیں پر رکھا اور آگے بڑھ کر اپنی نگاہیں تصویر پر گاڑ دیں، کتنی اچھی ہے یہ تصویر اور کتنے اچھے خط و خال ہیں، آنکھیں محبت کے نشے میں سرشار ہیں۔ وہ اس کے اور قریب ہوگئی، اسی لمحے کسی کے پاؤں کی آہٹ ہوئی اس نے جلدی سے اپنی گردن کو جھکا لیا اور سمٹ سمٹا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ لیکن کافی دیر گذرنے کے بعد بھی کمرے میں کوئی داخل نہ ہوا۔ آخر وہ پھر اُٹھی اور اٹھتے ہی اس کی نگاہ اس کے مقابل ایک تصویر پر پڑی، اس نے تصویر کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کتنی بھونڈی شکل ہے نہ نقش ہیں نہ نگار ہیں جسم بھی بھدا سا معلوم ہو رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی اسکے دل میں ایک نامعلوم کسک پیدا ہوئی، یہ کس کی تصویر ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ ابھی وہ زیادہ دیر سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک نوجوان گندمی رنگ، آنکھیں موٹی موٹی اور گول، جن سے شرافت ٹپک رہی تھی، چہرے کے اعضا کچھ متناسب تو نہ تھے لیکن ان سے سنجیدگی ظاہر تھی، کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے نہایت محبت بھری آواز میں کہا

"آؤ میری رقیہ کھڑی کیوں ہو آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔"

رقیہ پر جیسے بجلی گر پڑی، چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ ہونٹوں پر کپکپی طاری ہوگئی اور بدن میں رعشہ پیدا ہوگیا اور وہ اسی عالم اضطراب میں آکر صوفے کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

رقیہ کی شادی ہوئے کئی روز گذر گئے۔ افضل جو نعیم کا رشتہ دار بھی تھا اور دوست بھی، اکثر آیا کرتا اور آکر رقیہ کے پاس کافی کافی دیر تک بیٹھا رہتا۔ اور سوسائٹی کے ان پہلوؤں پر بحث کرتا جو خود سوسائٹی کے لئے ہی تباہ کن ہے اور اکثر ہنسی مخول کی بھی باتیں ہوتیں۔ وہ جوان تھا اور ان نوجوانوں میں سے تھا جن کی فطرت میں حسن پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ وہ نوجوان جہاں کہیں کسی حسین شے کو دیکھتے ہیں اس سے رابطہ و تعلقات استوار کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

افضل جانتا تھا کہ رقیہ نعیم سے خوش نہیں رہتی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ انکی متاہلانہ زندگی میں قدرت نے ایک دیوار حائل کر دی ہے۔ اور وہ دولتِ حُسن جس کی رقیہ متلاشی ہے نعیم کے پاس نہیں اور اس کے پاس ہے۔ جس سے وہ رقیہ کے معصوم دل کو فریب محبت دیکر اپنے بس میں کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ یہ محض سوسائٹی کا قصور ہے کہ ایسے اَن مِل بے جوڑ رشتے کر دیتے ہیں تو پھر ان سے کیوں فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔

یہی خیال تھا جس کی بنا پر وہ رقیہ کے ساتھ اپنا بیشتر وقت گذارتا۔ نعیم کو معلوم نہ تھا کہ رقیہ جس قدر صورت میں اچھی ہے سیرت میں بھی اچھی ہوگی۔ لیکن اسکا یہ خیال غلط نکلا وہ اپنے سینے میں ایک ایسا دل رکھتا تھا جو اپنی بیوی کے لئے ہر خوشی و مسرت کو نثار کر دینے پر تیار تھا۔ لیکن اس کے پاس وہ ظاہری حُسن نہ تھا جس سے وہ رقیہ کو افضل کی طرح فریب دے سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی وہ رقیہ سے گفتگو کرتا ہے تو وہ اس سے کیوں جھینپ جاتی ہے وہ اس سے کیوں پرے پرے رہتی ہے۔ لیکن اسکے خلاف وہ افضل سے گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ افضل سے کہدے کہ اگر گھر میں وہ آئے تو براہ راست مجھ سے ملا کرے لیکن وہ اس کا دوست تھا اور رشتہ دار بھی وہ اس کے منہ چڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ افضل سے ایسا روکھا برتاؤ کرے۔ پھر اسے خیال آتا کہ کیوں نہ وہ رقیہ کو سمجھائے۔ لیکن جب بھی اس نے اس بات کا ارادہ کیا کہتے کہتے جھجک گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسکے متاعِ حیات پر اس کا دوست ڈاکہ ڈال رہا ہے، وہ جانتا تھا کہ رقیہ بے قصور ہے۔ لیکن رقیہ کو اس سے باز رکھنے کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی وہ اس کے پاس موجود نہ تھی اور اسے حاصل کرنا اسکے بس کی بات نہ تھی۔ وہ حیران تھا کہ آخر کیسے اس الجھن کو سلجھائے۔

رقیہ جس کے دل و دماغ پر افضل چھا چکا تھا وہ کبھی کبھی خیال کرتی۔ کہ میں ایک ایسے جرم کی مرتکب ہو رہی ہوں جو کسی صورت میں بھی قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس جرم کا محرک کون ہوا۔ جب اسکے متعلق سوچتی تو اپنے والدین کو قصوروار گردانتی کہ انھوں نے نعیم کو محض دولت مند اور اعلیٰ عہدہ پر ممتاز دیکھ کر مجھے اس کے سپرد کر دیا۔ میرے جذبات کی بالکل قدر نہ کی۔ یہ ان کا فرض تھا کہ مجھے میرے ہم پلہ کے ساتھ بیاہتے۔ انھوں نے اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے۔ لیکن اس کا ضمیر اسے یہی کہتا رہا کہ اگر تیرے والدین غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو بھی اپنے فرض کو بھول جائے۔ اور اپنے ان نسوانی جذبات کو خاک میں ملا دے اور پھر تو دیکھ کہ نعیم تیرا خاوند ہے۔ اور تیرے حُسن اور جسم کا مالک، تو اس کی ہے اور اس کی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو ایک ایسے گڑھے میں پھینک رہی ہے جو ذلت اور رسوائی سے پُر ہے۔ اپنے ماتھے پر ایک بدنما داغ لگانا چاہتی ہے جسے تو کبھی بھی نہ دھو سکے گی۔ تو ایک ایسا انسانیت سوز فعل کرنا چاہتی ہے جس سے نوعِ انسانی کی غیرت کو دھکا لگے۔ اس کے وقار میں فرق آئے اور پھر مرد فوراً یہ کہدے کہ عورت محض حُسن کا ایک پیکر ہے جس میں وفا و اطاعت نام کو نہیں، تو دیکھ کہ افضل کے پاس حُسن ہے لیکن اخلاق نہیں اسکے پاس دل ہے اور اس میں محبت موجزن ہے وہ محبت جو نوجوانوں کو اکثر ہو جایا کرتی ہے۔ جس کا نشہ عارضی ہوتا ہے۔ لیکن نعیم کی ظاہری شکل و صورت کو نہ دیکھ بلکہ باطن کو بغور دیکھ، اپنی ظاہری آنکھوں کو بند کرلے اور دل کی آنکھیں وا کر کے دیکھ تو نعیم کو افضل سے ہزار درجہ بہتر پائیگی۔

یک رات رقیہ اپنے بستر پر لیٹی اپنی زندگی کے ان واقعات پر غور کر رہی تھی جو آجکل اس کے پیش نظر تھے۔ وہ بار بار افضل کے آج کے رویہ پر غور کر رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی افضل کے جذبات اصلیت پر مبنی ہیں۔ کیا میں اسکی باتوں پر یقین کر لوں اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

" دل نہیں مانتا اس کی باتوں سے تصنع کی جھلک نمایاں ہے "

وہ اسی سوچ میں سو گئی۔

رقیہ قد آدم آئینہ کے سامنے اپنی پریشان زلفوں کو سلجھانے کے بعد ربن کی قید میں ڈال رہی تھی کہ معاً اس نے آئینہ کے عکس میں دیکھا کہ افضل کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آج اس نے کس قدر بیباکانہ حرکت کی ہے کہ بغیر آواز دئے میرے کمرے میں چلا آیا، افضل مسکراتا ہوا آگے بڑھا اسکے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

" رقیہ! "

رقیہ ٹھٹک گئی وہ سوچ رہی تھی کہ آج افضل نے میرا نام لیکر کیوں پکارا ہے۔ اتنے میں افضل نے اپنے آپ کو صوفے پر گراتے ہوئے کہا۔

" رقیہ تمھاری زلفیں کس قدر بھلی معلوم دے رہی ہیں "

رقیہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسکے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہی تھی، افضل نے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

" رقیہ تم غمگین کیوں ہو؟ ہاں میں جانتا ہوں تمھارا چہرہ تمہاری دلی کیفیات کی غمازی کر رہا ہے۔ لیکن تم بے بس تھیں، تم کہہ بھی کیسے سکتی تھیں کہ میں نعیم سے شادی کرنا نہیں چاہتی، اگر انکار کر دیتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

رقیہ جو سر جھکائے اسکی گفتگو کو بغور سُن رہی تھی آہستہ سے کہا

" افضل یہ قسمت کی بات ہے، جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے "

افضل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا

" رقیہ! دراصل بات یہ ہے کہ عورت فطری طور پر کمزور واقع ہوئی ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے ہر فعل کو قسمت پر چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن میں مرد ہوں اور میں ہر بات کو اپنی قسمت پر محمول نہیں سمجھتا، تمھیں بخوبی علم ہے کہ میرے والدین نے میری منگنی بچپن میں ہی شمیم سے کر دی تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ میری اور اسکی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میرے اور اسکے مزاج میں اسقدر اختلاف ہے کہ میں ہرگز اس سے اپنی زندگی خوشگوار نہیں بنا سکتا۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ اور والدہ سے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ میں شمیم سے ہرگز شادی نہ کروں گا۔"

رقیہ ایک دم چونک پڑی۔

" تو پھر کس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ "

وہ یہ کہکر اس کی طرف دیکھنے لگی، افضل نے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

" کس سے کرنا چاہتا ہوں۔ اسی کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں "

رقیہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ افضل اٹھا اور اسکے قریب آ کر صوفے پر بیٹھ گیا اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے کہا

" رقیہ "

اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان رُک گئی آخر اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

" میں چاہتا ہوں کہ اس سے شادی کروں جو مجھ سے شادی کرنا چاہے "

رقیہ نے کہا

" آخر وہ کون ہے جس سے تم اپنی زندگی وابستہ کرنا چاہتے ہو "

افضل نے بلا کسی جھجک کے ایکدم کہدیا

" میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اسلئے کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تمھیں مجھ سے "

رقیہ کی آنکھیں شعلہ بیز ہو گئیں اور اس نے گرجتے ہوئے کہا

" افضل تمھاری یہ ناپاک خواہش کسی طرح بھی پوری نہیں ہو سکتی، تم نہیں جانتے کہ وہ عورت جو کسی کی ہو چکی ہے اس سے ایسی خواہش وابستہ کرنا ایک گناہ ہی نہیں بلکہ کم ظرفی ہے "

افضل نے کہا

" یہ سچ ہے کہ میں نے ایسی خواہش اپنے دل میں پیدا کر کے ایک غلطی کی لیکن میں ایک عرصہ سے تمھیں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے آپ کو جہنم میں جلا رہی ہو اپنی جوانی و حُسن کو جو بار بار نہیں آیا کرتا برباد کر رہی ہو۔ اس ساز حسن کو جو ابھی تک تشنۂ مضراب ہے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہمیشہ ناکارہ پڑا رہے اور کوئی آشنائے مضراب نہ کر کے دلاویز نغمے پیدا کرے، کیا تمھاری یہی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ غم میں گھل گھل کر ایک مریض کی سی زندگی بسر کرو، بتاؤ رقیہ کیا تم یہی چاہتی ہو یا اس چندروزہ زندگی کے لطف سے حظ اُٹھانا۔ رقیہ دنیا کی مسرتوں اور خوشیوں میں محو ہو جاؤ "

افضل یہ کہکر خاموش ہو گیا اور رقیہ کے چہرے کا مطالعہ کرنے لگا۔ جس کا چہرہ کچھ مغموم سا ہو گیا تھا رقیہ نے آہستہ سے کہا

" افضل یہ سچ ہے کہ میری زندگی بے کیف و بے ربط ہو چکی ہے لیکن میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں میں تمھاری شکر گذار ہوں کہ تم میرے شریک غم بننا چاہتے ہو، مجھے افسوس ہے میں کسی کو شریک غم نہیں بنا سکتی، میں مجبور ہوں اور پابہ زنجیر کسی کی حراست میں ہوں جس سے مخلصی پانا میرے بس کی بات نہیں تم نوجوان ہو شمیم سے شادی کرنا نہیں چاہتے تو کسی اور کو اپنے لئے شریکِ حیات منتخب کر لو۔

مجھ ادبار زدہ سے ایسی امیدی وابستہ نہ کرو۔"

افضل رقیہ کے اور قریب ہوگیا۔ رقیہ اسکے زور زور سے چلتے ہوئے تنفس کو محسوس کر رہی تھی۔ افضل نے کہا

"نہیں میں صرف تم سے ہی شادی کروں گا۔" اس نے یہ کہا اور اسکے دستِ سیمیں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو اپنی آغوش میں لینا چاہا، رقیہ جو شائد اسکے دلی منشار کو سمجھ گئی تھی جلدی سے اپنے آپ کو اس سے علیحدہ کیا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ افضل نے اس کا تعاقب کیا اور اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں لینے کی کوشش کی، رقیہ نے چلاتے ہوئے کہا "چھوڑ دو مجھے ہٹ جاؤ پرے"، وہ بھاگ رہی تھی اور افضل اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑی۔

افضل نے موقعہ کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے واپس ہٹ جانا مناسب سمجھا کیونکہ سامنے ہی اس کا خاوند نعیم چارپائی پر محوِ خواب تھا۔

وہ بے اختیار اٹھی اور اپنے سوتے ہوئے خاوند کے قدموں پر سر رکھ دیا اور ان کے بوسے لئے آج اسے اپنے خاوند کا ہر عضو بھلا معلوم ہو رہا تھا، اتنے میں نعیم جاگ اُٹھا اور رقیہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا، رقیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نعیم نے پوچھا کیوں رقیہ شاید کوئی ڈراونا خواب دیکھا ہے روکیوں رہی ہو؟"

رقیہ نے رکتے ہوئے کہا "میرے سرتاج میں نے غلطی کی مجھے معاف کردو"

نعیم نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اسکے آنسو پونچھے اور کہا میں نے تمہیں معاف کردیا۔

رقیہ نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے خاوند کو دیکھا، دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ نمایاں ہوگئی اور نگاہیں چمکتے ہوئے چاند میں جذب ہوکر رہ گئیں۔

کوئی کیا جانے!

از مس خدیجہ صاحبہ مستور لکھنوی

مس خدیجہ مستور لکھنوی دورِ حاضر کی ایک مشہور ادیبہ ہیں۔ ان کے طبعزاد افسانوں میں ایک خاص کیف واثر ہوتا ہے چنانچہ "کوئی کیا جانے" خاموش محبت کا خاموش فسانہ ہے" اس کہانی میں محترمہ نے جو واقعات پیش کئے ہیں اکثر و بیشتر اشخاص کو ان سے سابقہ پڑا ہوگا اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوگا کہ یہ تو ہماری کہانی ہے ع جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے، ہم مشکور ہیں کہ مستور صاحبہ "مشہور" کو اپنے افسانوں سے ممتاز فرماتی ہیں حالانکہ "مشہور" اور "مستور" میں معنًا بُعد المشرقین ہے۔

ایڈیٹر

(※)

کھٹ کھٹ کھٹ ــــ تھپ تھپ تھپ ــــ

دردانہ نے سر سے لحاف پھینک رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو دوپٹے کے آنچل سے پاک کئے اور دبے قدموں دروازے کی طرف چلی "کون؟" "ندیم بھائی؟" دردانہ نے چپکے سے پوچھتے ہوئے زنجیر کھولدی۔ ندیم نے اندر داخل ہوکر سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

"سب سو رہے ہیں؟"

"جی ہاں سب سو رہے ہیں" دردانہ نے مسکرا کر کہا۔

ندیم اور دردانہ چپکے چپکے کمرے میں آگئے۔ ندیم نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی۔ اور ایک اطمینان کا سانس لیتے ہوئے لحاف اوڑھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"دردانہ بہترین فلم تھا دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی" ندیم نے لحاف سے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ چھپا کر کہا۔

"واقعی فلم تو ضرور اچھا ہوگا لیکن جب صبح دکھائے جانے والے فلم میں محترمہ چچی جان اپنی ایکٹنگ کے جوہر پیش کرینگی تو کیا ہوگا؟" دردانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اُنھ! میں ایسے کھیل نہیں دیکھا کرتا یہ چیز تو صرف تمھارے دیکھنے کی ہے میں تو فلم شروع ہوتے ہی کالج کا رُخ کروں گا" ندیم نے شرارت سے دردانہ کو دیکھ کر کہا۔

"خیر دیکھا جائے گا میں تو کہدونگی کہ میں نے دروازہ نہیں کھولا یہ حضرت دیوار پھاند کر گھر میں آئے تھے، خیر اب میں آپ کے لئے کھانا لے آؤں" یہ کہکر دردانہ جانے لگی۔

"واللہ کیا بات کہی ہے واقعی تم بہت سمجھدار لڑکی ہو یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ تم صورت دیکھ کر ہر بات کا اندازہ کرلیتی ہو" ندیم دردانہ کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی جلدی کہنے لگا۔

"ہوں! کھانا کھائینگے؟ پڑھایا تھا آج؟" دردانہ شرارت سے ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولی۔

"اچھا اب یقین مانو کبھی ناغہ نہ ہوگا، لیکن اب چپکے سے کھانا لے آؤ اور دیکھو یہ خیال رہے کہ کوئی جاگ نہ پڑے ورنہ ابھی لینے کے دینے پڑ جائینگے۔ اور ساری رات بھوکا سونا پڑے گا" ندیم نے بھوک سے بیتاب ہوکر گھبراتے ہوئے کہا۔

اچھا خیر اب تو میں جاتی ہوں آپ اطمینان سے سوئیے اگر زیادہ بھوک لگے تو چچی جان کو جگا لیجئے گا، کیوں ندیم بھائی یہ بات ٹھیک ہے نا؟ یہ کہتے ہوئے دردانہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

دردانہ چھ سال کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ موت کے بیرحم ہاتھوں نے اسکے والدین کو اس سے چھین لیا تھا اور اس معصوم کلی کو کھلنے ہی سے پہلے مسل دیا تھا، وہ ایک عرصہ تک مچل مچل کر روئی لیکن اسکے چچا ڈپٹی نذیر احمد نے اسکے سر پہ ہاتھ رکھ کر والدین کا غم نقشِ باطل کی طرح مٹا دیا، گو چچا اسے اپنی اولاد کے برابر سمجھتے تھے لیکن چچی اکثر سخت و سُست کہکر اس کے معصوم دل کو ٹھیس لگاتیں۔ چچا کا خیال تھا کہ دردانہ کی شادی اپنے اکلوتے بیٹے ندیم سے کرکے مرحوم بھائی کی روح کو خوش کرینگے۔ لیکن چچی کب یہ گوارا کرتیں کہ ایک یتیم بچی سے شادی کرکے اپنے ارمانوں کا خون کریں۔ وہ ایک حسین و مہ جبین بہو کی تلاش میں دُور دُور نگاہوں کے تیز گھوڑے دوڑا رہی تھیں۔ دردانہ انکی

نظروں میں بدصورت تھی ۔ چچی اکثر کہتیں " بھلا دردانہ بھی کچھ خوبصورت ہے ؟ نوج میں اپنے بچے کی شادی ایسی اچھل پھاند چھوکری سے کروں جو ہر وقت ٹھٹھول کرتی رہے " چچا نے لاکھ چاہا کہ اپنی ضدی بیوی کو راضی کرلیں لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی ندیم اور دردانہ بھی آپس میں انتہائی محبت کرتے تھے وہ دونوں بھائی بہن بھی تھے اور سچے رازدار دوست بھی ۔ ندیم خود پڑھتا اور دردانہ کو بھی پڑھاتا ۔ گو چچی نے اسے کئی بار جھڑک جھڑک کر منع بھی کیا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ دردانہ کو میٹرک کا امتحان دلائیگا تاکہ وقت پڑے پر وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے، لیکن سینما کا شوق ایسا تھے جھاڑ کر پیچھے پڑا کہ نو بجے اور ندیم غائب ۔ پھر اسوقت آتا جب چچی چیخ چلا کر موت کی سوتیلی بہن نیند سے ہم آغوش ہوتیں ۔ ایک دردانہ ہی تھی جو کروٹیں بدل کر اس کی آمد کا انتظار کرتی ۔ اس طرح اکثر اس کی پڑھائی نہ ہوتی کیونکہ ندیم رات ہی کو اسے پڑھاتا۔

رات کے تقریباً نو بجے ہونگے ندیم اپنے کمرے میں کچھ بے چین سا ٹہل رہا تھا ۔ چچی باورچیخانہ میں کسی خادمہ کو کام بگڑ جانے پر ڈانٹ رہی تھیں ۔ ندیم نے کمرے سے جھانک کر گھر کا نقشہ دیکھا جو اس کے سینما جانے کے لئے اسوقت بالکل ٹھیک تھا ۔ اس نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی شیروانی اُتاری اور جلدی جلدی پہننے لگا ۔ لیکن دردانہ کے آجانے سے اسکے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ۔

" اوہ یہ بات ہے ؟ کھیل دیکھنے کی تیاریاں ہورہی ہیں ؟ "

دردانہ نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا ۔

" ہاں دردانہ ! بڑا اچھا کھیل ہے ، چلو آج تمھیں بھی چپکے سے لے چلوں " ندیم نے جوتے کی ڈوریاں کستے ہوئے جواب دیا ۔

جی ! مجھے معاف ہی رکھئے ، ہاں آج چچی نے نوکروں سے کہدیا ہے کہ اگر بھیا کو جاتے ہوئے دیکھنا تو مجھے فوراً اطلاع کرنا ۔

" اچھا تو آج بڑی سخت نگرانی ہے ؟ بتاؤ دردانہ کیا کرنا چاہئے "

" کیجئے گا کیا ، مجھے پڑھائیے " دردانہ سنجیدگی سے ندیم کو دیکھتے ہوئے بولی ـــــ

" اچھا چلو تو یہاں سے آج نہیں پڑھاؤں گا صرف سینما نہ جانیکا سوگ مناؤں گا " ندیم نے مایوسی سے شیروانی اتار کر کہا اور تیز تیز قدموں سے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ دردانہ پہلے تو کچھ سوچتی رہی پھر آہستہ سے جا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھدئے ۔

" ندیم بھائی زیادہ کھیل نہ دیکھا کیجئے ورنہ خراب ہو جائیے گا "

دردانہ نے شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ۔

" جی تو یہی چاہتا ہے کہ خوب ماروں تاکہ ساری شرارت کرنا بھول جاؤ "

ندیم نے دانت پیستے ہوئے کہا ۔

" خیر مار لیجئے ایک خوشخبری سُنانے والی تھی اب نہ سُناؤں گی "

دردانہ نے اسے دھمکانے کے انداز سے کہا ۔

" اچھا پڑھا دوں گا پہلے خوشخبری سُنا دو " ندیم پیار سے اسکے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا ۔

" خیر پڑھانا تو ویسے بھی پڑے گا ورنہ چچا جان سے سخت شکایت ہوگی جناب "

" اچھا کر دینا لیکن اب خدا کے لئے بتا دو "

" ایسے کیسے بتاؤں مٹھائی کی بات ہے "

" اب تم ہی بتاؤ کہ کیسے مٹھائی لاؤں ؟ اگر نکل کر گیا تو سب یہی سمجھیں گے کہ کھیل دیکھنے جا رہا ہوں "

تو جناب معاف ہی رکھئے میں نہیں سُناتی "

دردانہ اپنا اونی شال کاندھوں پر ڈالتے ہوئے دروازے کیطرف بڑھی اور ندیم نے سر پر دو چپتیں رسید کر کے آرام کرسی پر ڈھکیلنے کے انداز سے بٹھا دیا ۔

" اب تو کبھی نہ بتاؤنگی مارا کیوں " ؟

ندیم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بیچارگی سے کہا " دیکھو بتا دو میں بھی کبھی تم سے کوئی بات چھپاتا ہوں "

" اچھا خیر سُن لیجئے ایک حسین سی ـــــ ارے مٹھائی ۔

ندیم سخت بے چین ہو گیا اسے انتہائی غصہ آیا لیکن شریر دردانہ کے آگے کب اس کی چلتی ۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر صداقت سے کہا

" کل دوں گا "

" کھائیے قسم "

" تمھاری جانِ عزیز کی قسم "

" نہیں بھئی یہ بات غلط ہے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیے "

" آنکھوں کی قسم "

دردانہ نے اپنے چمکتے ہوئے رخساروں سے گھنگریالے ننھے ننھے بال پیچھے ہٹا کر کہنا شروع کیا ۔

" حضرت اب آپ ایک عدد حسین و جمیل بیوی کے مالک بنائے جانے والے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سختی سے آپ کو کھیل دیکھنے سے روکا جا رہا ہے "

ندیم خوشی سے اوچھل پڑا اور دردانہ کے گلے میں ہاتھ ڈالکر کہنے لگا

" سچ اب کبھی نہ جاؤں گا لیکن یہ تو بتاؤ وہ ہے کون ؟ "

" ارے وہی ہمارے پڑوسی ڈاکٹر صاحب کی لڑکی شہناز کے

ساتھ ہوگی "

" ہاں ہاں میں نے تو اسے دیکھا بھی ہے۔ سچ دردانہ بڑی اچھی ہے وہ، لیکن ہوگی کب ؟ "

" ہوں! پڑ گئی ناجلدی؟ ارے بھئی عید کی بارہ تاریخ کو ہوگی۔"

" چاند کب نکلے گا " ؟

" چار روز اور رہ گئے ہیں "

" اچھا اب تم کو پڑھا دوں "

" میں نہیں پڑھتی "

وہ ندیم پر کتابیں پھینک کر کمرے سے بھاگ گئی۔ اور ندیم ساری رات شہناز کے حسین تصور سے سو نہ سکا۔

یوں تو ندیم کبھی چاند نہ دیکھتا۔ یہ شاید جدید تعلیم کی برکت تھی۔ لیکن اس بار اس نے سب کی نظریں بچا کر اچھی طرح ننھے سے اکڑے ہوئے چاند کو دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگیں۔ جب سے چاند نکلا تھا گھر کا ہر فرد شاداں تھا۔ خصوصاً دردانہ وہ کبھی بری کا سامان خود دیکھتی اور کبھی مہمانوں کو دکھاتی پڑھنا لکھنا سب ترک۔ اگر کبھی ندیم اسے پڑھنے کے لئے مجبور کرتا تو وہ ہنس کر کہتی " ارے نوشاہ میاں اب بھلا آپ سے کیا پڑھوں ؟ آپ کے دھیان میں تو بس بیوی بسی ہوئی ہے مجھے بھی بیوی کا سبق پڑھائیے گا تو میں کہیں کی نہ رہونگی "

اس دوران میں ندیم نے بھی کھیل دیکھنے کا نام تک نہ لیا۔ درونِ خانہ قبل از وقت آئی ہوئی خواتین کا ایک جمگھٹ سا لگا تھا۔ حسین نوجوان لڑکیاں جوانی کے نشے میں چور، ساریوں اور دوپٹوں کے آنچل کو ایک دلربا انداز سے لہراتی گھر کے کونے کونے میں چہکتی نظر آتیں۔ تو بیرونِ خانہ نوجوان خوبصورت لڑکے طرح طرح کی شیروانیوں میں ملبوس الگ الگ ٹولیاں بنائے رنگ رلیاں کرتے دکھائی دیتے۔ کوئی وائلن کے تاروں کو چھیڑ کر موسیقی کے دریا بہاتا تو کوئی کیرم سے مصروف پیکار نظر آتا۔ بڑے بوڑھے گاؤ تکیئے کا سہارا لئے بارات جانے کے اہم مسائل پر گفت گو کرتے۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے تالیاں بجا بجا کر اندر باہر بھاگتے نظر آتے۔ غرض ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔

کل چار بجے بارات جانے والی تھی۔ دن کے تھکے ماندے غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ ہاں چچی جان ضرور جاگ رہی تھیں۔ بھلا وہ کیسے سوتیں؟ بیٹے کی بارات جانے والی تھی۔ گھر پر ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ مہمان خواب شیریں کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کسی کسی وقت چچی کے پاندان کھولنے بند کرنے کی آواز خاموش فضا میں ہلکا سا شور پیدا کر دیتی۔ ندیم بھی اپنے کمرے میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کی طرح کٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بار بار متبسم ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا " اگر سالیوں نے جوتا چرایا تو میں ان کے بیگ میں ہٹری ہوئی جوتیاں دوں گا۔ کھانا اسوقت تک نہ کھاؤں گا جب تک ایک موٹر نہ لے لونگا۔ اور سالیوں کو تو ایسا سمجھوں گا کہ تمام عمر یاد ہی کریں پھر دُلہن .... "

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا دو بجے تھے۔ اُف کمبخت رات کٹتی ہی نہیں۔ کیوں نہ دردانہ کو جگالوں اور اسی سے باتیں کرکے رات کاٹ دوں۔ لیکن کسی نے دیکھ لیا تو یہی کہے گا کہ شادی کی خوشی میں سویا نہیں۔ ندیم یہی سوچتا ہوا اُٹھا اور دروازے سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ آسمان پر دو ایک بادل کے ٹکڑے چاند کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ ندیم خود بخود مسکرا دیا۔ اس نے اوور کوٹ پہن کر دبے قدموں دردانہ کے کمرے کی طرف چلا۔ دروازہ کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا وہ سوچنے لگا، دُردانہ بھی میری شادی کی خوشی میں سوئی نہیں۔ وہ آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک دلگداز منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ دُردانہ کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کا سر میز سے ٹکا ہوا تھا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ہچکیوں کے مدوجزر سے شانوں پر پڑی ہوئی شال ڈھلک کر کرسی پر گر گئی تھی۔ ندیم کا دل اپنی پیاری رفیقہ کو روتے دیکھ کر ڈوبنے لگا وہ چپکے چپکے کرسی کی طرف بڑھا اور ایک ہاتھ اسکے سر پر رکھ کر بولا؛

" اری پگلی رو رہی ہے آخر کیوں یہ نحوست پھیلا رکھی ہے تجھے نہیں معلوم کل میں دولہا بنوں گا "

دُردانہ بدستور میز پر سر رکھے روتی رہی۔ ندیم گھبرا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے دردانہ کو اس طرح بلک بلک کر بچوں کی طرح روتے دیکھا تھا۔ ندیم نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا جو برف کی مانند سرد ہو رہا تھا ندیم نے گرمی ہوئی شال سے اس کا جسم چھپا دیا اور دوسری کرسی سرکا کر اس کے قریب بیٹھ گیا " خدا کے لئے بتاؤ دردانہ آخر یہ کیا وحشت ہے ؟ " اس نے دُردانہ کا چہرہ اوپر اُٹھا کر کہا۔

دُردانہ کی صاف تارہ جیسی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور وہ نہ معلوم کب سے رو رہی تھی جس کی وجہ سے اسکے ملائم پپوٹے سوج گئے تھے وہ انتہائی مغموم نظر آتی تھی۔ اس کی نظریں میز پر جھکی ہوئی تھیں۔

" دردانہ میں تم کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا بتاؤ جلدی تم کیوں رو رہی ہو ؟ "

دردانہ نے اپنی بھاری آنکھیں اوپر اُٹھا کر ندیم کو دیکھا آنسوؤں کے

دو موٹے موٹے قطرے اس کی آنکھوں سے بہ کر ندیم کے ہاتھ پر پھیل گئے۔ ندیم نے غور سے دردانہ کو دیکھا اس کی آنکھوں سے خوددار محبت چھلک رہی تھی جسے وہ عرصہ سے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھی۔ ندیم نے محسوس کیا کہ اسکے سینے میں ہلکی سی کسک ہو رہی ہے۔ وہ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ ندیم تیز تیز قدموں سے کمرے میں ٹہل رہا تھا دو دکھ بھری آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اسکے پیش نظر تھیں اور جیسے وہ آنسوؤں میں نہائی ہوئی آنکھیں اس سے کہہ رہی ہوں پگلے! تو نے سمجھا ہی نہیں دردانہ ایک عرصے سے تجھے چاہتی تھی، لیکن تو اس کی خاموش محبت کو نہ سمجھ سکا۔ تو سمجھتا ہے کہ محبت جیسی نازک حقیقت کا اظہار زبان سے کرنا چاہئے؟ نہیں یہ تیری بھول ہے محبت الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی، ہاں یہ چیز انسان کے حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتی ہے اور سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں محبت کا زبان سے اظہار کرنا محبت کی انتہائی ہتک ہے۔ کیا تو بھول گیا کہ جب سینما سے واپس آتا تو سب سوتے ہوتے اور وہ جاگ کر تیری منتظر رہتی۔ تیرے کارن چچی کی سخت و سست باتیں سنتی۔ تو اپنی خوشیوں میں مگن تھا تو نے اس کا دل دکھایا ہے ممکن ہے کہ تو بھی خوش نہ رہ سکے۔

ندیم تھک کر کرسی پر گر پڑا اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ گھڑی نے پانچ بجائے۔ گھر کے لوگ جاگ اٹھے تھے اور کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔

ندیم نے سنا کہ دردانہ کسی سے کہہ رہی ہے" ان کمبخت باجے والوں سے کہو کہ شہنائی بجائیں۔" ندیم کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ باہر شہنائی کی سریلی آواز شادی ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

بارات خوب دھوم سے گئی چچی نے دل کھول کر دل کے ارمان نکالے۔ دردانہ پیش پیش تھی۔ سب ہنسی خوشی دلہن کو رخصت کرا لائے۔ لیکن ندیم نے نہ تو سالیوں سے مذاق کیا اور نہ کھانے پر موٹر لینے کا وعدہ ہی لیا۔ اس بات سے ندیم کی سدھائی کی دھوم مچ گئی۔ مہمان چند یوم رہ کر رخصت ہو گئے۔ دلہن کئی بار میکے گئی اور آئی۔ اسی طرح بہت دن بیت گئے۔ دردانہ اسی طرح گھر کے کونے کونے میں قہقہے لگاتی پھرتی۔ کبھی بھاوج کو چھیڑتا تو کبھی ندیم کو ستاتا۔ لیکن ندیم نہ جانے کیوں اسکے سامنے کچھ کھسیانا سا رہتا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب چچی ہوئی دردانہ کو سب نے دولہن بنا کر اسکے ماموں زاد بھائی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ دردانہ نے رخصتی سے پہلے ندیم کو ایسی نظروں سے دیکھا جو صاف صاف دل کا حال کہہ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ نظروں ہی نظروں میں اس سے کہہ رہی ہو۔ تم میرے لئے کچھ بھی نہ کر سکے اور اب اپنے پاس سے بھی ہٹا کر میری خوشیاں ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھینے لیتے ہو۔

ندیم نے چاہا کہ وہ اسے کچھ تسلی دے لیکن اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

دردانہ ایک ماہ بعد سسرال سے واپس آئی۔ لیکن اب وہ دردانہ پہلی سی نہ تھی۔ کھلے کھلے گیسو، اڑی اڑی رنگت، ناچتی ہوئی آنکھیں ساکت، شوخی کی جگہ سنجیدگی، قہقہوں کے بجائے پھیکی مسکراہٹ۔ ندیم نے اسکی حالت دیکھی اور دل پاش پاش ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی پر نفریں کرنے لگا۔ چار یوم رہ کر دردانہ اپنے گھر جانے لگی تو ندیم نے کہا:-

" دردانہ اسقدر جلدی کیوں جا رہی ہو؟ کچھ دن تو رہو۔"

" یہ گھر اب کاٹتا ہے" اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔

دردانہ چلی گئی۔ چچی کا خیال ہے کہ اسے گھر چھٹنے کا رنج ہے۔ بھاوج نے کہا شوہر کی طرف سے کچھ غم ہے۔ لیکن اسے کیا ہو گیا؟ کوئی کیا جانے؟

بقیہ حضرت فراق دہلوی مرحوم صـ ۲۰۶ سے آگے

کہ آپنے حضرت فراق کی کسی تصنیف پر مقدمہ یا دیباچہ خود لکھنا یا کسی مشہور اہل قلم سے لکھوانا۔ بالکل بیکار سمجھا۔ اور یونہی فراق مرحوم کی کتابیں (جن میں اکثر غلطیاں پائی گئی ہیں) چھاپ دیں۔ تعجب ہے کہ ملک کے ذمہ دار اہلِ قلم و علم حضرات ایک ادیب کی دماغی کاوشوں کی توہین ہوتے اس طرح دیکھتے رہیں۔

علاوہ ازیں تذکرہ نگار حضرات نے اپنی تصانیف میں فراق دہلوی کا نام تحریر کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ اور اگر بعض نے ذکر کیا بھی ہے۔ تو نہایت سرسری اور تھوڑا سا۔ کیا اسی پر وہ اردو کی ترقی کے بلند بالا دعوی کرتے ہیں۔

آپ مغربی ممالک کے اہلِ قلم حضرات کو دیکھئے کہ وہ اپنے ایک معمولی ادیب کے چھوٹے سے چھوٹے کارنامے کو نمایاں کر کے دکھاتے ہیں اور ادھر ایک ممتاز اہل قلم کا نام اپنی تحریروں میں لکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔

" اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے"

حضرت فراق دہلوی مرحوم

از محترمہ مہر جہاں صاحبہ دہلوی اہلیہ کرنل احمد بخش صاحب

حضرت حکیم خواجہ سیّد ناصر نذیر فراق دہلوی ۱۶ ار اگست ۱۸۶۵ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد شاہان مغلیہ کے عہد میں مناصب جلیلہ پر متعین تھے۔ علم و ادب آپکو خاندانی ورثہ میں ملا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تباہی و بربادی کے بعد رئیس دھر مپور نے آپکے والد ماجد میر محسن علی صاحب اور آپکے دادا صاحب کو ازراہِ قدردانی اپنے پاس بلالیا۔

حضرت فراق دہلوی نے اپنے والد بزرگوار اور دیگر مشاہیر اہلِ علم سے کل علوم عربیہ و فارسیہ حاصل کئے۔ طبابت حکیم بدرالدین خاں صاحب دہلوی و حکیم محمود علی خاں صاحب سے تلمذ کیا۔ شاعری اور انشاءپردازی میں شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔

ایک عرصہ تک تو فراق صاحب کو رئیس دھر مپور نے اپنے صاحبزادوں کا اتالیق اور اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ اور بڑی عزت افزائی کی۔ لیکن رئیس کے انتقال کے بعد آپنے ملازمت چھوڑ دی۔ اور اپنے قدیمی مسکن بارہ دری خواجہ میر دردؔ میں سکونت اختیار کرلی۔

لیکن انسان اپنی فطرت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اس سے حضرت فراق بھلا کیونکر بچ سکتے تھے۔ چونکہ آپ حضرت خواجہ میر دردؔ کے پوتے اور صحیح جانشین تھے اسلئے آپ میں ایکدم فقر و درویشی اور صوفیت حلول کرآئی۔ اور مرتے مر گئے۔ لیکن آخر تک اہل دول و امراء سے بچتے رہے۔ بالآخر ۱۲ر فروری ۱۹۳۳ء کو اپنی اس پاک سیرتی پر قائم رہتے ہوئے اس اُردو کی محسن اور بزرگ و ممتاز شخصیت نے بعارضۂ فالج وفات پائی۔ آپ کی موت کی خبر اُردو کے لئے بڑی جانکاہ ثابت ہوئی اور تمام اخبارات و رسائل نے آپ کی مرگ پر بڑا اظہارِ افسوس کیا۔ آپکے جنازہ کے ساتھ بھی دہلی کی مشہور اہلِ علم و ادب ہستیاں شامل تھیں۔

حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم جانشین حضرت خواجہ میر دردؔ مرحوم اُردو کے ممتاز اہل علم و صاحب طرز ادیب تھے۔ دِلّی کی نتھری ستھری قلعہ معلّی کی روزمرّہ زبان لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کی زبان کی سند شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی سید احمد مرحوم مؤلف فرہنگ آصفیہ نے سلطان زبان اُردو اور شہنشاہِ زباندانی کے خطابات سے سرفراز فرماکر دی ہے

اور ان کے متعلق عام مشاہیر ادب کی رائے ہے کہ فراق دہلوی زبان کے بادشاہ تھے آپ کا اسلوب بیان اتنا رنگین، دلکش اور سادہ و سلیس ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی آپکی عبارت کو پڑھ کر آپ کی شیریں و جادو بیانی سے لطف اندوز ہو جاتا ہے اور اسپر آپکے لطیف و چست مختصر جملے اور شیریں بندشیں سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں۔ آپ ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے۔

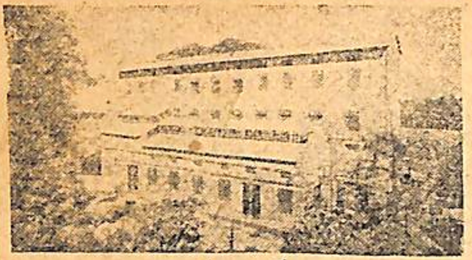
ویسے تو آپ بڑے قادرالکلام واقع ہوئے تھے اور ہر موضوع پر بیدھڑک قلم چلاکر صفحۂ قرطاس پر گل و بوٹے کھلادیتے تھے۔ لیکن حُسن و عشق کے لئے وہ اُردو کے فرانسیسی ادیب آسکر وائلڈ تھے۔ وہ اپنی تحریر میں جمیل و لطیف تشبیہات و استعارات اور نازک و دلکش الفاظ چوٹی کی طرح گوندھتے چلے جاتے تھے۔

علاوہ ازیں غم کی نگارش میں الم ایسا دکھاتے تھے کہ آدمی وفور درد سے بیچین ہو جائے۔ یہی حال طربیہ انداز تحریر کا تھا۔

آپ کردار نگاری دکھانے میں بھی یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ جہاں پنڈتوں کی بول چال ہے۔ وہاں آپ کی تحریر پنڈتانہ ہی ہوتی چلی گئی ہے اور رسم و رواج وغیرہ بالکل اہل ہنود کا سا ہو جاتا ہے۔ یہی حال آپکے دوسرے کرداروں کا ہے۔ اور اس کے لئے آپ ہر طبقہ و سوسائٹی کے افراد سے ملتے جُلتے تھے۔ اور ان کی ہر بات اور ریت رسموں کا گہرا مطالعہ کرتے تھے۔

آپ کے اُردو علم و ادب کے قدردان ہندوستان کے علاوہ عدن، جدّہ، افریقہ و دیگر ممالک میں بھی موجود ہیں۔ آپ نے دِلّی کی قدیم مغلیہ تہذیب پر کئی عمدہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ مگر افسوس زمانہ کی قدر ناقدرشناسی اور ملک کے بے توجہ ادبی اداروں (خصوصاً انجمن ترقی اُردو ہند دہلی) اور ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد) کی وجہ سے اشاعت پذیر نہ ہوسکیں۔ شاید اب کوئی ادیب پرور اس کارِ خیر کیطرف توجہ کرے۔

اس سلسلہ میں مجھے اپنے محترم کرمفرما جناب شاہد احمد صاحب مدیر ساقی دِلّی، اور کتب خانہ علم و ادب کے مالک وصی اشرف صاحب سے دو دو باتیں کرنی ہیں۔ کیونکہ یہ حضرات، فراق صاحب کی تصانیف چھاپ چھاپ کر فائدہ تو اُٹھا رہے ہیں لیکن ان کے ادب کے مدعی بننے والوں سے سوال ہے



و بجی ٹیبل پروڈکٹس فیکٹری دہلی

تار کا پتہ	ٹیلیفون نمبر
دہلی گنیش	دہلی ۵۵۲۳
لائلپور گنیش ملز	لائلپور ۳۳۶
کانپور گنیش ملز	کانپور ۲۱۳۰
امروہہ گنیش	امروہہ —



گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ

دہلی — لائلپور — کانپور — امروہہ



ہندوستان کی سو فیصدی سودیشی اور عظیم الشان پرانی کمپنی جس میں کل سرمایہ ہندوستان کا اپنا لگا ہوا ہے کمپنی کا بڑھتا ہوا کام اور گنیش فلور ملز کمپنی لیمٹیڈ کا نام اس کی بڑھیا اور نفیس اشیاء کی مکمل گارنٹی ہیں



کمپنی کی تیار کردہ

بناسپتی یعنی وجی ٹیبل پروڈکٹ اور دانہ دار کھانڈ۔ بورا۔ نفاست پاکیزگی۔ ذائقہ اور صفائی کی وجہ سے بھارت کے کونے کونے میں مشہور اور مقبول عام ہیں۔

گنیش ملز

کا میدہ اور سوجی بہت بڑھیا اور عمدہ ہونے کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں اور نہ صرف حلوائیوں بلکہ بیاہ اور شادیوں میں استعمال کے لئے مشہور ترین تحفہ ہیں



ہمارے ہاں آٹا
میدہ۔ روا سوجی
چوکر۔ بناسپتی
(وجی ٹیبل پروڈکٹ)



چینی۔ بورا شیرہ۔ آکسیجن گیس اور کپڑے دھونے کا صابن وغیرہ وغیرہ مارکیٹ میں آپکو نہایت عمدہ اور کفایت سے ملینگے

THE GANESH FLOUR MILLS CO. LTD.
SABZI MANDI, DELHI.

تنقید و تبصرہ

فلمی دنیا

دس (۱۰) بجے

پیش کردہ . . . . پربھات فلم کمپنی پونا

جاری کردہ . . . . فیمس پکچرز لمیٹڈ

اداکار خصوصی . ہریش بنرجی . ارملا اور بےبی شکنتلا . . .

ڈائرکشن . . . . راجہ نینے

کہانی

کہانی کا تعلق کالج کی رنگین اور پرمذاق زندگی سے ہے۔ جہاں سوائے حصول تعلیم کے کسی بات کی فکر نہیں ہوتی —— ہیرو اور ہیروئن —— دونوں تعلیم حاصل کر رہے ہیں —— جہاں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی بے پناہ محبت کا وجود ہے۔ وہاں اپنی پڑھائی کا بھی قوی تر جذبہ جاگزیں ہے —— ملاقاتوں میں زیادہ وقت کا گزرنا ہیرو کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک ملاقات کے دوران ان دونوں میں یہ بات طے پاتی ہے کہ وہ ہر روز رات کو دس بجے اپنے اپنے مکان پر ایک دوسرے کو یاد کر لیا کریں۔ اور ہفتہ میں ایکبار حقیقت کے اسٹیج پر ملاقات ہوا کرے چنانچہ ایک مدت تک ایسا ہی ہوتا ہے۔

کہانی کروٹ لیتی ہے اور عام فلموں کی طرح ہیروئن کی شادی ایک دوسری جگہ طے پا جاتی ہے۔ گویا ٹریجڈی کا آغاز ہوا —— جس طرح زمین گول ہے اسی طرح یہ اسٹوری بھی آگے چل کر گول ہو جاتی ہے۔

اکثر فلموں کے نام ایسے دیکھنے میں آئے ہیں کہ ان سے اور کہانی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن دس بجے وہ پہلا فلم ہے کہ اگر اس کا نام "دس بجے" نہ رکھا جاتا تو۔ دوسرا کوئی مناسب نام تجویز نہ ہو سکتا تھا۔

اگر دو ایک درمیانی چند ٹکڑوں کو چھوڑ دیا جائے تو خلاصے کے اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "دس بجے" کی کہانی ایک بالکل اچھوتی اور انتہائی جاندار کہانی ہے۔ جس پر اگر مزید محنت اور جدت طرازی سے کام لیا جاتا تو اس کی یاد کے نقوش ایک بڑی مدت تک ... دلوں سے

سے نہ ہٹتے۔

مکالمے و گانے:- پامال اور لطیف زبان میں پیش کئے گئے ہیں، بہت مختصر الفاظ —— اور کافی مفہوم۔ ان کی خصوصیت ہے۔ دو تین گانے تو بہت ہی دلکش اور رسیلے ہیں، جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈائرکشن:-

یوں تو کوئی فلم ڈائرکشن کی خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔ اور ہر تصویر میں ڈائرکشن کی بے شمار خامیاں ہوتی ہیں۔ مگر "دس بجے" ان تمام موٹی موٹی خامیوں سے پاک ہے جن تک عوام کی نگاہیں رسائی کر جاتی ہیں

اداکاری:-

ہریش بنرجی۔ ارملا۔ ہریش بنرجی کی اداکاری بہت خوب ہے اور اس سے اسی وقت پورا پورا حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جبکہ پردۂ سیمین سے نگاہیں ہمکنار ہوں۔

سٹینگز:-

فوٹوگرافی اور سینیز بھی نہایت اعلیٰ ہے۔ فلم بین طبقہ کو یہ فلم ضرور دیکھنا چاہیئے۔ آخر میں ہم پربھات فلم کمپنی کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ بجائے محض ہندی زبان کے اگر ٹائیٹل پر اردو و ہندی دونوں کو جگہ دے تو زیادہ بہتر ہے۔

بھگت سورداس

پیش کردہ . . . . رنجیت موویٹون دادر بمبئی . .

جاری کردہ . . . . جگت ٹاکیز . . . .

ڈائرکٹر . . . . چتربھوج دوشی . . . .

اداکاران :- سہگل، خورشید، مونیکا ڈیسائی وغیرہ . . . .

کہانی:-

کون شخص ایسا ہوگا جو "بھگت سورداس" کی سوانح عمری

سے ناواقف ہو۔ کسی زمانے میں یہ کہانی نوٹنکیوں اور تھیٹروں کی جان
تھی اور غالباً میڈن تھیٹرز نے اسے فلمی جامہ بھی پہنایا تھا۔ لیکن اس
سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ نہیں جیسا کہ رنجیت موی ٹون نے
پہنایا ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے "ٹھوکر" کے بعد رنجیت نے اگر
کوئی اعلیٰ کہانی پیش کی ہے تو وہ "بھگت سورداس" ہے۔

منگل (بھگت سورداس) چنتامنی نامی ایک طوائف کی محبت
میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی اچھائی برائی نہیں سوجھتی۔
اگر کچھ سوجھتا ہے تو صرف ــــ چنتامنی ــــ چنتامنی کی ترغیب ــ
اہا ہا ــــ کتنی پیاری۔ پاکیزہ اور قابل قدر ترغیب ہے ــ "میرا
پریم تیاگ دو ـــ اور بھگوان سے لو لگاؤ ـــ" منگل کی زندگی پلٹا
کھاتی ہے۔ اور یہ اپنے وقت کے سب سے بڑے بھگت بن جاتے ہیں
اگر مجاز سے حقیقت تک ۔۔ کی راہوں کا نشیب و فراز دیکھنا ہو تو "بھگت
سورداس" کی کہانی کا مطالعہ کرو ـــ کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ـــ
ان کی زندگی سوز و گداز کی ایک ایسی داستان ہے، جس کا ایک ایک لفظ
بجائے خود ایک قابل فراموش داستان ہے۔

ڈائرکشن:۔

اوسط درجہ کا ہے، ضرورت اس امر کی تھی کہ آدھی فلم (ابتدائی
حصہ کو) زیادہ سے زیادہ رنگین تر بنایا جاتا۔ تاہم "بھگت سورداس"
کا ڈائرکشن بڑی حد تک کامیاب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

گانے اور مکالمے:۔

گانوں کے متعلق کچھ لکھنا قطعی بے سود ہے، سہگل اور خورشید

اب قیامت میں دیر کیا ہے جمال
جمع ہیں دو شباب ایک جگہ

مکالمے سیدھی سادھی زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ بہت موثر
اور معنی خیز ہیں۔

سینریو:۔

اس فلم کے سینریو کو جس قدر سراہا جائے کم ہے۔ بہت کم تصویریں
ایسی دیکھنے میں آئی ہیں جن کا سینریو اس اعلیٰ پیمانہ پر پیش کیا گیا ہو۔
آرٹ ڈائرکشن پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اس لئے کہیں کہیں
خامیاں نظر آتی ہیں لیکن اس سے تصویر کی دلچسپی اور جاذبیت میں کمی محسوس نہیں
ہوتی۔

"بھگت سورداس" ایک اعلیٰ درجہ کی اصلاحی تصویر ہے
ہم مذہب و ملت کے فلمی تماشبینوں سے اپیل کرتی ہیں کہ وہ اسے ضرور دیکھیں۔

زمیندار

پیش کردہ . . . پنچولی آرٹ پروڈکشن لاہور
جاری کردہ . . . ایمپائر ٹاکیز فلم ڈسٹری بیوٹرز
ڈائرکٹر . . . بی۔ گڈوانی
کہانی و مکالمے . . . سید امتیاز علی تاج
اداکاران: شانتا آپٹے۔ غلام محمد۔ منورما۔ بی بی اختر اور ایم اسماعیل وغیرہ
گانے: حضرت بہزاد ... قمر ... ناظم
میوزک: . . . غلام حیدر صاحب

کہانی:۔

کا معیار بلند ہے، مکالمے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہیں اور مفہوم
سماج کی گرتی ہوئی حالات کو سنوارنا ہے۔ اس کہانی کا وہ حصہ بہت پرلطف
ہے کہ جب دو آدمی ایک خاص آدمی کو قتل کرنے ایک ہی وقت پر جاتے ہیں اور
دونوں اپنے خیال میں نشانہ پر وار کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں لیکن اصل ملزم
کا سراغ نہیں ملتا، مگر ایک خاص منزل آنے پر حقیقت کے تمام دروازے
خود بخود تماشائی پر کھل جاتے ہیں، یعنی اصل ملزم کو اندھی بہار ان کی مدد سے گرفتار
کر لیا جاتا ہے۔ گویا ایک طرف مظلوم کسان پر زمیندار کی سامراجی ذہنیت آشکار
ہوتی ہے تو ایک طرف جاسوسی طرز کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ آجکل سوسائٹی
کو ایسے ہی ترقی پسندانہ فلموں کی ضرورت ہے۔

ڈائرکشن:۔

بہت کامیاب ہے، مسٹر بی گڈوانی نے اپنی بیدار مغزی اور قابلیت کا
پورا پورا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اور پبلک کے مذاق کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے بعض
مواقع پر پرنچر، عمدگی کے ساتھ دیئے گئے ہیں غرض ڈائرکشن بڑی حد تک قابل
ستائش ہے۔ میدان اداکاری میں شانتا آپٹے۔ غلام محمد۔ ایم اسمٰعیل۔ بی بی اختر
تمام اداکاروں سے آگے ہیں ان کی لاجواب ایکٹنگ نے فلم کو چار چاند لگانے میں کوئی کسر
نہیں چھوڑی،

گانے شہرت یافتہ اور قابل ترین ہستیوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں۔ اسلئے حد سے زیادہ
کیف زا با معنی ہیں،

مکالمے:۔ شستہ اور عام فہم تحریر کئے گئے ہیں۔ سن کر سمجھنے کی
ضرورت پیش نہیں آتی، فوٹو گرافی آرٹ ڈائرکشن اور سیٹنگ وغیرہ کے فرائض
بحسن و خوبی انجام دیئے گئے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے "زمیندار" دل بستگی کا
گہوارہ کہا جا سکتا ہے

رنگین دنیا کی رنگینیاں

از ادارہ

پنچولی آرٹ پکچرز لاہور

کی تازہ ترین فلم "زمیندار" کی نمائش دہلی کے موتی ٹاکیز میں ۱۳ دسمبر ۱۹۴۲ء سے شروع ہے۔ جب توقع آنا رش ہے۔ کہ لوگ ٹکٹ نہ ملنے سے مایوس ہوکر واپس آجاتے ہیں افتتاح کے روز تو پولس کو انتظام کرنا پڑا کیونکہ بہت لوگ کھینچا تانی میں زخمی ہوگئے تھے امید تو یہ ہے کہ "زمیندار" خاندان سے زیادہ مقبول ہوگا۔ زمیندار کا افسانہ سید امتیاز علی تاج لاہور کے قلم کا رہین منت ہے۔ تخیل بڑا اچھوتا ہے۔ مکالمے بڑے زوردار ہیں۔ زمیندار کے گانے حضرت بہزاد لکھنوی۔ قمر جلال آبادی۔ ناظم پانی پتی نے لکھے ہیں یہ حضرات دنیائے شاعری میں کافی مشہور ہیں۔ پھر ماسٹر غلام حیدر میوزک ڈائرکٹر کی ڈائرکشن نے ان گانوں کو بے حد دلپسند بنا دیا ہے اداکاروں میں شانتا آپٹے۔ مس منورما۔ غلام محمد۔ اسمٰعیل نارنگ۔ اجمل۔ بی بی اختر درگا موٹے۔ غلام نبی جیسے چوٹی کے لوگوں نے فن کرداری کا حق ادا کردیا ہے سیٹنگ بھی اچھا ہے۔ غرض "خاندان" کے بعد جیسی لوگوں کو توقع تھی "زمیندار" نے اسے پوری کردی۔

رنجیت موی ٹون بمبئی

کی تازہ فلم سورداس شمالی ہند میں بے حد کامیاب ہو رہی ہے اور ۹ اسٹیشنوں پر چلتے ہوئے بیک وقت چار ہفتوں سے زیادہ ہوچکے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا عرصہ یہ فلم لے گی۔

یہ فلم عشق مجازی اور عشق حقیقی کی ایک غیر فانی داستان ہے۔ جس میں ملکہ موسیقی خورشید اور خوش گلو سہگل نے ایک تلاطم پیدا کردیا ہے۔ افسانہ کا پلاٹ ہی رنگین ہے جسے بار بار دیکھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ دہلی کے جگت سینما ہال میں اس فلم کی نمائش ہو رہی ہے اور رش کا یہ عالم ہے کہ جگہ نہیں ملتی مسٹر چتر بھج دوشی نے ہندوستان کی بہترین فلموں میں ایک بہترین فلم کا اضافہ کرکے حیرت انگیز کام کیا ہے۔

ہند پکچرز

کی تازہ فلم "کلجگ" کراچی اور راولپنڈی میں ریلیز ہوچکی ہے۔ کراچی میں پہلے چار دن کی آمدنی ۵۷۲۴ روپیہ اور راولپنڈی میں تین روز کی آمدنی ۴۲۳۳ روپیہ ہے۔ ان دونوں مقامات پر یہ تصویر بے حد پسند کی گئی۔ اس کامیابی کا سہرا مسٹر نذیر کے سر ہے جنہوں نے فلمسازی میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کرلی ہے۔

ستارہ۔ کمار۔ نذیر انورا دھا اور گوپ نے اس فلم میں کام کیا ہے

نیشنل سٹوڈیوز بمبئی

کا مایۂ ناز فلم "لالہ جی" میجسٹک سینما دہلی میں دکھایا جا رہا ہے اس کے گانے حضرت آرزو لکھنوی نے لکھے ہیں۔ اداکاروں میں گنجو۔ کرشنا کانت یعقوب۔ مایا۔ گلزار۔ عبدالرحمٰن کابلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یونائیٹڈ فلمس

کی دوسری تصویر "بھائی جان" جسے ڈائرکٹر وجاہت مرزا چنگیزی فلمائیں گے۔ ترقی پسند ڈائرکٹر ایس خلیل اور پروڈیوسر مسٹر ایس مراد کارکنان یونائیٹڈ فلمس نے اپنی دوسری مسلم سوشیل تصویر "بھائی جان" کے لئے مشہور افسانہ نگار مسٹر وجاہت مرزا چنگیزی کی خدمات بطور ہدایت کار کے حاصل کرلی ہیں۔ آپ یونائیٹڈ کی دوسری زرنگار پیش کش "بھائی جان" کی ڈائرکشن کے فرائض انجام دیں گے۔ مسٹر وجاہت مرزا چنگیزی دنیائے فلم کی ان شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں جن پر ہماری صنعت فلمسازی بجا طور پر ناز کرسکتی ہے آپ نے ایک مزاحیہ تصویر "جوانی" نیشنل اسٹوڈیوز لمیٹڈ کے لئے تیار کی ہے امید ہے کہ "جوانی" عوام میں پیش ہوکر ڈائرکٹر وجاہت مرزا چنگیزی کو ہدایت کاروں کی صف میں ایک بلند مقام پر پہنچا دے گی۔

یونائیٹڈ فلمس کی پروڈکشن نمبر ۲ کے پروڈیوسر ترقی پسند ہدایت کار ایس خلیل ہوں گے جو اپنی پہلی تصویر "گھروندہ" کو تقریباً آدھا مکمل کرچکے ہیں "بھائی جان" کا افسانہ ملک کے مشہور ادیب مسٹر افضل مرزا چغتائی نے تحریر فرمایا ہے اداکاروں کا انتخاب ابھی زیر غور ہے۔

ہدایت کار وجاہت مرزا چنگیزی بہت جلد "بھائی جان" کی رسم افتتاح کرنے والے ہیں۔

کرتی پکچرز بمبئی میں "فلم محبت کی شاندار مہورت" ——— کرتی پکچرز کے نوجوان و بیدار مغز مالک مسٹر پی۔ بی۔ زوبیری نے اپنے عظیم الشان پروگرام فلمسازی کی ابتدا کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے چار فلمیں بیک وقت تیار کرلی ہیں۔ پہلی فلم برات کے نام سے جسے مسٹر گنجال نے ڈائرکشن کیا ہے عنقریب پردۂ سیمیں پر جلوہ افروز ہو گی۔ دوسرا شاہکار "اشیرواد" جس کو مسٹر ڈائرکٹر مسٹر راجندر ٹھاکر نے ڈائرکٹ کیا ہے بالکل مکمل ہے تیسرا سوشل کارنامہ "راحت" جو مشہور ڈائرکٹر مسٹر امنگ ڈیسائی کا زریں شاہکار ہوگا وہ بھی بہ سرعت مکمل کیا جارہا ہے۔ چوتھی فلم "محبت" کی افتتاح اس کے مشہور ڈائرکٹر مسٹر شوکت حسین رضوی نے ۱۹ دسمبر ۱۹۴۲ء کو سینٹرل اسٹوڈیوز میں ادا کی اس کی شوٹنگ بھی بسرعت شروع ہو جائے گی۔ "محبت" میں مشہور و حسین ممثلہ ممتاز شانتی۔ مسٹر موتی۔ نورجہاں آف خاندان نیم۔ بابا ابراہیم اور مسٹر اے ہمالیہ والا اداکاری و نغمہ آرائی کے حیرت انگیز کارنامے پیش کریں گے ان چاروں شاہکاروں کے ساتھ "پرسرام" جو سال نو کا دلکش بہترین اور بلند پایہ مذہبی شاہکار ہوگا۔ اس کی شوٹنگ بھی شروع ہو جائے گی۔ مشہور ڈائرکٹر و اداکار مسٹر جاگیردار سے بھی معاہدہ کی گفت و شنید جاری ہے۔ اور امید ہے کہ کرتی پکچرز موصوف کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی ضمناً یہ کہ برات کی نمائش کے خلاف جو درخواست امتناع حکم پکچرز نے آنریبل جسٹس چھاگلا کے حضور میں پیش کی تھی اس کو فاضل جج نے وکلا کا بیان سنکر کرتی پکچرز کے حق میں معہ خرچہ عدالت کے خارج کردیا اب عنقریب ہندوستان کے ہر شہر میں "برات" کی نمائش شروع ہو جائے گی۔ مسٹر پی۔ بی زوبیری اپنی سریع الاثر رفتار ترقی پر مبارکباد کے مستحق ہیں

محبوب پروڈکشنز بمبئی کے ڈائرکٹر و پروڈیوسر مسٹر محبوب کی فیاتی فلم کمپنی ہے اور اس کا پہلا مسلم سوشل شاہکار "نجمہ" بین الاقوامی شہرت کا حاصل شاہکار سمجھا جا رہا ہے اس کی شوٹنگ پر ایک مشہور جرنلسٹ نے مذکورہ خیال کا اعادہ کیا ہے۔

نجمہ کا بلند معیار افسانہ اور اس کا موثر پلاٹ مشہور افسانہ نگار مسٹر آغا جانی کشمیری نے لکھا ہے۔ اور اس کی موسیقی و عکاسی بے مثل کہی جاتی ہے۔ پردۂ سیمیں کی حسین ساحرہ مس وینا "نجمہ" میں ایک اہم کردار ادا کررہی ہے۔ ہمیں مسٹر محبوب کے نظر انتخاب کی داد دینی چاہئے۔ کہ حور شمائل مس وینا کے علاوہ مسٹر اشوک کمار، مسٹر کمار، مس انورادھا مسٹر مجید، مس شاہنتا کاشمیری جیسے نادر ستاروں کو ایک جگہ جمع کرلیا ہے بلاشبہ یہ اپنی شاندار نمائش پر ملک سے خراج تحسین وصول کرے گا۔

فضلی برادران بمبئی مسٹر سبطین فضلی دنیائے فلم میں ایک لاجواب ڈائرکٹر تسلیم کئے گئے ہیں۔ کلکتہ کی ناسازگار فضا سے متاثر ہوکر بمبئی آ گئے ہیں۔ اور فلمی دنیا کی اس سب سے بڑی مارکیٹ میں اپنے کارنامے پیش فرما رہے ہیں۔ چنانچہ فیشن کی شوٹنگ بڑے زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ اس کے مکالمے اور گانے علامہ آرزو لکھنوی نے لکھے ہیں۔ اداکاروں میں سردار اختر، چندرموہن۔ بھوڈو اڈوانی۔ نندکشور۔ کامتا پرشاد۔ ایس نذیر۔ نظیر کاشمیری اور آغا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس فلم کی تیاری کے بعد "بھائی بہن" "کالج"۔ "ہمایوں" منظر عام پر آنے والے ہیں۔ ان کی تفصیلات کا انتظار کیجئے۔

راجہ موی ٹون بمبئی کے پروڈیوسر و ڈائرکٹر ظہور راجہ نے فلم مذاق زندگی کی زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے بنایا ہے افسانہ اور مکالمہ کمال امروہوی نے لکھا ہے۔ اور گانے عابد گلریز کے قلم گوہر بار سے برآمد ہوئے ہیں۔ عابد گلریز ایک لاجواب شاعر ہیں ان کے الہامات میں ایک سحر ہے۔ پبلسٹی افیسر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ "مذاق" کا درجہ بلند ہے اس لئے ٹریڈ کا قطب مینار قرار دیا ہے۔ اداکاروں میں مادھوری۔ پہاڑی سانیال رادھا رانی۔ شیام۔ نذیر بیدی۔ شاکر۔ پریمی۔ موہن۔ رام اوتار تارا موٹا اور خود ظہور راجہ کام کررہے ہیں۔

منور نجن پکچرز نیشنل سٹوڈیوز کی فلم "لالہ جی" میجسٹک سینما دہلی میں چوتھے ہفتے میں کامیابی سے چل رہی ہے یہ ایک ایسی فیملی پکچر ہے جو بیہودگیوں سے بالکل پاک ہے اور جس کو جتنی مرتبہ دیکھیں۔ نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ منشی جی اور لالہ جی کی دوستی ہندو مسلم اتحاد کا قابل تقلید نمونہ ہے۔ یہ فلم دہلی میں ——— بہت پسند کی جارہی ہے۔

سلور فلم بمبئی کی دوسری سنہری پیشکش "بھلائی" کو آپ کبھی بھول نہیں سکیں گے۔ کیونکہ اس کے مکالمے اور گانے حسرت لکھنوی نے لکھے ہیں اور اداکاروں میں ستارہ۔ پرتھوی راج کمار۔ شام۔ مجید۔ ای بلیموریہ۔ ایس نذیر اور گوپ وغیرہ نے لاجواب کام کیا ہے عنقریب یہ فلم نمائش کے لئے آنیوالی ہے۔

پارس پکچرز بمبئی کی بے نظیر تصویر "میرا خواب" سنہ ۴۳ء کی ایک جواب فلم ہو گی اس کی بہترین فوٹوگرافی۔ روح نواز موسیقی۔ دلچسپ افسانہ۔ ایک نہ بھولنے والا خواب ہو گا۔ اس کی عکاسی ایچ۔ ڈی پٹیل نے کی ہے اور اداکاروں میں زیب النساء مسٹر پرکاش مسٹر سسن۔ مسٹر عباس اور گلزار وغیرہ نے انتہا سے زیادہ دلکش کردار پیش کئے ہیں۔ ہم اس کے پروڈیوسر سی۔ ایل۔ پارکھ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ایشیاٹک پکچرز بمبئی کی تازہ فلم "یاد" انسانی جذبات کو ابھارنے والا فلم ہے۔ مظہر خاں وینا آزوری۔ اندرا۔ شاہزادی اور ہادی وغیرہ نے دلچسپ کام کیا ہے اس کمپنی کے دوسرے فلم "دنیا نانے" کی مہورت ہو چکی ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ مظہر خاں کی یہ تصویر یاد بڑی مقبول ہو گی اور ناگ پور میں لوگوں نے اسے بحد پسند کیا ہے۔

چندر موہن کا مندر میں چندر موہن نے شانتا رام کی کمپنی راج کمل کلا مندر سے معاہدہ کیا ہے اور شانتا رام کے پہلے فلم شکنتلا میں دشینت کا کردار ادا کریں گے

واڈیا پیراماونٹ پکچرز معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے دس نئی تصویریں شمالی ہند میں نمائش کے لئے حاصل کی ہیں جنگ پکچرز کی آنیوالی فلمیں اور تلوار پروڈکشنز کی "منچلی" بھی انھوں نے حاصل کر لی ہے۔

ناردرن انڈیا ٹاکی ڈسٹری بیوٹرز انھوں نے سلور فلمز کی آنیوالی تصویر "جھلائی" شمالی ہند میں نمائش کے لئے حاصل کر لی ہے۔

انڈیا فلم بیورو دہلی ایسٹرن پکچرز کی دو تصویریں "بادل" اور "دعوت" کے جملہ حقوق نمائش انڈیا فلم بیورو کے مالک ایچ نے شمالی ہندوستان کے لئے ایک معقول رقم پر حاصل کئے ہیں۔

"دعوت" جو سنہ ۴۳ء کا بہترین مترنم ومزاحیہ شاہکار ہو گا۔ اور جس کے مکالمے اور ڈائرکشن "شاردا" کے مشہور افسانہ نویس اور دنیائے فلم کے درخشندہ ستارے مسٹر ایم۔ نذیر اجمیری کے کاوش دماغ کا حاصل ہے۔ ان دنوں کمرۂ تدوین میں بسرعت تمام ضروری مدارج طے کر رہا ہے۔ اور امید ہے۔ کہ سنہ ۱۹۴۳ء کے آغاز ہی میں کسی بہترین سینما ہاؤس میں جلوہ بار ہو کر اپنے ناظرین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب وکامران رہے گا۔ اور انھوں نے فضلی برادرس لمٹیڈ کی آئندہ تیار ہونے والی چار فلمیں شمالی ہند میں نمائش کے لئے حاصل کر لی ہیں۔ پہلی تصویر "فیشن بمبئی میں" ڈائرکٹر ایس۔ ایف حسنین کی زیر ہدایت سرعت سے تیار ہو رہی ہے

اس میں چندر موہن اور سردار اختر نمایاں اداکار ہیں۔ اس تصویر میں مغرب پرستی کے نتائج بھیحہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ سوشل تصویر بہت جلد پردۂ سینما پر پیش کر دی جائے گی۔

سن رائز پکچرز کے دو عمدہ فلم نرگس اور روحانی تیار ہو رہے ہیں، نرگس کو مسٹر شوکت حسین خاندان کے ڈائرکٹر نے ڈائرکٹ کیا ہے۔

مسٹر شوکت حسین لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور وہاں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، دس سالہ تجربہ ہے "خاندان" کی بے حد کامیابی ان کی ہدایت کاری کا بین ثبوت ہے۔

افسانے اور مکالمے سعادت حسن منٹو نے لکھے ہیں اداکاروں کے نام یہ ہیں۔ چندر موہن، شوبھنا، سمرتھ، نور جہاں، (خاندان والی) یعقوب مرزا مشرف۔ بلونت سنگھ۔ مس موتی، "دوہائی" کا افسانہ دونئے اور مکالمے ضیا سرحدی نے لکھے ہیں۔ اداکاران شانتا آپٹے، ایم، کمار، نور جہاں، مرزا مشرف۔ اسی طرح "دہائی" بھی بڑی کامیاب اور بے مثل تصویر ہے، اداکاران۔ اسٹوری۔ میوزک نہایت عمدہ ہے۔

آر ایس چندن مل اندر کمار شوری پکچرز کی تازہ ہندی تصویر "نشانی" پشاور۔ راولپنڈی وغیرہ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔ یہ فلم بہت جلد دہلی کے کسی مشہور سینما میں پیش ہو گی۔

پنجابی تصویر "منگتی" پنجاب کے علاوہ دہلی اور یوپی میں بھی قابلِ فخر کامیابی حاصل کر رہی ہے، "تاج محل ٹاکیز" آگرہ میں اس فلم کی پہلے دن کی آمدنی ساڑھے نو سو روپے کے قریب ہے اسی سینما میں یہ تصویر اب دوسرے ہفتہ میں چل رہی ہے۔ دہلی کے "ریٹن ٹاکیز" میں بھی یہ فلم تیسرے ہفتہ میں جاری ہے۔ اس سے پہلے یہ تصویر تین دفعہ چل چکی ہے۔

سکینہ اینڈ کمپنی مسٹر چاند بہادر سکینہ شمالی ہند کے وہ کامیاب ڈسٹری بیوٹر ہیں۔

جنہوں نے اعلیٰ فلمیں بک کرا کر شائقین سینما کے جذبۂ فلم بینی کی تسکین کی ہے۔ آجکل آپ نے شالیمار پکچرز بمبئی کی فلم "ایک رات" اور ایشیاٹک پکچرز کی فلم "یاد" بک کرائی ہے یہ دونوں فلمیں فلمی نقطۂ نظر سے بڑے پایہ کی ہیں۔ چنانچہ "ایک رات" لاہور۔ علیگڈھ۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ کانپور گوجرانوالہ جیسے اہم مقامات پر بڑی کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ اسطرح "یاد" جسے ڈائرکٹر مظہر خاں نے پیش کیا ہے۔ بہترین فلم ثابت ہوگی اور عنقریب اہلِ دہلی کے سامنے دونوں فلمیں پیش کی جائیں گی۔

جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز

انھوں نے رنجیت مووی ٹون اور ہند پکچرز کی آنیوالی تصویریں بک کرالی ہیں۔

مسٹر مغنی وینس پکچرز میں

فلمی اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء سے مسٹر مغنی بی۔اے وینس پکچرز کے پبلسٹی افیسر مقرر ہو گئے ہیں ہمارے خیال میں وینس پکچرز کے مالک نے بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیا کہ فلمی لائن کے ایک تجربہ کار اور بالیاقت شخص کا انتخاب کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ وینس پکچرز کی تصاویر کی پبلسٹی شاندار طریقے پر ہوگی اور بہت جلد پچھلے خسارے کی تلافی ہو جائے گی۔

"کلجگ" کی کامیابی

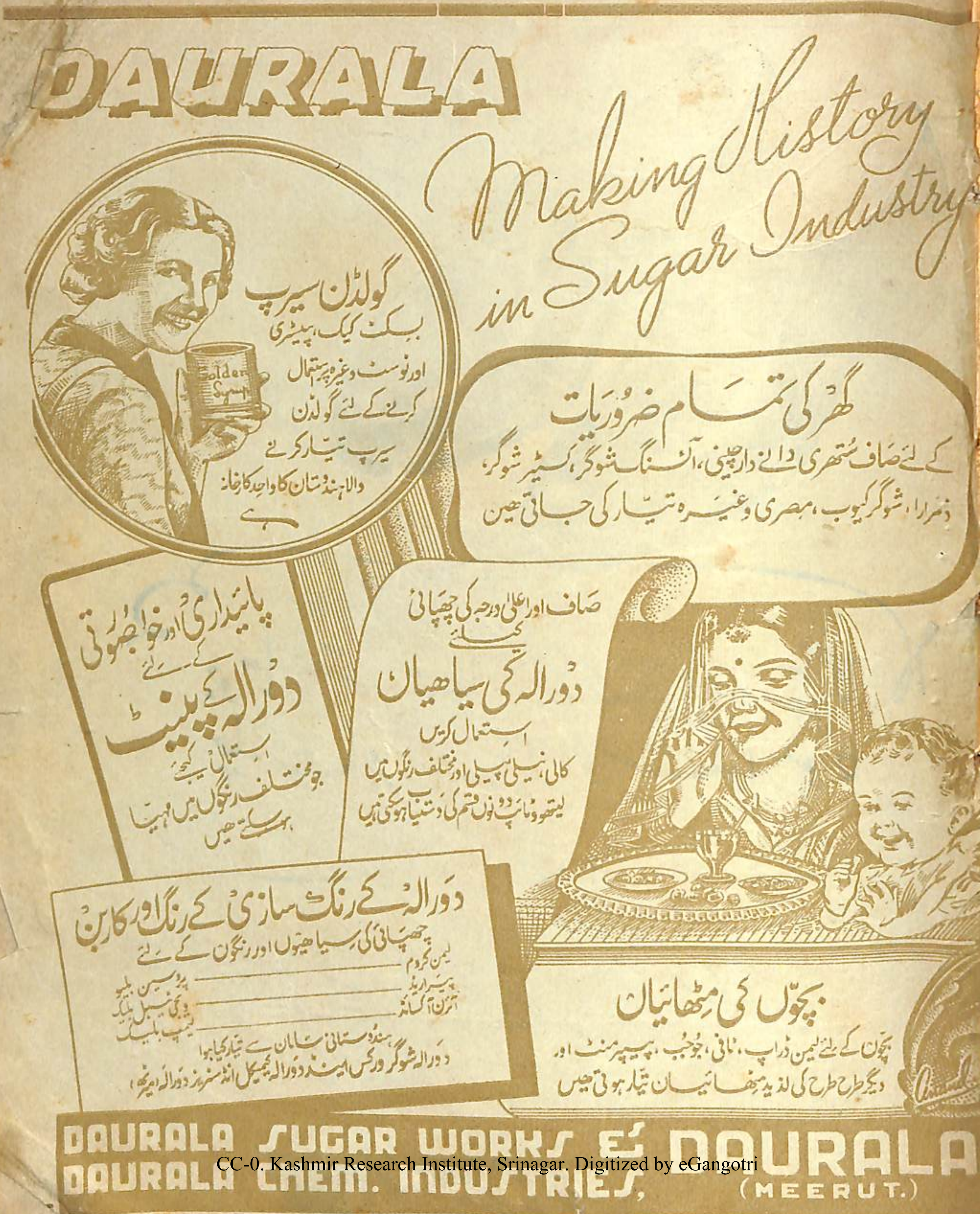
ہند پکچرز کی تازہ فلم "کلجگ" کراچی اور راولپنڈی میں ریلیز ہو چکی ہے کراچی میں پہلے چار دن کی آمدنی ۵۷۲۴ روپیہ اور راولپنڈی میں تیس روز کی آمدنی ۳۲۳۳ روپیہ ہے۔ ان دونوں مقامات پر یہ تصویر بیحد پسند کی گئی ہے۔ اس میں ستارہ۔ کمار۔ منور۔ انورادھا۔ مجید اور گوپ اداکاری کرتے ہیں۔

موہن پکچرز بمبئی

ڈاکٹر نانو بھائی وکیل نے "نیا زمانہ" مکمل کر لیا ہے۔ اس کمپنی کی آئندہ تصویر "جادوئی جھولا" ہوگی جس کو ڈائرکٹر عطا محمد خاں تیار کریں گے۔

پرتھوی راج کی فلم "لیڈی ڈاکٹر"

معلوم ہوا ہے کہ پنجابی فلم "ہیر سیال" بنانے والے ڈائرکٹر کے ڈی مہرہ وینس پکچرز میں شامل ہو گئے ہیں۔ اب خبر آئی ہے کہ انھوں نے مسٹر مدھوک کا ایک افسانہ فلمانے کے لئے حاصل کر لیا ہے۔ اس کا نام "لیڈی ڈاکٹر" رکھا گیا ہے اس میں سوبھانہ سامرتھ اور پرتھوی راج کام کریں گے۔


DAURALA
Making History in Sugar Industry
گولڈن سیرپ
بسکٹ کیک، پیسٹری
اور توسٹ وغیرہ پر استعمال
کرنے کے لئے گولڈن
سیرپ تیار کرنے
والا ہندوستان کا واحد کارخانہ
ہے
گھر کی تمام ضروریات
کے لئے صاف ستھری دانے دار چینی، آئسنگ شوگر، کسٹر شوگر،
ڈمرارا، شوگر کیوب، مصری وغیرہ تیار کی جاتی ہیں
پائیداری اور خوبصورتی کے لئے
دورالہ کے پینٹ
استعمال کیجئے
جو مختلف رنگوں میں مہیا ہو سکتے ہیں
صاف اور اعلیٰ درجہ کی چھپائی کیلئے
دورالہ کی سیاہیاں
استعمال کریں
کالی، نیلی، پیلی اور مختلف رنگوں میں
لیتھو، ٹائپ دونوں قسم کی دستیاب ہو سکتی ہیں
دورالہ کے رنگ سازی کے رنگ اور کاربن
چھپائی کی سیاہیوں اور رنگوں کے لئے
لیمن کروم
پیرا ریڈ
آئرن آکسائڈ
پروسین بلیو
ڈی نیسل بلیک
لیمپ بلیک
ہندوستانی سامان سے تیار کیا ہوا
دورالہ شوگر ورکس اینڈ دورالہ کیمیکل انڈسٹریز دورالہ (میرٹھ)
بچوں کی مٹھائیاں
بچوں کے لئے لیمن ڈراپ، ٹافی، جوجب، پیپرمنٹ اور
دیگر طرح طرح کی لذیذ مٹھائیاں تیار ہوتی ہیں
DAURALA SUGAR WORKS & DAURALA
DAURALA CHEM. INDUSTRIES,
(MEERUT.)



ONLY TITLE & ART PLATES PRINTED ... FARASHKHANA.